

نیا دور
پہنچے گلی میں تیرے
یہ میں سوختہ سر
ہوں



Adarts TTS1/78 R

نیا دور

کراچی

شمارہ نمبر

۷۱، ۷۲

ن۔ م۔ راشد نمبر

قیمت ۲۰ روپے

شائع کردہ پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی ۵

ترتیب

"ایران میں اجنبی" کی نظمیں

"لا=انسان" کی نظمیں

"گماں کا ممکن" کی نظمیں

اداریہ

"نیا دَور" کا "ن۔م۔ راشد نمبر" پیشِ خدمت ہے۔ ن۔م۔ راشد جدید اُردو شاعری کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ راشد نے اُردو شاعری کو احساس و فکر کے ایک محدود دائرے سے نکال کر دُنیا کی دوسری زبانوں کے ادبیات کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو جو کچھ دیا وہ یقیناً ایک ایسا سرمایہ ہے جو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و باقی رہے گا اور ان کے اثرات نئی نسلوں میں تخلیقی روح پھونکتے رہیں گے۔

اِس خاص شمارہ میں ہم نے کوشش کی ہے کہ عام ڈگر سے ہٹ کر "نیا دَور" کی روایت کے مطابق، ایک ایسا نمبر مرتب کریں جس کو پڑھ کر ن۔م۔ راشد کی ذات، ان کی شخصیت، ان کا فن اور ان کی شاعری ایک نظر میں آپ کے سامنے آجائے۔ اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسے منتخب خطوط پیش کیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے راشد کی شخصیت اور ان کی فکر کے بالکل نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی باتیں بھی ہیں اور فکر و فن کے اہم نکات بھی۔ ان خطوط کو پڑھ کر ایک ایسا زندہ، جیتا جاگتا شخص ہمارے سامنے آتا ہے جس سے ہم پہلی بار ملتے ہیں۔

ان خطوط کے علاوہ ہم نے "ایک ادھوری کتاب" بھی اس نمبر میں شائع کی ہے جس میں ن۔م۔ راشد اور ساقی فاروقی نے "جدید شعری رویّوں" پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور یہ ادھوری کتاب جدید فکر و ادب میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

اس خاص شمارہ میں ہم نے ن۔م۔ راشد کی وہ دس نظمیں بھی شامل کر دی ہیں جو راشد کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ مضامین میں راشد کے کالج کے ساتھی اور عمر بھر کے دوست آغا عبدالحمید صاحب نے خطوط کے حوالے سے ایک ایسا مضمون لکھا ہے جو وہی لکھ سکتے تھے۔ غلام عباس صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں راشد کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ساقی فاروقی کا مضمون اپنی بے باکی اور جرأتِ اظہار کے اعتبار سے ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس شمارے کی ایک اور خاص چیز وہ نظمیں ہیں جن کی "ابتدائی صورتیں" اس میں شائع کی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے راشد کی شاعری کے ان پہلوؤں کو واضح کیا ہے جن پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی تھی۔

آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ساقی فاروقی نے راشد کی ساری شاعری کو سامنے رکھ کر ایسی ۵۰ نظموں کا

انتخاب کیا ہے جنھیں آپ راشد کی نہ صرف نمائندہ نظمیں کہہ سکتے ہیں بلکہ جن کے مطالعے سے راشد کی ساری شعری کائنات سامنے آجاتی ہے۔ ان نظموں کو اس ترتیب سے پیش کیا گیا ہے کہ راشد کا ذہنی ارتقا اور فکری و فنی سطح پر تبدیلیاں کے سفر کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اس شمارے میں آپکی ذوقِ طبع کیلئے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے جس کی آپ نیا دور سے توقع رکھتے ہیں۔

ادارہ نیا دور بیگم شیلا راشد اور ساقی فاروقی کا انتہائی شکر گزار ہے جنھوں نے ن۔م۔راشد نمبر کے لئے مضامین، نظمیں اور تصاویر فراہم کیں اور ساتھ ساتھ راشد کے چاروں مجموعوں کا ایک انتخاب شائع کرنے کی اجازت بھی دی ہم آغا عبدالحمید صاحب کے بھی بےحد شکر گزار ہیں جنھوں نے راشد کے خطوط اشاعت کے لئے فراہم کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔

وہ جو چلے گئے

اس عرصے میں ادب و صحافت کے کئی بڑے نام ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ یہ سلسلہ ابراہیم جلیس سے شروع ہوا اور اس کے بعد تو اتنی تیزی سے وفات کی خبریں آنی شروع ہوئیں کہ ساری ادبی دنیا سکتے کے عالم میں آگئی۔ پروفیسر محمد حسن عسکری، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ابن انشا، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سید آل رضا اور مولانا ماہر القادری۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے اپنے دائرے میں ایسے کارنامے انجام دیے جو برسوں زندہ رہیں گے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مرنے سے تو علم و ادب کا سہاگ ہی اجڑ گیا۔ نیا دور کی قریبی اشاعت میں ہم ان لوگوں کی ادبی و علمی خدمات کا جائزہ پیش کریں گے۔

ادارہ نیا دور مرحومین کے پسماندگان سے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا ان سب کی مغفرت فرمائے۔

سرورق

نیا دور کے سرورق اپنی انفرادیت اور تخلیقی عمل کی وجہ سے ہمیشہ پسند کئے جاتے رہے ہیں۔ اس خصوصی شمارہ کا سرورق اس مرتبہ بھی لیاقت حسین صاحب نے بنایا ہے۔ لیاقت حسین صاحب نے اس سرورق میں ن۔م۔راشد کی تخلیقی روح کو "حسن کوزہ گر" میں تلاش کیا ہے اور رنگوں اور دیزائن سے ایک ایسا تاثر پیش کیا ہے جس میں زندگی موت پر غالب آ رہی ہے اور مستقبل کی روشنی سے ساری کائنات میں ایسا اجالا ہو رہا ہے جس میں انسانیت کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ ہم اس سرورق کے لئے لیاقت حسین صاحب کے شکر گزار ہیں۔



ایک یادگار تصویر

ن ۔ م ۔ راشد



ایک یادگار تصویر جو وفات سے چند دن پہلے کھینچی گئی

ن۔ م۔ راشد اور ساقی فاروقی



دائیں سے بائیں

ا د ارشد بیگم اشف الد. حز ر. رفیع احم



شیلا راشد اور ن۔ م۔ راشد



ن۔ م۔ راشد اپنے خاندان کے ساتھ



راشد اور فیض ایک ایرانی ساحرہ کے ساتھ



شیلا اور راشد ——— اپنے بچوں کے ساتھ

ن۔م۔راشد

حالات وکوائف

۱۔ نام ۔ نذیر محمد راشد

۲۔ قلمی نام ۔ ن۔م۔راشد

۳۔ تاریخ پیدائش ۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۰ء

۴۔ مقام پیدائش ۔ گوجرانوالہ (پاکستان)

۵۔ مذہب ۔ اسلام

۶۔ تعلیم ۔ (الف) میٹریکولیشن ۔ ۱۹۲۶ء ۔ I ۔ پنجاب یونیورسٹی

(ب) انٹرمیڈیٹ ۔ ۱۹۲۸ء I ۔ پنجاب یونیورسٹی

(ج) بی۔اے۔ (فارسی میں آنرز ۔ دو سال تک انگریزی ادب کی آنرز کلاسوں میں بھی شریک رہے)

۱۹۳۰ء ۔ II ۔ پنجاب یونیورسٹی

(د) ایم۔اے۔ (معاشیات)۔ ۱۹۳۲ء II ۔ پنجاب یونیورسٹی

۷۔ زبانیں ۔ (الف) پنجابی ۔ مادری زبان

(ب) اُردو ۔ تخلیقِ ادب کی زبان

(ج) انگریزی ۔ چوتھی جماعت سے ایم۔اے تک اس زبان میں تعلیم حاصل کی۔

(د) فارسی ۔ فارسی میں بی۔اے۔ (آنرز) پاس کیا۔

(ر) فرانسیسی ۔ انٹرمیڈیئٹ تک اس زبان کا مطالعہ کیا۔
(س) روسی ۔ ۱۹۴۵ء میں نو مہینے تک اس زبان کی تحصیل کی۔

۸۔ مطبوعہ تصانیف:۔

طبعزاد:۔ (الف) ماورا (اردو نظموں کا پہلا مجموعہ) ۱۹۴۱ء
(ب) ایران میں اجنبی (منظومات کا دوسرا مجموعہ جس میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران ایران سے متعلق تیرہ کینٹو بھی شامل ہیں۔) ۱۹۵۵ء
(ج) لا = انسان (منظومات کا تیسرا مجموعہ) ۱۹۶۹ء
(د) جدید فارسی شاعری (ایک لکچر جو ۱۹۶۹ء پاکستان کونسل لاہور میں دیا گیا۔)
(ر) گماں کا ممکن (منظومات کا چوتھا مجموعہ۔) ۱۹۷۷ء
جو تو ہے میں ہوں

تراجم:۔ (الف) ماما (الگزانڈر کپرن کے روسی زبان کے ناول کا اردو ترجمہ) ۱۹۳۹ء
(ب) امی میں تمہاری ہوں (ولیم سیرویان کے ناول ۔
MAMA I LOVE YOU ۔ کا اردو ترجمہ ۱۹۵۶ء
(ب) وقت کا آسمان (علم الانسان سے متعلق لورین ایزلے ۔
۔LOREN EISLEY

کی کتاب

FIRMAMENT OF TIME, کا اردو ترجمہ۔) ۱۹۶۰ء

ترتیب و تدوین:۔ ریڈیو پاکستان کے تین سال (ریڈیو پاکستان کی تاریخ، ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء)
(ایک سرکاری اشاعت) ۱۹۵۱ء

۹۔ غیر مطبوعہ تصانیف:۔

(الف) جدید فارسی شاعر (جدید فارسی شاعری کا انتخاب جس میں نیما یوشیج

سے لے کر احمد رضا احمدی تک بائیس جدید فارسی شعرائی اٹھتی نظمیں اُردو ترجموں کے ساتھ تاریخی ترتیب سے دی گئی ہیں۔ اس کا دیباچہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں متعلقہ شعرا کے سوانح حیات بھی شامل ہیں) اس انتخاب کو المثال لاہور (پاکستان) اور شبخون، الٰہ آباد (ہندوستان) شائع کریں گے (کچھ ترجمے اردو کے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔)

(ب) تنقیدی مضامین (کچھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں نظری اور عملی تنقید ... طرح کے مضامین شامل ہیں یہ مجموعہ المثال، لاہور کی طرف سے شائع ہوگا۔ ان میں سے کچھ مضامین اُردو کے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۰۔ زیرِ ترتیب تصنیفات:۔ (الف) جدید فارسی مستعملات: (جدید فارسی الفاظ و تراکیب کے ستعمال سے متعلق ایک COMPENDIUM, جو FORLER'S ENGLISH USAGE, کے طرز پر اُردو میں لکھا گیا ہے۔)

(ب) شہرِ وجود اور مزار:۔ (منظومات کا پانچواں مجموعہ)

۱۱۔ انتظامی امور کا تجربہ:۔۔ (الف) نیوز ایڈیٹر، آل انڈیا ریڈیو، دہلی، ہندوستان ۱۹۳۹ء

(ب) پروگرام اسسٹنٹ، " " ۱۹۴۱-۴۲ء

(ج) ڈائرکٹر آف پروگرامز " " ۱۹۴۲-۴۳ء

(د) پبلک ریلیشنز آفیسر، انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائرکٹریٹ انڈیا ۱۹۴۳-۴۷ء
(اس حیثیت سے بغداد، تہران، بصرہ، قاہرہ، یروشلم اور کولمبو میں خدمات انجام دیں)

(ر) اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ، ہندوستان ۱۹۴۷ء

(س) اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر، ریڈیو پاکستان، پشاور، پاکستان۔ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء

(ص) 〃 〃 لاہور، پاکستان۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۹ء

(ط) ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز، ریڈیو پاکستان ہیڈکوارٹرز، کراچی، پاکستان۔ سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء

(ع) ریجنل ڈائرکٹر، ریڈیو پاکستان پشاور، پاکستان سنہ ۱۹۵۰-۵۲ء

(ف) انفارمیشن آفیسر یونائیٹڈ نیشنز ہیڈکوارٹرز، نیویارک سنہ ۱۹۵۱-۵۶ء

(ق) ڈائرکٹر، یو۔ این۔ انفارمیشن سنٹر، جکارتہ، انڈونیشیا۔ سنہ ۱۹۵۶-۵۸ء

(ک) ڈپٹی ڈائرکٹر، یو۔ این۔ انفارمیشن سنٹر، کراچی سنہ ۱۹۵۸-۵۹ء

(ل) ڈائرکٹر 〃 سنہ ۱۹۵۹-۶۱ء

(م) انفارمیشن آفیسر یو۔ این ہیڈکوارٹرز، نیویارک سنہ ۱۹۶۱-۶۶ء

(ن) ڈائرکٹر، یو۔ این۔ انفارمیشن سنٹر، واشنگٹن، ڈی، سی۔

یو۔ ایس۔ اے۔ سنہ ۱۹۶۶ء

(و) انفارمیشن آفیسر، یو۔ این۔ ہیڈکوارٹرز، نیویارک سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء

(ہ) ڈائرکٹر، یو۔ این۔ انفارمیشن سنٹر، تہران، ایران، سنہ ۱۹۶۷-۷۳ء

(لا)۔ ۔ ۔ ۔ سنہ ۱۹۷۳-۷۴ء

۱۲۔ ادارت اور صحافت کا تجربہ۔

(الف) مدیر رسالہ "بیکن" THE BEACON لائلپور (طلبہ کا انگریزی رسالہ) سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء

(ب) مدیر رسالہ 'راوی' لاہور (طلبہ کا اردو رسالہ) سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء

(ج) مدیر رسالہ "نخلستان"، ملتان، ایک تعلیمی اور ادبی ماہنامہ سنہ ۱۹۳۲-۳۴ء

(د) مدیر، ماہنامہ "شاہکار"، لاہور سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء

(ر) مدیر، پاکستان کولنگ PAKISTAN CALLING (ریڈیو پاکستان کا انگریزی رسالہ) اور سیروانزر "آہنگ" (ریڈیو پاکستان کا اردو رسالہ) سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء

۱۲۔ **تدریسی تجربہ:۔** لاہور اور ملتان کے قیام کے دوران پنجاب یونیورسٹی کے بی۔اے۔ کے طلبہ کو اردو، فارسی اور انگریزی کے مضامین میں امتحان کی تیاری کرائی۔

۱۳۔ **دیگر سرگرمیاں:۔** (الف) پنجاب یونیورسٹی کے لئے پروفیسر اور ریڈر منتخب کرنے والی کمیٹی کے رکن۔ سنہ ۱۹۷۱ء

(ب) پی۔ای۔این۔ پاکستان

دسمبر ۶۶ء میں انٹرنیشنل پی۔ای۔این کی میٹنگ منعقدہ نیویارک میں پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ سنہ ۱۹۶۶ء

(ج) "حلقۂ اربابِ ذوق" کے بانی رکن سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء

(د) پاکستان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی پر مشتمل ایک فلم کے سلسلے مشورے کے لئے RKO STUDIES, لاس انجلیز یو۔ایس۔اے۔ نے مدعو کیا۔

(ر) اپنی نظمیں مندرجہ ذیل ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیں۔:

آل انڈیا ریڈیو، لاہور دہلی اور لکھنؤ۔

ریڈیو پاکستان، کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور۔

بی۔بی۔سی۔، لندن۔

وائس آف امریکہ، واشنگٹن، ڈی، سی۔

ریڈیو ماسکو۔

اس کے علاوہ پاکستان ریڈیو اور ٹیلیویژن، ریڈیو ایران اور بی۔بی۔سی۔لندن کو ادب و شعر وادب کے موضوع پر انٹرویو بھی دیئے۔

(س) متعدد رسالوں کے نمائندوں کو انٹرویو دیئے۔ مثلاً:۔

ایشیا اسٹڈیز سنٹر آف میشیگن یونیورسٹی یو۔ایس۔اے۔ کا مجلہ "محفل" ۱۹۶۶ء

"سپید و سیاہ"، تہران شمارہ ۴۴، ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۶۸ء ـــــ اور
۲۲ر دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء
"فردوسی"، تہران شمارہ ۹۱۹، ۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۶۹ء

(ص) ایران کی یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور کلبوں میں اقوامِ متحدہ کے موضوع پر کم و بیش ایک سو ساٹھ (۱۶۰) لکچر دیئے (دورانِ ملازمت اقوامِ متحدہ کے نمائندے کے طور پر) سنہ ۱۹۶۴–۶۷ء

(ط) ایشیا سوسائٹی، نیویارک کے رسالے "ایشیا" میں ایک طویل مضمون
"اُردو ادب پر معاشرتی اثرات"
SOCIAL INFLUENCES ON URDU LITERATURE
شائع ہوا۔ اشاعت سے پہلے یہ مضمون ایشیا سوسائٹی کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔

(ع) رسالہ "شعر و حکمت"، حیدرآباد دکن (ہندوستان) نے سنہ ۱۹۷۰ء میں ن۔ م۔ راشد نمبر نکالا۔

(ف) ان کی نظموں کے انگریزی ترجمے امریکہ کے متعدد ادبی رسالوں میں شائع ہوئے، مثلاً رسالہ "NORTH WESTERN -"
"BLOIT POETRY JOURNAL" اور "POETRY"

۱۵۔ بیرونی سفر:۔ عراق سنہ ۱۹۴۳–۴۴ء۔ ایران سنہ ۱۹۴۴–۴۵ء۔ اور سنہ ۱۹۶۲–۶۷ء۔ مصر اور فلسطین سنہ ۱۹۴۵–۴۶ء۔ سیلون سنہ ۱۹۴۶–۴۷ء۔ امریکہ سنہ ۱۹۵۲–۵۶ء۔ اور سنہ ۱۹۶۱–۶۲ء۔
(سوویت رائٹرز یونین کی دعوت پر روس سنہ ۱۹۶۵ء۔ تھائی لینڈ،
(بین الاقوامی اجلاس میں شرکت کے لئے)
اٹلی اور آسٹریا (سیر و سیاحت کے لئے)
انڈونیشیا۔ سنہ ۱۹۵۷–۵۸ء

۱۶۔ وفات:۔ ۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۵ء۔ بمقام لندن۔

ساقی فاروقی

حسن کوزہ گر

"میرے دوستو زندگی کے معنی کھانا پینا، چلنا، پھرنا، سو رہنا اور مر جانا نہیں۔ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفاتِ خاص کے ساتھ نام کو شہرتِ عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں، انہیں بالیقین دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبارِ احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مر جائیں گے۔ اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے۔"

محمد حسین آزاد

(آبِ حیات کے دیباچے سے)

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کا ایک منحوس دن تھا۔ میں دفتر میں تھا تو راشد صاحب نے گھر پر فون کیا اور میری بیوی کو بتایا کہ شیلا (ان کی بیوی) کے اکلوتے بھائی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں اور وہ اٹلی چلی گئی ہیں۔ یہ بھی کہ وہ چلٹنہم سے ہیمپسٹڈ جا رہے ہیں تاکہ اپنی ساس کو لے کر جنازے میں شریک ہونے کے لئے ۱۱ اکتوبر کو اٹلی پہنچ جائیں۔ پھر یہ پیغام دیا کہ میں انہیں ۱۰ اکتوبر کی شام کو فون کروں اور پہلے ان کی ساس مسز انجلینی کو بیٹے کی موت کا پرسہ دوں پھر ان سے بات کروں کہ وہ ہیمپسٹڈ ہی میں رہیں گے۔

دس کی شام کو جب میں گھر پہنچا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ مسز انجلینی کو فون کریں اور پرسہ دیں کہ مجھے پرسہ دینا نہیں آتا۔ پھر میں راشد صاحب سے بات کروں گا۔ مسز انجلینی نے ٹیلیفون اٹھایا تو میری بیوی نے کہا کہ

کیا قیامت ہے کہ شوہر کی موت کو ابھی ۵ گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور جوان بیٹا یوں ڈھ گیا۔ میں مارننگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا اور ٹیلیفون پر کان لگے کہ بیوی کی چیخ سن کر ایک دم سے ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ میری بیوی کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ میں نے رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرش پر بیٹھ گیا اور مسز انجلینی سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ وہ متوسط ہوتیں تو ڈھک ڈھک کر رونے لگیں اور مجھے ہچکیوں میں بتایا کہ راشد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ بیوی کی چیخ سے میرے ذہن میں حادثہ، دل کا دورہ اور ہسپتال ابھرے تھے۔ اس لمحے تک موت کا لفظ میرے ذہن میں نہیں جاگا تھا۔ ایک لمحے کو میرے اعصاب سو گئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور تفصیل طلب ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ ہیتھ سٹیڈ سات بجے شام کو پہنچے اور پیدل چل کر کوئی بیس منٹ میں مسز انجلینی کے یہاں پہنچے، ان کا مکان خاصی بلندی پر واقع ہے۔ راستے ہی میں انہیں دل کی تکلیف محسوس ہوئی ہوگی کہ خاصے پژمردہ تھے۔ مسز انجلینی سے کہا کہ کیسے دکھ کی بات ہے کہ ان کا بیٹا کار کے حادثے سے جانبر نہ ہو سکا پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ مسز انجلینی نے کہا کہ وسکی کا ایک گلاس مناسب رہے گا کہنے لگے نہیں ابھی دل پر دباؤ کم کرنے والی دو گولیاں کھائی ہیں۔ پھر مسز انجلینی نے پوچھا سفر کیسا رہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا کہ وہ سوال اور جواب کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ اتنی پُرسکون موت کم لوگوں کا نصیب ہے۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ؏

مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں

اسی دن پتہ چلا کہ درد کی تقسیم مقصود ہو تو پرسہ دینا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ میں آدھ گھنٹے تک مسز انجلینی سے بات کرتا رہا۔ انہوں نے بتایا کہ شیلا نے تار یا کر فون کیا تھا اور وہ ۱۲ اکتوبر کی شام کو پہنچیں گی۔ اور یہ کہ برلن سے راشد صاحب کے بیٹے شہریار لندن پہنچ گئے ہیں۔ اور شیلا اور شہریار مل کر کفن دفن کا دن طے کریں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد راشد صاحب کی لاش ہسپتال میں رکھی ہوئی ہے

ان سے گفتگو ختم کر کے میں نے بی بی سی کی انٹرنیشنل نیوز سروس میں یہ خبر دے دی۔ پھر ایک ایک کر کے راشد صاحب کے تمام ملنے والوں کو فون کر دیا۔ اور عبداللہ حسین اور علی باقر سے کہہ دیا کہ جن لوگوں تک یہ خبریں نہیں پہنچی ہیں، پہنچا دیں۔ ۱۱ اکتوبر کو میں گھر ہی پر تھا۔ راشد پرستوں کے فون آتے رہے۔ عبداللہ حسین میرے یہاں شام کو آ گئے۔ وہ سخت غیر جذباتی آدمی ہیں مگر اس دن جذباتی ہو رہے تھے۔ ہم صبح کے تین بجے تک راشد صاحب کی باتیں کرتے رہے اور شراب پیتے رہے۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ عبداللہ اور ان کی بیوی فرحت میرے یہاں دوپہر کے کھانے پر آئے ہوئے تھے کہ دو بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ شیلا تھیں۔ رو رہی تھیں۔ کہنے لگیں ابھی پہنچی ہوں۔

یہ کیا ہو گیا۔ میں ان کے دُہرے غم کے بارے میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ جب طوفان تھما تو میں نے پوچھا راشد صاحب کب اور کہاں دفن ہوں گے۔ کہنے لگیں ان کی خواہش تھی کہ انہیں نذرِ خاک نہیں نذرِ آتش کیا جائے، تم کیا کہتے ہو۔ ظاہر ہے میں، شہریار سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کروں گی اور شہریار ایک گھنٹے تک پہنچیں گے۔ عبداللہ حسین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ہماری گفتگو سن رہے تھے۔ ہم دونوں کو ایک دھچکا سا لگا کہ ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں نے کہا اگر مرحوم کی خواہش یہی تھی تو اس خواہش کو پورا کیا جائے گا۔ ظاہر ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ اور شہریار وارث ہیں۔ آپ دونوں طے کیجئے اور مجھے فون کر دیجئے۔ میں انتظار کروں گا۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو عبداللہ اور میں کمرے میں آ گئے۔ میں اس دھچکے کے بعد سنبھل رہا تھا مگر عبداللہ کے نیم آزاد ذہن میں خوابیدہ پاکستانی مسلمان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ کہنے لگے شیلا کے کہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک شہریار راضی نہیں ہو جاتے کوئی بات حتمی نہیں ہے کہ قانونی طور پر بیوی اور بیٹے دونوں کی رضامندی ضروری ہے اور اگر دونوں میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو لاش کو اس مذہب کے رسوم کے تحت دفنایا یا جلایا جائے گا جس مذہب میں مرنے والا پیدا ہوا تھا اور یہ کہ شہریار ظاہر ہے جلانے پر اعتراض کریں گے۔ میں نے کہا کمال کیا راشد صاحب نے بھی۔ مرتے مرتے ڈرامہ کر گئے۔ عجب آزاد ذہن تھا ان کا کہ زندگی اور موت کا گراف ایک خطِ مستقیم کے طور پر بنا گئے جس طرح سارتر کے فلسفے کا منطقی نتیجہ وہ خط تھا جو انہوں نے ہوچی منہ کے نام لکھا تھا (جس میں جنگ آزادی میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا) اسی طرح راشد کی زندگی اور شاعری کا نقطۂ عروج یہ CREMATION ہے جب ایک آدمی ساری عمر زنجیریں ہی توڑتا رہا تو یہ زنجیر بھی کیوں بچے۔ ہم چاروں بہت دیر تک دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ پھر فرحت اور عبداللہ چلے گئے۔ رات کے ۹ بجے شہریار کا فون آیا کہ چھ مہینے پہلے جب راشد صاحب ان سے ملنے بلجیم گئے تھے تو انہوں نے ان سے بھی مرنے کے بعد سپردِ آتش ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور انہوں نے شیلا نے طے کیا ہے کہ مرحوم کی خواہش کو پورا کیا جائے۔ میں نے کہا بہت سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کہنے لگے ہم دونوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ اور ہمیں کسی زید بکر عمرو کی پروا نہیں ہے۔ آپ ابا کے تمام جاننے والوں کو اطلاع دے دیں۔ جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے نہ آئے۔ یہ رسم ۱۲ر اکتوبر کو ساتھ لندن کریمیٹوریم میں ادا کی ہوگی۔ اور نمازِ جنازہ اس لئے نہیں ہوگی کہ لاش کو سپردِ آتش کیا جا رہا ہے۔ پھر انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ۱۵ر اکتوبر کی شام کو اپنے یہاں ایک نشست کا انتظام کروں جس میں راشد صاحب کے دوست احباب راشد صاحب کا تذکرہ کریں۔ اور انہیں یاد کیا جائے۔ وہ چونکہ ۱۶ر اکتوبر کی صبح کو

ں جا رہے ہیں۔ اس لئے ۱۵ اکتوبر کے علاوہ کسی اور دن نہیں آ پائیں گے۔

میں نے اسی وقت فون کر کے آصف جیلانی کو اطلاع دی کہ وہ "جنگ" میں یہ خبر دے دیں اور پاکستان میں ں ٹرانسمٹ کرا دیں۔ پھر میں نے تمام لوگوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میاں ممتاز دولتانہ کو گھر پر فون کیا۔ میاں حب موجود تھے۔ میں نے راشد صاحب کی خواہش سے مطلع کیا۔ کہنے لگے "اچھا" میں نے کہا پتہ لکھ لیجئے۔ کہنے ، سکریٹری نہیں ہے۔ بہر حال۔ لکھا دیجئے۔" میں نے کریمیٹوریم کا پتہ لکھا دیا اور فون بند کر دیا۔

دوسرے دن دفتر میں اور گھر پر لوگوں کے فون آتے رہے۔ سب کو صدمہ تھا۔ مگر موت کے صدمے پر مذہب صدمہ غالب تھا۔ میں سب سے یہی کہتا رہا کہ میں راشد صاحب کا ایک ادنیٰ دوست ہوں۔ ان کی لاش کی وراثت پر یرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آپ حضرات اس نمبر پر شیلا اور شہریار کو فون کریں۔ جہاں تک میرا نعلق ہے مجھے اپنے محترم دوست کی آخری خواہش کا پورا احترام ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے سخت وحشت تھی کہ کریمیٹوریم میں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ میں نے شیلا کو فون کیا۔ پتہ چلا کہ سحاب قزلباش اور کرنل الحق ان سے بحث کرتے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

دوسرے دن ۴ بج کر ۱۰ منٹ پر راشد صاحب کی میت کو سپردِ آتش ہونا تھا۔ ۳ بج کر ۵ منٹ پر میں اپنی بیوی کے ہمراہ کریمیٹوریم پہنچ گیا۔ ابھی میت نہیں پہنچی تھی۔ عبداللہ حسین اور عاقل ہوشیارپوری ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ مسز انجلینی کے ہمسائے کیتھ رابکن بھی آ چکے تھے۔ ۴ بجے ایک لمبی، سیاہ، میت گاڑی میں میت کے ہمراہ شیلا، مسز ایلسیا انجلینی اور شیلا کی ایک دوست انجلا بھی پہنچ گئیں۔ پھر علی باقر، راشد صاحب کے ایک پرانے دوست محمد افضل اور وقار لطیف آ گئے۔ شیلا نے کریمیٹوریم کا ہال ۱۵ منٹ کے لئے بک کرایا تھا۔ وقت گزر رہا تھا مگر راشد صاحب کے بیٹے شہریار اب تک نہیں پہنچے تھے۔ شیلا میرے شانے پر سر رکھے رو رہی تھیں یکایک کہنے لگیں ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا میں نگہبان افسر سے بات کرتا ہوں۔ میں اس افسر کو ایک کونے میں لے گیا اور تاخیر کی معافی چاہی اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور مزید ۱۵ منٹ کی مہلت طلب کی۔ ۱۵ منٹ گزر گئے مگر شہریار نہیں پہنچے تو میں نے کہا حضرات اور خواتین ہال میں چلئے۔ مجھے اس خوش خصال افسر نے مختصراً بتایا کہ اس طرح کی رسمِ مرگ کے کیا اصول ہیں۔ یعنی یہ کہ سب لوگ خاموشی سے ہال میں داخل ہو کر سر جھکا کر دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ سامنے "کوفن" میں میت رکھی رہتی ہے اور پس منظر میں آرگن بجتا رہتا ہے۔ جب یہ سوگوار دھن ختم ہوتی ہے تو کوفن کے چاروں طرف پردہ کھنچ جاتا ہے۔ اور کوفن کے نیچے کا تختہ فرش سرک

جاتا ہے اور لاش نیچے، تہہ خانے میں، بجلی کی بھٹی میں جلنے کے لئے چلی جاتی ہے۔ اور لوگ ہال سے باہر آجاتے ہیں۔ اس سارے عمل میں مشکل سے دس منٹ لگتے ہیں۔ میں نے موت کے آداب وضوابط سے سب کو آگاہ کر دیا تھا جب آرگن خاموش ہوا اور پردہ کھنچا اور فرش کا دروازہ کھلا تو راشد صاحب آگ کے شعلوں میں نہانے کے لئے چلے گئے۔ انہی کے الفاظ میں:۔

آگ آزادی کا، دلشادی کا نام
آگ پیدائش کا افزائش کا نام
آگ وہ تقدیس، دُھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ
آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم
عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب!

ہم چار پاکستانی، دو ہندوستانی اور پانچ یورپی خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلے آئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ باہر لان میں چند سرخ گلابوں کا ایک معمولی سا گلدستہ اپنے حجم اور اپنی تنہائی پر شرمندہ تھا۔ پاس ہی اک کارڈ پر لکھا ہوا تھا "بہت ہی پیارے نذر راشد کے لئے۔ اُس کی چہیتی بیوی کی طرف سے۔"

شیلا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کوئی پھول نہ لائے۔ یہ خبر اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ ہم اس گلدستے کے پاس پانچ سات منٹ تک کھڑے رہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہم سب ایک طرح سے سہمے ہوئے تھے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر شیلا نے کہا اگر ہم مناسب سمجھیں تو ان کی ماں کے ہاں چلیں اور چائے کی ایک ایک پیالی پی کر رخصت ہوں۔ علی باقر، وقار لطیف اور کینتھ راپکن مصروف تھے اور اپنے اپنے دفتروں کو چلے گئے۔ باقی لوگ ساتھ چلنے لگے۔ ابھی ہم گیٹ ہی پر تھے کہ شہریار اپنے ایک دوست کے ہمراہ پہنچ گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ آخری رسم ختم ہو چکی ہے۔ انہوں نے کچھ زیادہ پشیمانی کا اظہار نہیں کیا اور کہا تو یہ کہا کہ چلئے یہ بھی ہونا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں اپنی کار میں اکیلا تھا۔ شہریار اگلی کار میں بیٹھی شیلا کو بتا رہے تھے کہ وہ کس طرح راستہ بھٹک گئے اور ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ میں نیچے اترا اور ان سے کہا چلئے اس لان میں گلدستے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے ابا کے لئے کچھ دعا کر لیجئے۔ وہ میرے ساتھ ہو لئے اور پھولوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرتے رہے۔ پھر ہم سب تین کاروں اور ایک دین میں بھر کر مسز انجلینی کے یہاں پہنچے۔ ان کا مکان کمال بلندی پر ہے۔ مجھے اپنی کار کی رفتار گرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ دل کے مریض کے لئے یہ راستہ یقیناً مہلک ہے۔

شیلا اور مسز انجلینی اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی رہیں۔ گھر میں ماتم کی فضا کم اور پارٹی کا ہنگامہ زیادہ نظر آیا۔ غموں کی پردہ پوشی تھی اور "آداب" اور "رکھ رکھاؤ" کا دور دورہ تھا۔ ہم سب راشد صاحب کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے راشد صاحب کی ایک نظم پڑھی۔ عبداللہ نے ترجمہ کیا۔ شہریار، فیض اور راشد مرحوم کی ماسکو والی ملاقات کا تذکرہ کرتے رہے۔ میں نے شیلا اور شہریار سے مخاطب ہو کر پوچھا: "میں اپنی اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی تسلی کے لئے، سب کے سامنے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ راشد صاحب نے تحریراً اپنی موت کے بارے میں کوئی وصیت نہیں چھوڑی ہے، مگر ہم سب کو آپ دونوں تفصیلاً بتائیں کہ کب اور کن حالات میں راشد صاحب نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ سے انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اپنی موت کے بارے میں تبادلۂ خیال نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب تھے، اول تو یہی کہ وہ زندگی کے اتنی سختی سے قائل تھے کہ موت کا ذکر کم کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں جان بوجھ کر یہ موضوع درمیان میں نہیں لاتا تھا کہ کہیں انہیں صدمہ نہ پہنچے اور اگر لاتا بھی تھا تو یوں کہ راشد صاحب اگر میں پہلے مر جاؤں تو میری ساری اردو کی کتابیں اور ادبی کاغذات اپنے یہاں لے جایئے گا۔ اور جب تک آپ زندہ رہیں یاد کرتے رہیے گا۔ اس پر وہ کہتے کہ ساقی میں مرنے ورنے کی فکر نہیں کرتا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں کہ میری لاش ہسپتال میں چیر پھاڑ کے کام آئے گی یا جلا دی جائے گی یا غرقِ دریا ہو جائے گی۔ ایک بات میں جانتا ہوں میں چلتے پھرتے مرنا چاہتا ہوں۔ میں بستر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہیں چاہتا اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تو گولیاں کھا کر اپنی زندگی ختم کروں گا۔ ان کی طبیعت میں اتنا اضطرار تھا کہ اس موضوع پر وہ زیادہ دیر تک ٹکتے ہی نہیں تھے۔ اسی لئے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا حالات تھے جن میں انہوں نے نہایت سنجیدگی سے آپ دونوں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔"

میں اپنی گفتگو ختم کر کے، جو ایک طرح کی چھوٹی سی تقریر کی شکل اختیار کر گئی تھی، شیلا کی طرف دیکھنے لگا تو شیلا نے بتایا کہ دو بار انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پہلی بار جب شیلا کے والد مسٹر انجلینی کا انتقال ہوا۔ راشد صاحب بھی میت کے ساتھ اسی سائیڈ لندن کریمیٹوریم میں گئے تھے۔ اور جب لاش تہہ خانے کی بھٹی میں جلنے کے لئے نیچے اتر گئی اور سب لوگ ہال سے باہر نکل کر لان کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو پتہ چلا کہ راشد صاحب لاپتہ ہیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد آئے۔ معلوم ہوا کہ تختہ سرکنے اور لاش کے یکایک غائب ہونے کا کچھ ایسا اثر حضرت پر ہوا کہ سراغ لگانے اور چھان بین کرنے کے لئے عمارت کے عقب میں

گئے اور سنٹری سے کہہ سن، سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں پہنچ گئے اور اپنی آنکھوں سے لاش کو جلتا ہوا دیکھا۔ اور راستے بھر اپنے اس تجربہ کا ذکر کرتے رہے اور کہتے رہے: "میں بھی ایسی ہی صاف موت چاہتا ہوں۔ میں مرنے کے بعد CREMATE ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ طریقہ بہت اچھا لگا۔" اس واقعے سے ان کے تجسس اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی تمنا پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے۔ پھر شیلا نے بتایا کہ دوسری بار اپنی اس خواہش کا ذکر انہوں نے مرنے سے دو مہینے پہلے کیا تھا جب کھانے کی میز پر وہ دونوں وصیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "مجھے یہ طریقہ بہت پسند ہے اور میں مرنے کے بعد CREMATE ہونا چاہتا ہوں۔" پھر شہریار اور راشد نے بتایا کہ جب چھ سات مہینے پہلے راشد صاحب ان سے ملنے برسلز گئے تھے تو ایک رات کو کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مرنے کے بعد میں CREMATE ہونا چاہتا ہوں، اور وہ اپنی اس خواہش کے اظہار میں سنجیدہ تھے۔

کوئی ۹ بجے یہ محفل برہم ہوئی۔ چلتے چلتے شہریار نے کہا کہ وہ اگلے دن میرے یہاں آنے سے قاصر ہیں کہ انہیں واپس بلجیم پہنچنا ہے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ان کے کہنے سے تو میں نے یہ محفل رکھی ہے اور اب یہی نہیں آ رہے مگر میں نے اصرار نہیں کیا۔ عبداللہ حسین اپنی وین میں اور میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنی کار میں اور بقیہ حضرات شہریار صاحب کی کار میں لد کر لندن چلے گئے۔ شہریار کی کار تو کسی اور راستے سے چلی گئی مگر ہم اور عبداللہ آگے پیچھے ہائڈ پارک تک ساتھ آئے۔ ہائڈ پارک کارنر پر عبداللہ نے سگنل دیا تو میں نے کار روک لی اور اتر کر ان کی وین تک پہنچا اور ہم دونوں دیر تک اس عظیم شاعر کی موت کی آخری رسومات کی کسمپرسی اور بے حالی، شیلا کی بدسلیقگی اور شہریار کی اجنبیت پر کڑھتے رہے۔ جی چاہتا تھا کہ ہمارے ساتھ لندن کے ایک کروڑ لوگ گریہ کریں کہ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے مگر ہم دونوں راشد صاحب کی طرح اپنی اپنی آگ میں جلتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے کہ اگلے دن ہمیں پھر یکجا ہونا تھا۔

دوسرے دن میرے یہاں راشد صاحب کے چند سوگوار جمع ہوئے۔ یعنی عبداللہ حسین، سجاد ظہیر کی بیٹی نجمہ ظہیر باقر، ڈاکٹر علی باقر، اکبر حیدر آبادی، وقار لطیف اور حبیب حیدر آبادی۔ جلائے جانے اور دفن کرنے پر دیر تک گرماگرم بحث ہوتی رہی۔ پھر علی باقر نے راشد صاحب پر اپنا مضمون پڑھا اور میں نے راشد صاحب پر سلیم احمد کے مقالے کے کچھ صفحے پڑھے اور ان کی کچھ نظمیں سنائیں اور یوں ہم نے اپنے اپنے طور پر اس رات راشد صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کیا۔ ایک مہینہ پہلے اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے راشد صاحب نے صبح کر دی تھی۔ وہ منع کرنے کے باوجود رات بھر وسکی پیتے رہے تھے اور احمد فراز، ضیا محی الدین اور عبداللہ حسین سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے

تھے۔ اس خیال سے بڑا قلق ہوا کہ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔ افسوس کہ میرے ان کے تعلقات تشنہ رہ گئے۔ میں نے خوش آمدید تو کہا۔ خدا حافظ نہ کہہ پایا۔ اور "خدا حافظ" کہے بغیر کوئی رشتہ مکمل نہیں ہوتا جس طرح تعلقات شروع کرنے کے کچھ دستور ہیں اسی طرح تعلقات ختم کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ان کی اچانک موت کے باعث یہ بے ادبی مجھ سے سرزد ہوئی۔ یہ ملال ہمیشہ رہے گا۔

راشد صاحب سے میری پہلی ملاقات حلقۂ اربابِ ذوق، کراچی کے ایک جلسے میں ہوئی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔ میں نے اپنی نظم "مردہ خانہ" اور انہوں نے اپنی نظم "مسز سالامانکا" پڑھی تھی۔ راشد صاحب کا وہ دور تو ختم ہو چکا تھا جب ان کی ہر نظم ایک واقعہ (EVENT) ہوا کرتی تھی۔ مگر مجھ جیسے نوشتے اب بھی ان کی ہر نئی نظم کے منتظر رہا کرتے تھے۔ جلسے کے اختتام پر ضیا جالندھری یا حمید نسیم نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ ان کی باقاعدہ اور میری بے قاعدہ زندگی میں سوائے شعر کے کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ اس لئے ہمارے تعلقات بہت واجبی سے رہے۔ ان کے اس قیام کراچی کے دوران ہم مشکل سے دس بار ملے ہوں گے۔ میں اس زمانے میں کوئی کام وام نہیں کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ شاعری FULL TIME JOB ہے۔ رگوں میں جوانی کا ہو ہلکورے لیتا تھا اور نسد شعر کھلی رہتی تھی۔ ایک دن صدر کی انگریزی کتابوں اور رسالوں کی اک دکان میں کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ آواز آئی "ہلو ساقیا" راشد صاحب تھے۔ انہوں نے دس بارہ کتابیں خریدیں اور مجھ سے کہا کہ اگر کافی پینی ہو تو ان کے دفتر چلوں۔ میں نے کہا چلئے مجھے یوں بھی آپ سے ملنا تھا کہ "نیا دور" کے "جدید شاعری نمبر" کے لئے ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور آپ کی کچھ غیر مطبوعہ نظمیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے "گڈ" اور ہم باہر نکل آئے۔ ان کی لمبی سیاہ کار کھڑی تھی جس میں ان کا شوفر اور پرائیویٹ سکریٹری پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی اینگلو انڈین سکریٹری سے تعارف کرایا۔ میں راستے بھر یہ طے نہ کر پایا کہ کس کا سیاہ رنگ زیادہ چمکدار ہے، گاڑی کا کہ سکریٹری کا۔ مگر حق یہ ہے کہ ان صاحبہ نے کافی بہت اچھی بنائی۔ دو تین گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ راشد صاحب کی تجویز تھی کہ میں "شاعری" نام کا ایک ماہانہ رسالہ نکالوں جس میں صرف شعر پر بحث ہو۔ وقت میرا، پیسے ان کے۔ رسالہ ٹائپ میں نکلے اور ۴۸ صفحے سے زیادہ کا نہ ہو قیمت ایک روپیہ ہو اور ۲۵۰ سے زیادہ چھاپا نہ جائے۔ یہ ہو اور یہ نہ ہو، یوں ہو اور یوں نہ ہو۔ غرض ہر بات طے ہو گئی۔ مگر رسالہ نہ نکلا۔ دوسرے دن کافی ہاؤس میں جب میں نے ضیا جالندھری اور ان کی خوبصورت بیوی شفقت کے سامنے اس رسالہ کا ذکر کیا تو ضیا جالندھری نے خبردار کیا کہ راشد تو ایک آدھ سال میں چلے جائیں گے پھر کیا ہوگا اور یہ بھی کہ وہ راشد کے اور میرے دونوں کے مزاج سے واقف ہیں۔

چھوٹی بڑی اناؤں کا ٹکراؤ ہوگا۔ خواہ مخواہ کی بدمزگی ہوگی اور دوسرے شمارے کی نوبت نہیں آئے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں ڈر گیا۔

اسی عرصے میں ضیا محی الدین بھی آگئے۔ وہ لندن سے آئے ہوئے تھے۔ فون کرکے راشد صاحب سے ملنے چلے آئے تھے۔ راشد صاحب نے ان سے کہا کہ میں کراچی کا ایک ہونہار شاعر ہوں اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنی نظم "مردہ خانہ" ضیا محی الدین کو سناؤں۔ ضیا محی الدین کا ایک انگوٹھا کار کے دروازے میں آکر زخمی ہوگیا تھا۔ ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتے رہے۔ اور راشد صاحب محظوظ ہوتے رہے۔ کسی نئے شاعر کے کلام میں بزرگ شعراء اتنی دلچسپی کہاں لیتے ہیں۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ انہوں نے کہا کہ کسی دن میں ان کے گھر آؤں اور ان کی غیر مطبوعہ نظمیں دیکھوں۔ دو ہفتے بعد میں فون کرکے ان کے یہاں پہنچا اور انہوں نے اپنی کئی غیر مطبوعہ نظمیں دکھائیں۔ بعض نظموں کے بارے میں تاکید کی کہ میں اپنے مضمون میں ان کا حوالہ نہ دوں۔ میں نے وعدہ کرنے کو تو کرلیا مگر مضمون لکھنے بیٹھا تو وعدہ شکنی کرنی پڑی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جو چیز احاطۂ شعور میں ہے اس سے نظر پوشی کیسے کروں۔ مضمون چھپا تو وہ نیویارک میں تھے۔ بعد میں بتایا کہ خفا ہوگئے تھے۔ منیر نیازی اور انیس ناگی سے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اسی زمانے میں "محفل" نیویارک میں جدید شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے، ہم تینوں کی خاصی تباہی مچائی۔ ان کا یہ فقرہ دیکھئے اور اس کی کاٹ بھی۔ مضمون انگریزی میں ہے۔

"Poets like Munir Niazi, Saqi Farooqi and Anis Nagi are largely victims of self love, and the scenes of violence and fear which they portray can only lead to a sordid view of life, born out of neurotic minds."

تین مختلف الخیال شعرا کو ایک ساتھ نتھی کر دینا راشد صاحب کا انتقام تھا۔ ۱۹۶۴ء میں لندن میں ملاقات ہوئی تو سارے گلے جاتے رہے۔ میری طرف سے ان کے دل میں ایک اور بات سے میل آگیا تھا۔ اپنے قیام کراچی کے دوران انہوں نے دو تین بار کہا تھا کہ میں ان کے بیٹے شہر یار کو اردو پڑھا دیا کروں۔ میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ ایک طرف تو میری درمیانہ طبقے کی مفلوک الحال ذہنیت ٹیوشن کے اکلِ حلال کے نام سے زخمی ہوتی تھی دوسری طرف جمیل جالبی اور جمیل الدین عالی سے فون پر یہ کہنے میں جھجک نہیں محسوس ہوتی تھی کہ "سو روپے چاہئیں آرہا ہوں۔" شکر ہے ذہن اس غلامی سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے لان کی گھاس بھی خود کاٹتا ہوں اور سامنے فٹ پاتھ پر جھاڑو بھی دیتا ہوں۔ یہی نہیں اس سے ایک عجب طرح کی لذت بھی اخذ کرتا ہوں۔ خیر ۱۹۶۴ء میں میرے ایک عزیز دوست اظہار کاظمی نے دفتر میں فون کیا کہ راشد صاحب نیویارک سے آئے ہوئے ہیں۔ موقع اچھا ہے کیوں نہ تین شاعروں کا ایک مشاعرہ بی، بی، سی سے نشر کیا جائے۔ فیض صاحب اس زمانے میں لندن ہی میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ میں اپنی ایک پرتگالی شاعرہ دوست کے ہمراہ پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے فیض اور راشد کو یکجا دیکھا اور افسوس کہ یہ آخری موقع بھی تھا۔ دونوں لئے دیئے رہے۔ فیض صاحب تو اپنی فطری کم گوئی اور بہ وقت وسکی کے سبب سے گفتگو میں بخیلی کرتے رہے مگر راشد صاحب چہکتے رہے۔ وہ اپنی تقریر کی لذت سے ناآشنا نہیں تھے۔ میں نے یونہی سا ایک سوال پوچھا کہ انگریزی میں کیوں نہ لکھا جائے۔ فیض صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "لکھو۔ کسی زبان میں لکھو۔ میاں ساری بات تو لکھنے کی ہے۔" مگر راشد صاحب کی تاویلات اور دلائل کا دروازہ کھل گیا کہنے لگے "کوئی غیر ملکی، کسی دوسری زبان میں لکھنے کا اہل اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسے اجنبی زبان کے الفاظ کے تمام سایوں سے مکمل آشنائی ہو، یہ تو ہوئی نثر کی بات، نظم کا جہاں تک تعلق ہے شاعر کا اس زبان میں پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ بہت ادنیٰ درجے کی شاعری کرے گا۔ پھر مشاعرہ ریکارڈ ہوا۔ پہلے میں نے ایک نظم پڑھی، پھر راشد صاحب نے پھر فیض صاحب نے۔ دوسرا دور شروع ہوا تو میں نے ایک غزل پڑھی پھر فیض صاحب نے ایک غزل پڑھی اور غالباً راشد صاحب کی نظم پر ریکارڈنگ ختم ہوئی۔ میں مشاعرے کے اختتام سے پہلے چلا گیا، مجھے کہیں جانا تھا۔

اس کے بعد نیویارک اور تہران سے راشد صاحب وقتاً فوقتاً لندن آتے رہے اور ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ عموماً آنے سے پہلے ایک خط لکھ دیا کرتے کہ فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہوں فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ سب جاننے والوں کو مطلع کر دو اور کسی اچھے تھیٹر کا ٹکٹ بک کرا دو۔ اس کے علاوہ ہر عید اور کرسمس پر ان

کے کارڈ باقاعدگی سے ملتے رہے۔ عید کارڈ میرے نام اور کرسمس کارڈ میری بیوی کے لئے۔

ایک بار آپریشن کرانے ایسی افراتفری میں پہنچے کہ کسی کو اطلاع دینے کی مہلت نہ تھی۔ جب آپریشن ہو چکا اور طبیعت سنبھلی تو بی بی سی والوں کو فون کیا کہ ہارلے اسٹریٹ کی ایک پرائیویٹ کلینک میں آرام کر رہے ہیں۔ بی بی سی کے ایک صاحب، (جو شاعروں ادیبوں میں اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں) سحاب قزلباش، فہمیدہ ریاض اور ہمیں، اطلاع پاتے ہی ملنے کے لئے پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کے باغ باغ ہو گئے۔ پوچھا گیا طبیعت کیسی ہے کہنے لگے: "اس نیلی چھتری والے کا کرم ہے۔" کسی نے چھیڑا "نیلی چھتری والا کون؟" ہنس پڑے: "نہیں بھائی نہیں۔ اس کا کرم ہے۔" یہ واحد واقعہ ہے کہ انہوں نے خدا کا اتنی خاطر جمعی سے اقرار کیا۔ شاید زندگی کی طرف دوبارہ واپسی پر وہ اپنا کفارہ ادا کر رہے تھے۔ اگر ایسا تھا تو اس کفارے کی میعاد بہت مختصر تھی۔ پھر زندگی کی ہماہمی میں نہ انہیں خدا کی ضرورت پڑی نہ انہوں نے خدا کو یاد کیا۔ یوں بھی کسی منطقی دماغ میں خدا کے لئے گنجائش کم ہوتی ہے۔

میں دو تین دن بعد پھر حاضر ہوا۔ شیلا بھی تہران سے پہنچ گئی تھیں۔ وہ راشد صاحب کی دلداری کر رہی تھیں۔ ہمارا تعارف ہوا۔ دیکھا کہ فہمیدہ ریاض ایک دن پہلے آ کر اپنی کتاب دے گئی ہیں۔ پوچھا "پڑھی؟ کیسی ہے؟" کہنے لگے: "چھوٹی سی لڑکی، چھوٹا سا درد۔" ان کی ہر رائے میں ایک طرح کی قطعیت ہوا کرتی تھی۔ مگر اپنی ہر رائے کو پتھر کی لکیر نہیں سمجھتے تھے۔ دوسروں کی باتیں غور سے سنتے، اگر کوئی دلیل اور منطق سے قائل کر دیتا تو اپنی رائے میں تبدیلی کر لیتے۔ ایسا تازہ اور کشادہ ذہن میں نے نہیں دیکھا۔ میں چونکہ چھوٹا آدمی ہوں اس لئے جب یہ بھانپ لیتا ہوں کہ کسی محفل میں دانا میں ہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ میں ہی رہوں اور دوسروں کو موقع نہ دوں مگر راشد صاحب کی بڑائی یہ تھی کہ مجھ سے زیادہ جاہل اور ہٹ دھرم لوگوں کو بھی برابری کا درجہ دیتے اور بات کرتے اور سنتے چلے جاتے میں بیچ بیچ میں ہوتے ہوئے ٹوکتا بھی کہ کس بہن - - سے الجھے ہوئے ہیں مگر ان کے رویہ میں شمہ برابر فرق نہ آتا۔

وہ جب ہسپتال سے ضیا محی الدین کے خالی مکان میں دو ہفتے کے لئے منتقل ہو گئے تو ہم لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اس وقت عبداللہ حسین برمنگھم سے لندن آ گئے تھے۔ وہ راشد صاحب سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ میں نے فون پر کہا کہ عبداللہ کو لے کر آ رہا ہوں۔ کہنے لگے ضرور۔ عبداللہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس وقت ان کے سارے ناول کی تعریف کی مگر بعد میں یہ تعریف ناول کے کچھ حصوں تک رہ گئی تھی۔ یہ آخری دنوں کی بات ہے، ایک معمولی بات پر عبداللہ حسین سے خفا ہو گئے تو مجھے فون کر کے کہنے لگے: "وہ ایک PHONY_SNTELLECTUAL ہے۔" میں نے واویلا کیا کہ آپ تو عصمت چغتائی کی طرح باتیں کرنے لگے جو اداس نسلیں کو "آگ کا دریا" کا

ان کی پہلی شادی، ہمارے ہاں کی بیشتر شادیوں کی طرح، ان کی مرضی کی شادی نہیں تھی۔ اس میں والدین (یا والد) کی پسند کا دخل زیادہ تھا۔ مرحومہ ایثار اور سگھڑپن کا نمونہ تھیں اور ایسی صابر و شاکر کہ ان کی موجودگی نے راشد صاحب کو گھرگرہستی کے تمام فکروں سے نجات کر دیا تھا۔ بچوں کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری انہی کے سر تھی اس لئے بچوں کو ہمیشہ اپنی ماں سے قربت کا احساس زیادہ رہا۔ راشد صاحب اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے مگر اپنی شخصیت کی ساخت کے باعث اس کا اظہار کم کم کرتے تھے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ بچوں کو اپنے باپ کے ہیاں والہانہ پن اور گرمیٔ شوق کی شدید کمی کا احساس ہمیشہ رہا۔ اور ممکن ہے، ان کی بیوی بھی اس آگ پر جلتی رہی ہوں۔ راشد صاحب مجلسی آدمی تھے مگر ان کی بیوی کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں شوہر کی پرستش، بچوں کی دیکھ بھال، ایثار اور امورِ خانہ داری کی تیر گیری پر سارا زور ہوتا ہے (اور کیوں نہ ہو) اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں مجلسی رفاقت بھی دیں گی، ایک طرح کی زیادتی تھی۔ بہر حال راشد صاحب بعض ذہنی اور جذباتی تشنگیوں کی سیرابی مختلف عورتوں میں تلاش کرتے رہے۔ ان تمام لڑکیوں میں ایک چینی لڑکی اور ایک امریکی لڑکی ہیلن کی جنسی اور ذہنی رفاقت کے ہمیشہ احسانمند رہے۔ خاص کر ہیلن کے جو سکھ انہیں دیئے وہ ان کی یادداشت کا بہت قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ HETEROSEXUAL تھے اور ہیلن نے انتہائے شوق میں ان پر محبت کے سارے دروازے وا کر دیئے تھے۔

اب میں شیلا کے بارے میں چند ایسی باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو شاید شیلا کو پسند نہ آئیں گی مگر راشد صاحب میری جس راست گوئی سے اپنی حق گوئی کا بار بار موازنہ کرتے تھے اس کا تقاضہ ہے کہ میں اپنی بے باکی پر حرف نہ آنے دوں۔ تکلیف پہنچانا میرا شیوہ نہیں مگر سچائی سفاک ہوتی ہے۔

جب نیو یارک میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو شیلا ۳۲ اور راشد صاحب ۵۳ سال کے تھے۔ راشد صاحب یو۔ این۔ او میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور شیلا یو۔ این۔ او کے اسکول میں استانی تھیں۔ راشد صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی ثمرین شیلا کی شاگرد تھیں اور وہی ان دونوں کی ملاقات کا وسیلہ ہوئیں۔ راشد صاحب کے قول کے مطابق انہوں نے رعب ڈالنے اور رجھانے کے لئے شیلا کو یو۔ این۔ او کے ایک ایسے جلسے میں مدعو کیا جس میں وہ تقریر کر رہے تھے۔ اور یہیں سے ان کی پینگیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ شیلا کہتی ہیں وہ پانچ سات مہینے عجب طوفانی کورٹ شپ میں گزرے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں رفاقت کو ترسے ہوئے تھے۔ شیلا جو ایک شدید عشق کی ناکامی کے بعد خاصی ٹوٹی ہوئی تھیں، ایک پختہ عمر کی استانی کی ویران زندگی سے اکتا گئی ہوں گی۔ راشد صاحب جو

اپنی بیوی کی زندگی ہی میں بیوی سے ناآسودہ تھے یا ہو گئے تھے، انہیں عورت چاہئے تھی (شیلا نے اپنے ایک خط میں مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلی بیوی کے انتقال کا ایسا صدمہ ان پر ہوا کہ مہینوں وہ اپنے کمرے میں بند رہے) پھر کسی ذو حس بیوی کا طعنہ برداشت کرنے کی سکت ان میں پہلے ہی نہیں تھی۔ اور پچاس سال کی سرحد پھلانگ کر عمر کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی ذکی الحس ہو گئے تھے۔ پھر یہ نہ بھولئے کہ وہ ادیب (جس کی برتری سے وہ ہمیشہ برسرپیکار رہے) کے مقابلے میں تخت! احساس کمتری کا شکار شیلا کو ان کے عہدے اور دماغ نے اور انہیں شیلا کی جوانی اور سفید رنگ نے شکست دی ہوگی۔ دونوں ذہنی پختگی کی اس منزل میں تھے کہ عاشقانہ سرمستی ان کے اختیار میں نہیں تھی۔ یہ اپنی شخصیتوں کے چقماق کے ٹکراؤ کی روشنی کو محبت کا نور سمجھے۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ساتھ انا اور تمکنت کی جنگ کے سائے سائے رفاقت اور ہمسری کے پودے بھی پروان چڑھتے رہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے "جیون ساتھی" کم اور ایک دوسرے کی "مجلسی ضرورت" زیادہ بنتے گئے۔ راشد صاحب کی فراست، تازہ ذہنی اور جذباتی شخصیت ایسی تھی کہ سطحی اور بے تہہ عورتوں ایسی کامیاب ازدواجی زندگی گزارنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک طرف پہلی بیوی کی منفعلانہ شخصیت تھی جو ان کی بے قدری کا شکار ہوئی، دوسری طرف شیلا کی کٹر، بند اور نیم جاہلانہ ذہنیت تھی جس سے راشد صاحب آخری وقت تک برسرپیکار رہے۔ راشد صاحب گرو تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے علم اور خیال کے خزانے سے شیلا بھی گاہے گاہے سیراب ہوتی رہیں مگر شیلا ایک کٹر رجعت پسند پٹھانی کی طرح اپنے دل اور ذہن کے سارے دروازے بند کئے بیٹھی رہیں اور اس بات پر کڑھتی رہیں کہ راشد صاحب پریکٹیکل آدمی نہیں تھے یعنی مثلاً انہیں کیل ٹھوکنی آتی تھی نہ جھاڑو دینی۔ شعرا اپنی بیویوں یا عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بھی ان کی شاعری کی خوبیوں کو سراہیں گی یا سمجھیں گی مگر انہیں اپنی شاعرانہ شخصیت اور اپنے لاابالی پن کو سراہے جانے کی توقع ضرور ہوتی ہے۔ پہلی بیوی میں اس کا فقدان بھی سہی مگر شوہر کے ساتھ بیٹھ کر پی لینے میں شیلا کی کس حس کو تسکین پہنچتی تھی کہ "مجھے شاعری سے کبھی کوئی دلچسپی رہی نہ ہوگی۔" یہ کھلا رد دیا گیا ہوا۔ راشد صاحب مشرق کے سلسلے میں شیلا کی بے تعلقی اور کٹھ حجتی دیکھ کر بار بار فیض کی بیوی اور غلام عباس کی بیوی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ پھر راشد صاحب خاصے دریادل اور خرچیلے واقع ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹل، عمدہ شرابیں، ٹھاٹھ دار کھانے مگر شیلا کا ہاتھ کھلا ہوا نہیں ہے۔ کئی بار راشد صاحب نے مجھ سے کہا "میں تمہارے پاس ٹرین سے آنا چاہتا ہوں مگر شیلا بار بار بس پر اصرار کرتی ہیں۔" ظاہر ہے بس کا کرایہ آدھا تھا مگر بس کے سفر سے راشد صاحب بور ہوتے تھے کہ وقت دگنا لگتا تھا مگر شیلا کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی جبکہ پیسے بھی راشد صاحب ہی کے تھے۔

یہ دونوں ایک طرح کے LOVE - HATE کے ازدواجی پھیر میں اسیر ہو گئے تھے اور اس گرفتاری کے بعد انہیں ایک دوسرے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ شیلا کہتی ہیں کہ راشد صاحب کے انتقال سے چار پانچ ہفتے پہلے دونوں کے درمیان ایک عجیب طرح کی خوشبودار محبت نے جنم لیا تھا۔ شیلا کی راست گوئی میں مجھے شک نہیں۔ افسوس کہ راشد صاحب کی بے وقت موت کے باعث میں اس مضمون میں اس خوشبو کو مقید کرنے سے قاصر ہوں تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ اس مضمون سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ ان میں ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کی درد گساری بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے سے حسبِ استطاعت محبت کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مگر شخصیتوں کی پختہ کاری ایسی کہ سپردگی کی شہریاری کم اور تمکنت کی ستیزہ کاری زیادہ رہی۔

راشد صاحب کی شخصیت اتنی رنگا رنگ اور ہمہ گیر تھی کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ایک مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اور میری کوشش کی حیثیت ایک اشاریہ سے زیادہ نہیں۔ تاہم چند واقعات اور مکالمات کا تذکرہ ضروری ہے۔ میں گاہے گاہے ان سے ان کی برائیوں اور اچھائیوں کی تفصیل طلب کرتا رہتا تھا۔ ان کی بڑائی یہ تھی کہ نہایت بیباکی سے اپنے رازہائے سربستہ سے پردے اٹھاتے جاتے تھے۔ ایک بار اردو کے ایک شاعر کا حوالہ دے کر کہنے لگے: "نہ میں نے رنڈی بازی کی نہ کسی طوائف کے قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہوا۔ اس کے باوجود میں علامہ بننا نہیں چاہتا۔ میں غالب کی زندہ، متحرک، اور مکمل شخصیت کی طرح سامنے آنا چاہتا ہوں۔" وہ آدمی تھے اور آدمی ہی رہنا چاہتے تھے۔ وہ خاکی تھے، نہ نوری تھے، نہ ناری تھے۔ اور ہر چند ساری عمر وہ شاعروں کے شاعر رہے۔ اور عوام کے شاعر نہ بن سکے پر انہیں گفتگو عوام ہی سے رہی۔ ایک دفعہ کہنے لگے: "اپنی ریڈیو کی زندگی میں، اپنے چند ماتحتوں پر میں نے سختی ضرور برتی اور اس پر کڑھتا بھی ہوں۔ مگر بنیادی طور پر ظلم اور ناانصافی کا سخت مخالف ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں ناانصافی نہیں۔ جو شاعر ناانصافی کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے اسے شاعری کرنے کا حق نہیں۔"

ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ راشد صاحب نے فون کیا کہ میں پاکستان کے سفیر میاں ممتاز دولتانہ تک یہ خبر پہنچا دوں کہ وہ مستقلاً انگلستان میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ زندگی میں کسی سفیر یا وزیر کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ مجھ سے ملاقات کرے۔ میاں صاحب اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر حکم عدولی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ میں نے میاں صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ راشد صاحب آ گئے ہیں اور یہیں بسنے کا ارادہ ہے۔ ساری عمر ملک سے باہر

رہے۔ اب ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں پیسوں ویسوں کی ضرورت نہیں۔ صرف مصروفیت چاہیئے۔ ان کے علم اور تجربے کا کوئی مصرف نکل آئے تو بات چلے۔ ظاہر ہے میاں صاحب اس سے واقف تھے کہنے لگے "میں انہیں جانتا ہوں، ان سے مل کر بڑی خوشی ہوگی، کسی دن انہیں دفتر لے آیئے۔" بات آئی گئی ہو گئی مگر دو دن بعد میاں صاحب نے فون کیا اور ملاقات کا وقت دیا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی، راشد صاحب کو ساتھ لیا اور ایمبیسی پہنچ گیا میاں صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ ہمیں چائے پلائی اور چالیس پینتالیس منٹ تک یہ صحبت جاری رہی۔ راشد صاحب کا انداز عجیب تھا۔ وہ بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف میاں صاحب ایک طرف میں۔ راشد صاحب نے نہ میاں صاحب کی طرف دیکھا نہ میری طرف اور دیوار کی طرف رخ کئے چالیس منٹ تک اپنے بارے میں بولتے رہے۔ میں بیچ بیچ میں کبھی کبھار موضوع بدلنے کی کوشش کرتا رہا مگر ان کی اما ترنگ پر تھی اور مجھے اس کا لطف بھی آ رہا تھا راشد صاحب اس راز سے واقف تھے کہ وہ پاکستان کے تمام سفیروں اور وزیروں سے زیادہ ذہین، عالم اور روشن طبع ہیں۔ اور اس خاص صحبت میں اسی کا اظہار مقصود تھا۔ ورنہ انہیں اپنی آواز سننے کا ایسا شوق نہیں تھا کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ دیں۔ کچھ دنوں بعد ان کے ایک اور سفیر دوست سے ملاقات ہوئی۔ ہم ساری رات شراب پیتے رہے، گندی گندی باتیں کرتے رہے، عالمانہ موشگافیاں بھی رہیں مگر اس صحبت میں راشد صاحب کی گفتگو میں طنطنے کا نام تک نہ تھا۔ راشد صاحب کم اور دوسرے زیادہ بولتے رہے۔ یہاں انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہیں۔ سب ان کے مقام سے واقف تھے اور بزم آشنا میں وہ گلاب کی طرح کھل اٹھتے اور ایک مطمئن مسکراہٹ چہرے پر بکھر جاتی۔

اب میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کے ذکر سے خود مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ راشد صاحب کیا ایسا کرتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے ان کا اپنے بچوں کے ساتھ کوئی گہرا جذباتی رشتہ کبھی نہیں رہا مگر اپنے تمام بچوں سے شدید محبت کرتے تھے اور ان کے مستقبل کی فکر میں ہر وقت جلتے رہتے تھے۔ (میں نے سنا ہے انہوں نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے شہریار کو ۱½ لاکھ روپے اور اپنی ہر بیٹی کو ۵۰ ہزار روپیہ بھجوا دیئے تھے سوائے ایک بیٹی کے جنہیں وہ اپنا لاہور والا مکان دینا چاہتے تھے۔ شیلا کہتی ہیں کہ کاغذات کی منتقلی عنقریب مکمل ہو جائے گی اس کے علاوہ ان کی لائف انشورنس سے پہلی بیوی کے تمام بچوں کو ۳۰، ۳۰ یا ۴۰، ۴۰ ہزار روپے مل جائیں گے۔)

اپنے تمام بچوں کا ذکر نہایت شفقت اور محبت سے کرتے۔ خطوں میں تاخیر ہوتی تو رنجیدہ رہتے، ہر وقت

ان کی خیریت کی فکر لگی رہتی۔ کسی کا خط ملتا تو چہرے پر دھوپ نکل آتی۔ مگر اپنی ایک بیٹی کے مستقبل کی فکر سے اکثر مضمحل رہتے۔ کہتے کہ اس لڑکی کو شاید کبھی معلوم نہ ہوگا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے خفا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان کی یہ صاحبزادی ان سے خفا کم اور روٹھی ہوئی زیادہ تھیں۔ خفا وہ شیلا سے بھی۔ اصل میں شیلا کا اپنی سوتیلی بیٹیوں کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ کبھی نہیں رہا۔ راشد اور شیلا کی شادی کے وقت جہاں رشتہ داروں نے مخالفت کی ہوگی وہیں بیٹیوں نے بھی (میں سب سے چھوٹی بیٹی کا ذکر نہیں کر رہا کہ وہ بچی تھیں اور شیلا کی شاگرد تھیں) ایک طرح کا متحدہ محاذ بنایا ہوگا۔ دوسری طرف شیلا تھیں جنہوں نے بجا طور پر راشد صاحب پر جتا دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ان کی جوان لڑکیوں کے ساتھ نہیں رہیں گی اور راشد صاحب نے صدق دل سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ شخصیتوں کے بُعد سے آگاہ تھے۔ قصور کسی کا نہیں تھا اور اگر تھا تو سب کا تھا اور سب سے زیادہ حالات کا تھا جن سے کسی کو رستگاری نہیں تھی۔ ایسے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اپنی ایک بیٹی کے ایک خط کے ذکر سے وہ اکثر مرجھا جاتے۔ کاش یہ غلط فہمی ان کی زندگی ہی میں دور ہوگئی ہوتی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ راشد صاحب اور شیلا شادی کرنے لندن پہنچے۔ وہ ہوٹل میں ٹھہرے، یہ اپنے والدین کے ساتھ۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ شیلا سے ملنے گئے۔ باتوں باتوں میں تمزین (سب سے چھوٹی بیٹی) کی گڑیاؤں کا ذکر آیا۔ کہنے لگے تمزین بڑی ہوگئی ہے اب اسے گڈے گڑیا کے کھیل کی ضرورت نہیں۔ نیو یارک جاکر میں ساری گڑیائیں پھینک دینا چاہتا ہوں۔ شیلا نے کہا تمزین کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دھیرے دھیرے اس کا ذہن دوسری چیزوں کی طرف بٹایا جائے۔ کہنے لگے نہیں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ساری گڑیائیں پھینک دی جائیں۔ شیلا نے کہا میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ یک دم کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ میں اپنے بچوں کے سلسلے میں کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کروں گا، بچے میرے ہیں اور ان کے دیکھ بھال کی ذمہ داری میری اور صرف میری ہے مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اپنے مزاج کے باعث دخل اندازی سے باز نہیں آؤ گی۔ اس لئے اس بارے میں میں نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا ہے اور وہ قطعی ہے۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر اسٹیشن چلے گئے۔ ظاہر ہے شیلا سخت حواس باختہ ہوئی ہوں گی۔ پیچھے پیچھے اسٹیشن پہنچیں۔ وہ جلال کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ شیلا کہتی ہیں معافی مانگنے میں اور منانے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ تب جاکر وہ رام ہوئے۔ شیلا کو اس وقت تک دھڑکا لگا رہا جب تک وہ اپنے BEST MAN عباس احمد عباس کے ساتھ دوسرے دن رجسٹرار آفس میں پہنچ نہیں گئے۔ "شوہر راشد" اور "باپ راشد" میں آخری وقت

تک یہ جنگ جاری رہی مگر شاعر راشد کی کشادہ قلبی تھی کہ [illegible]

آیئے ان کی شخصیت کے چند [illegible] کے توسط سے چند شاعروں ادیبوں کے بعض رویوں کو بھی فیض صاحب کی [illegible] میں ان کی فیض کی دو ملاقاتوں کا ذکر کروں گا اور بس۔ ایک بار [illegible] سے لاہور [illegible] نکلے تو اک ہیڈرول میں پر فیض صاحب اور ان کی بیوی سے اچانک ملاقات ہو گئی [illegible] بغیر ہوئے فوراً اپنی بیوی سے کہا راشد صاحب کو کھانے پر بلائیں۔ [illegible] راشد [illegible] دیکھیں اور [illegible] نوٹ کر لی۔ وقت نوٹ کر لیا۔ راشد صاحب عرب میں رہتے تھے [illegible] وقت کے [illegible] پابند [illegible] رات کا وقت تھا۔ راشد صاحب نے گھنٹی بجائی تو کوئی جواب نہیں۔ راشد صاحب [illegible] دو تین بار گھنٹی بجائی تو اوپر کھڑکی سے فیض صاحب کا سایہ نمودار ہوا۔ پوچھا "کون ہے؟" انہوں نے کہا "راشد" جواب ملا "ارے یار تو کہاں —— اچھا —— آ رہا ہوں۔" یہ بہت جز بز اور شرمندہ فیض صاحب نیچے اترے، دروازہ کھولا اور کہنے لگے "میں سمجھا تھا تو مصروف آدمی ہے یار۔ نہیں آئے گا۔" یہ کیا جواب دیتے۔ انہوں نے کہا "بھئی تم نے کھانے پر بلایا اور میں نے وعدہ کر لیا، آتا کیسے نہیں۔" یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر راشد صاحب کے [illegible] ڈھونڈ ڈھانڈ کے بستر کے نیچے سے وسکی کی ایک شیشی (جو ہوائی جہازوں پر مسافروں کو دی جاتی ہے اور جس [illegible] سے دو پیگ ہوتے ہیں) نکالی اور یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ "آدھی تو پی آدھی میں پیوں گا۔" راشد صاحب شیشی کا حجم دیکھ کر اتنے شرمندہ ہوئے کہ پینے سے انکار کیا۔ فیض صاحب نے غٹاغٹ وسکی ختم کی اور شاید دونوں موسم اور حالاتِ حاضرہ پر کچھ دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ راشد صاحب کی طبیعت اتنی منغض تھی کہ زیادہ دیر نہیں بیٹھے اور کوئی بہانہ کر کے اٹھ کر چلے گئے۔ راشد صاحب نے یہ واقعہ کئی بار سنایا۔ انہیں رنج یہ تھا کہ فیض صاحب نے معافی تک نہیں مانگی۔

کئی سال بعد وہ پھر لاہور آئے تو فیض صاحب نے پھر کھانے پر بلایا۔ وہ پہنچے تو فیض صاحب منتظر تھے۔ مصافحے کے بعد فیض صاحب نے کہا "یار فلاں نے چودھری صاحب کی طرف چلنا ہے، اچھی شراب ملے گی۔" راشد صاحب نے کہا "میں انہیں نہیں جانتا۔ نہ مجھے انہوں نے بلایا ہے۔" فیض صاحب کہنے لگے "ارے فکر نہ کر یار تجھے وہ خوب جانتے ہیں۔" ناچار بادلِ نخواستہ یہ ساتھ ہو لئے۔ شراب کے کئی دور چلے پھر فیض صاحب کہنے لگے "یار فلاں نے صاحب کی طرف چلنے ہیں۔" یہ عجب مشکل میں تھے۔ کرتے تو کیا کرتے پھر ساتھ ہو لئے۔ پھر شرابیں چلیں۔ فیض صاحب کہنے لگے "یار فلانے شیخ صاحب

کے یہاں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے یہاں کباب بڑے لذیذ ملتے ہیں۔" اب راشد صاحب سے نہ رہا گیا انہوں نے کہا "فیض! دعوت تم نے میری اپنے یہاں دی تھی اور یہ ہو رہا ہے کہ تم زیدی بکر عمر کے یہاں مجھے گھسیٹے پھر رہے ہو، ان لوگوں کو میں جانتا تک نہیں، اس طرح کی جارحانہ مفت نوشی اور مفت خوری میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اس لئے مجھے اجازت دو۔" میرا خیال ہے راشد صاحب کے صبر و ضبط پر قیامت گزر گئی ہوگی۔ وہ سخت اصولوں کے آدمی تھے اور انہیں فیض صاحب کے رویئے سے یقیناً بڑی کوفت ہوئی ہوگی۔ انہیں اس بات کا بھی صدمہ تھا کہ فیض صاحب پر شراب نے اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ SELF RESPECT کا زخمی پرندہ ان کے اندر پھڑپھڑا تا رہتا ہے اور انہیں خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ انہیں اس بات کا رنج ہمیشہ رہا کہ ہماری ساری قوم EASY GOING ہے اور اسی باعث ابھر نہیں پا رہی۔ وہ ڈسپلن کے سخت قائل تھے اور دوسروں میں اس کی کمی انہیں اکثر اداس رکھتی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈسپلن ہی کی تلاش میں وہ خاکسار پارٹی کی طرف گئے ہوں گے۔ خاکسار پارٹی میں اپنی شمولیت سے وہ اکثر شرمندہ نظر آئے مگر علامہ مشرقی کے بہت قائل تھے اور گفتگو میں پطرس بخاری اور علامہ مشرقی کا حوالہ بار بار دیتے تھے۔

ن۔م۔ راشد اور احمد ندیم قاسمی کے مابین ایک طرح کی COLD WAR ہمیشہ رہی۔ راشد صاحب نے قاسمی صاحب کے سلسلے میں ادھر اُدھر کئی بار لکھا۔ میں بھی احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا قائل نہیں ہوں۔ ان کی ۹۵ فیصدی شاعری مجھے پسند نہیں۔ اس کا اظہار میں نے اپنے دو مضامین میں اور قاسمی صاحب کے نام ایک خط میں بھی کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب میری رائے سے واقف ہیں مگر ان کی بڑائی یہ ہے کہ مجھے بخش رکھا ہے۔ یہی نہیں میری تعریف کر کے مجھے شرمندہ کرتے رہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب جیسا کشادہ دل، دردمند اور انسان دوست مجھے سارے ہندوستان پاکستان میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم آدمی ہیں، عظیم شاعر وہ ہرگز نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری سے جب راشد صاحب انکار کرتے تھے تو مجھے تکلیف نہیں ہوتی تھی مگر اس ۱½ سال میں پچاسوں دفعہ قاسمی صاحب پر میرا ان کا اختلاف ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ قاسمی کی انسان دوستی اور دردمندی اور درد گساری سب ڈھونگ ہے۔ میں کہتا تھا کہ قاسمی صاحب کے جتنے ملاقاتی مجھے ملے سب نے یک زبان ہو کر قاسمی صاحب کی محبت اور شرافت کے گُن گائے ہیں (سوائے صفدر میر کے جنہیں منٹو کی طرح، قاسمی صاحب میں فراڈ نظر آیا) یہ میں مان نہیں سکتا کہ یہ شخص فراڈ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے انتقال سے ۱۵، ۲۰ دن پہلے مشہور روسی شاعر یوتوشینکو چیلٹنہم آئے تو راشد صاحب نے فون کیا کہ میں آجاؤں، انہوں نے ٹکٹ خرید لیا ہے۔ عبداللہ حسین میرے یہاں

آئے ہوئے تھے انہوں نے بھی راشد صاحب سے بات کی اور پرنو تشینکو کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ راشد صاحب نے ہم دونوں کو بلا لیا۔ یہ ہماری راشد صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اسی دن صبح کو میرے نام قاسمی صاحب کا خط آیا۔ یہ "افکار" کے قاسمی نمبر کے بعد کا زمانہ تھا اور ظاہر ہے قاسمی صاحب نے اس نمبر میں راشد صاحب کا خط پڑھ لیا ہوگا۔ قاسمی صاحب کو کسی نے ایک غلط اطلاع یہ دی تھی کہ میں راشد صاحب پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اپنے خط میں اسی اطلاع کے حوالے سے قاسمی صاحب نے مجھے لکھا "سنا ہے آپ راشد صاحب پر کوئی کتاب لکھ رہے ہیں؟ اگر آپ ایسا کر رہے ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔" یہ خط اپنے ساتھ چلتے ہوئے لیتا گیا۔ ہم دونوں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ادیبوں شاعروں اور مدیروں کے سارے خطوط ایک دوسرے کو دکھائیں۔ یہی نہیں راشد صاحب اگر کسی کو خط لکھتے یا کوئی مضمون لکھتے یا کوئی نظم کہتے تو اس کی ایک کاپی ڈاک سے مجھے ضرور بھیج دیتے، ان کا یہ کرم آخری وقت تک جاری رہا۔ ان تمام نقلوں میں "ضیا جالندھری کے نام" والے خط کی نقل راشد صاحب کی دلچسپ ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ اس کا ذکر کہیں آگے آئے گا۔ عبداللہ اور میں جب ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گپ ہانکنے لگے تو میں نے جیب سے خط نکال کر ان کے حوالے کیا، خط ختم کر کے کہنے لگے "کہاں ہے بھئی وہ کتاب؟" میں ہنس پڑا "راشد صاحب فکر نہ کیجئے۔ کتاب کا منصوبہ ذہن میں ہے اور میں ہی نہیں سینکڑوں لوگ آپ پر کتابیں لکھیں گے مگر قاسمی کے بارے میں آپ کا اب کیا خیال ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ آدمی کھرا سونا ہے۔" اس کے باوجود انہوں نے اپنے اس لمبے خط کا ذکر نہیں کیا جو انہوں نے قاسمی صاحب کی تعریف میں "افکار" کو بھیج دیا تھا اور جس کی نقل مجھے نہیں بھیجی تھی۔ یہ ان کا واحد خط ہے جس کی نقل مجھے ان کے کاغذات میں ملی، جو انہوں نے میرے لئے تیار کی تھی مگر مجھے نہیں بھیجی۔ اور کہا تو اتنا کہا: "اس ایک فقرے سے میں اپنی رائے کیوں تبدیل کروں۔" عبداللہ حسین نے کہا: "راشد صاحب ممکن ہے ساقی درست ہی ہو اور وہ آدمی (یعنی قاسمی صاحب) اندر سے سچا ہو۔" اب ان کی آواز میں من جانے والی معصومیت تھی۔ کہنے لگے "ہوگا — تو میں کیا کروں۔" میں نے سنہ پا کر کہا "راشد صاحب آج میں وہ سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کی بنا پر آپ اور ندیم قاسمی رنجیدہ خاطر ہوئے۔" پائپ کا ایک لمبا سا کش کھینچ کر ہمیں اپنے قریب بلا لیا کہنے لگے: "جس زمانے میں ندیم اور میں ریڈیو اسٹیشن پشاور میں یکجا ہوئے، یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک دن وہ میرے دفتر میں آئے اور کہنے لگے کہ ریڈیو پر نسوانی آوازوں کی کمی ہے چند خواتین کو سامنے لائیے۔ اس زمانے میں ان کے یہاں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں نے کہا خواتین میں کہاں سے پیدا کروں، دو ذہین لڑکیاں تھیں انہیں آپ اغوا کئے بیٹھے ہیں، میں کیا کروں۔ یہ فقرہ کہہ کر میں ہنسا مگر قاسمی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ

غصے سے کھڑے ہو گئے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ پانچ سات منٹ بعد واپس آئے۔ کہنے لگے، راشد صاحب! اگر آپ ن۔ م۔ راشد نہ ہوتے تو میں اتنے زور سے طمانچہ مارتا کہ آپ کا چہرہ بگڑ جاتا۔ یہ کہہ کر جذبات سے ہانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ کسی مزیدار فقرے کو سراہنے کا ایسا فقدان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سنا ہے اب وہ ہنسنے ہنسانے لگے ہیں۔ بس یہیں سے ہمارے تعلقات میں گرہ پڑ گئی۔" انہوں نے اتنی صاف گوئی اور معصومیت سے ہمیں یہ واقعہ سنایا کہ عبداللہ حسین اور میں ان کے اور ان کی بڑائی کے اور قائل ہو گئے اور ہمارے دلوں میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

بعد میں ان کے کاغذات میں جب مجھے اس خط کی نقل ملی جو انہوں نے صہبا لکھنوی کو لکھا تھا تو مجھے سخت تعجب ہوا اور عجب مسرت حاصل ہوئی کہ انہوں نے قاسمی صاحب کی شخصیت ہی نہیں، ان کی شاعری کی تعریف میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ دوسری طرف انہیں کاغذات میں پنسل سے لکھا ہوا یہ فقرہ بھی ملا "احمد ندیم قاسمی کی شاعری سبزی خور ذہن کی پیداوار ہے۔" مجھے یقین ہے اس فقرے کے حسن پر قاسمی صاحب بھی مسکرائیں گے۔ اچھا فقرہ چاہے کسی کا ہو اور چاہے کسی پر ہو، ضائع نہیں جانا چاہیئے۔ میں راشد صاحب اور قاسمی صاحب کے تعلقات پر مزید کچھ نہیں لکھنا چاہتا مگر پشاور والے واقعے کے باب میں اتنا مزید کہوں گا کہ ان دو مشہور لکھنے والیوں کے سلسلے میں چند کمینے مرد ادیبوں، شاعروں نے بعض احمقانہ اور ذلیل افواہیں پھیلا رکھی تھیں۔ میرا خیال اغلب ہے کہ ہاجرہ مسرور کی جودت طبع اور خدیجہ مستور کی فراست نے ان لوگوں میں احساس کمتری پیدا کی ہو گی۔ ظاہر ہے قاسمی صاحب جو طبعاً شریف ہیں، وہ ان افواہوں سے خاصے دکھی اور زخمی ہوں گے، ایسے میں راشد صاحب کے فقرے سے اور ٹوٹ گئے ہوں گے ورنہ وہ ایسے سخن ناشناس نہیں کہ مذاق اور کینے کا فرق نہ سمجھیں۔ دل دکھانا راشد صاحب کا شیوہ نہیں تھا۔ ہاں اگر کوئی ان کا دل دکھاتا تو ہزار طرح کے آزار دینے کے درپے رہتے۔ مگر دل دکھانے میں پہل کبھی نہیں کرتے تھے۔ میں اس کا گواہ ہوں۔

اک دوسرا قصہ سنئے۔ آخری بار جب راشد صاحب پاکستان گئے تو کراچی ٹیلیوژن والوں نے انہیں مدعو کیا کہ ایک انٹرویو ریکارڈ کرا دیں۔ انٹرویو کرنے کے لئے ضیا جالندھری سے زیادہ موزوں آدمی کراچی میں اور کون ہوتا جو خود ایک خوش گو شاعر ہیں اور جن سے راشد صاحب کے برسوں پرانے تعلقات تھے۔ وہ آئے تو انہوں نے انٹرویو کرنے سے انکار کر دیا۔ ضیا جالندھری کو اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ہم سب کی طرح ضیا جالندھری بھی ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے اور ہیں۔ پھر یہ کہ طبعی اور شاعرانہ عمر میں بھی راشد صاحب

چھوڑ گئے تھے۔ انہیں انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جب راشد صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو مجھے سخت کوفت ہوئی اس لئے بھی کہ راشد صاحب اس بات سے آزردہ رہے۔ ضیا جالندھری میرے پرانے کرم فرما اور بہت اچھے دوست ہیں۔ ایک دن بی بی سی ٹیلیویژن کے سلیم شاہد کا فون آیا: "ضیا آرہے ہیں، مشاعرہ کرانا چاہتا ہوں مگر راشد صاحب نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اصرار کر کے تھک گیا مگر ان کی "نہیں" کا کوئی جواب نہیں۔ انہیں صرف تم لا سکتے ہو۔" میں نے کہا، "انہیں فون مت کرو۔ ریکارڈنگ کا انتظام کرو۔ مہمانوں کو دعوت نامے بھیج دو۔ میں لے آؤں گا۔ مجھ پر چھوڑ دو۔" شام کو راشد صاحب کو فون کیا۔ وہی دل موہ لینے والی آواز آئی "ہنہ ساقیا" میں نے کہا، "راشد صاحب ضیا جالندھری آرہے ہیں" کہنے لگے "معلوم ہے"۔ میں نے کہا "سلیم شاہد نے فون کیا تھا" کہنے لگے "میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا، "راشد صاحب، ملنا تو آپ کو پڑے گا ہی کہ ضیا کو میں اپنے گھر پر بلاؤں گا۔ یعنی آپ، ضیا، عبداللہ اور میں، ہم چاروں مل کر ہنگامہ کریں گے۔" کہنے لگے "تمہارے یہاں بھی نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا "آپ کیا چاہتے ہیں، میں خودکشی کر لوں؟ اپنے کو گولی ماروں؟" ہنسے، کہنے لگے "ساقی مجھے مجبور مت کرو۔" مگر مان گئے۔ پل میں ہیرا پل میں ریشم۔ افسوس کہ ضیا جالندھری کا دورہ لندن منسوخ ہو گیا ورنہ دلوں کی صفائیاں ہو جاتیں۔ یہ غالباً مئی یا جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔

اس سے پہلے ۷ اپریل کو انہوں نے ضیا جالندھری کو ایک خط لکھا تھا جس کی ایک نقل مجھے بھیجی تھی[1]۔ خط یوں شروع ہوتا تھا: "عزیزی ضیا۔ حال ہی میں کراچی سے کسی دوست نے اپنے ایک خط میں تمہارے کسی تازہ مضمون کا ذکر کیا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ اس خاکسار کا بھی ذکر خیر ہے۔ اس نے تمہارے مضمون سے صرف دو جملے نقل کئے ہیں۔۔۔۔" اس خط کی نقل انہوں نے صبح کو مجھے ڈاک سے بھیجی مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ شام کو فون آیا: "میں تمہیں ٹیلیفون پر وہ خط سنانا چاہتا ہوں۔" خط کا پہلا فقرہ، جو میں نے اوپر درج کر دیا ہے، سنا کر ہنسنے لگے "میں اسے (یعنی ضیا کو) یہ شک نہیں دینا چاہتا کہ اس کا مضمون میری نظر سے گزر چکا ہے۔ حالانکہ میں سارا مضمون افکار میں پڑھ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر شرارت سے خوب ہنسے۔ یہ ان کا بدلہ تھا۔ کمال زندہ اور متحرک آدمی تھے۔ ہر فقرے کی کاٹ محسوس کرتے اور حملہ کرتے۔ کوئی ایک فقرہ کہتا یہ دس فقرے نکالتے۔ وہ بزرگ ہو کر OUT OF DATE ہونا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر وقت ادب کے مرکزی دھارے میں شامل رہنا چاہتے تھے۔ ماضی سے ان کی دلچسپی کم تھی، وہ مستقبل کے آدمی تھے اور حال سے اپنا خراج وصولتے رہتے۔

۱؎ یہ خط نیا دور کے اس شمارے میں شامل ہے۔ ساقی

میں نے اس مضمون میں ان کی شخصیت کی چند جھلکیاں دکھادی ہیں۔ ان کی شاعری الگ مضمون یا کتاب مانگتی ہ۔ زندگی نے مہلت دی تو اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال اس ضدی اور جنگجو شاعر کے ایک نعرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں

ایک بار فون آیا "ساقی۔ چوتھا مجموعہ تیار ہے۔ میری خواہش ہے کہ دیباچہ تم لکھو" میں بوکھلاہٹ میں ڈھیر ہو گیا۔ پھر ذرا سنبھلا تو ہکلا ہکلا کر عرض کیا کہ میری کیا مجال راشد صاحب ؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ کو پڑھ پڑھ کر تو شعر لکھنا شروع کیا ہے۔ آپ میری سست رفتار ذہانت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ آپ پر مضمون لکھنے کے لئے مجھے کم از کم ایک سال کی فرصت درکار ہے کہ میں راشد کو اقبال کے بعد (یگانہ اور فراق، فیض اور میراجی کے باوجود) اردو شاعری کی سب سے زیادہ دور رس اور طاقتور آواز سمجھتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ انہوں نے میری جان بخشی کر دی۔ کہنے لگے "اچھا۔ یار، مگر وہ مضمون سوچنا تو شروع کر دو" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگے "تو ایسا کرتا ہوں کہ اپنے آپ سے سوال جواب کرتا ہوں، میرا خیال ہے دیباچے کی یہ صورت بہتر رہے گی، اس میں ندرت بھی ہے" پھر اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

افسوس کہ وہ "اگلا ہفتہ" پھر کبھی نہیں آیا کہ اس عرصے میں یہ عالم شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ بعد میں ان کے کاغذات میں مجھے مندرجہ ذیل عبارت نظر آئی یعنی "ن۔م" کا ایک سوال اور "راشد" کا جواب۔

"ن۔م:۔ آپ کسی اعتبار سے "پاپولر" شاعر نہیں ہیں۔ پھر یہ چوتھا مجموعہ کیوں شائع کر رہے ہیں۔؟

راشد:۔ "ماورا" جب شائع ہوئی تھی تو اس نے ادبی حلقوں میں خاصا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اکثر لوگوں نے اس کی تعریف کی یا مذمت، مضحکہ اڑانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ ایسے لوگ کم ہیں جنہوں نے بعد کے دو مجموعوں کی کسی گہرے شعور اور فراست کے ساتھ ستائش کی ہو۔ اسی سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجموعے "ماورا" سے بہتر ہیں اور ان میں زیادہ گہرائی ہے۔ بعض لوگ ان کو "ماورا" ہی کا شاخسانہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس پر خوش نہیں ہیں کہ شاعر نے بعد کے مجموعوں میں کوئی نئی کروٹ لی ہے یا نئے استعجاب یا نئی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ چوتھے مجموعے پر بھی اگر فوراً تعریف کے ڈونگرے نہ برسائے گئے تو میں اور بھی خوش ہوں گا۔ اسی لئے اسے شائع کر رہا ہوں"

اس صفحے پر اور کچھ نہیں ہے اور راشد صاحب کی تحریر نقل کرتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ راشد صاحب! عبداللہ حسین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

"IT WAS A GREAT [illegible]"

آغا عبدالحمید

راشد چند خط، چند یادیں

راشد سے میری ملاقات پہلی مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی۔ ادبی رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ دو ایک بار مشاعروں میں ان کی نظمیں سننے کا اتفاق ہوا تھا اور سرسری بات چیت بھی ہوئی تھی۔ جب وہ کالج کے میگزین "راوی" کے اردو حصہ کے ایڈیٹر بن گئے تو ملنا جلنا بڑھ گیا۔ اور واقفیت آہستہ آہستہ دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔

عینک لگاتے تھے جسم کسی قدر بھاری تھا اور نہایت سنجیدگی سے بات کرتے تھے۔ لباس کے معاملے میں کافی حد تک بے پروا۔ "رومانی دماغ" شاعر کا جو ایک افسانوی پیکر بناتے ہیں اس سے بہت مختلف تھے۔ اس لحاظ سے دیکھنے میں کافی "غیر شاعر" نظر آتے تھے۔ ایک ہندوستانی خاتون جن کے خاندان راشد کے ساتھ [illegible] لوگ کہتے ہیں کہ راشد بہت بڑا شاعر ہے۔ لیکن اس کو دیکھ کر تو یہ تسلیم کرنا مشکل ہے۔ بیگم صاحبہ اردو نہیں جانتی تھیں اور ان کے خیال میں شاعر کو نازک بدن، چھیلا اور رومانی ہیئت کا ہونا چاہئیے۔

میں کالج میں انگریزی آنرز کا طالب علم تھا اور انگریزی ادب میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس زمانے میں جو مصنف مشہور تھے مثلاً ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ، جیمز جائس، ہکسلے اور لارنس وغیرہ ان کی تصانیف سے واقفیت تھی۔ یہ راشد کے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھا وہ زیادہ تر فارسی اور اردو ادب کا مطالعہ کرتے تھے جو میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھا۔ مجھے جن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کو فارسی زبان پر اتنا عبور ہو جتنا راشد کو یا جس نے فارسی ادب کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا راشد کا تھا۔ ایران میں ان کی کامیابی اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

شاعری پر جب بات ہوتی تو اپنی شاعری سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ مروجہ شاعری

کی ہیئت شاعر کو جکڑ دیتی ہے اور خشک روایات اظہار کے راستے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق تھا۔ میری رائے میں دربار میں قصیدہ گوئی اور مشاعروں میں شعر خوانی مروجہ شاعری کو زندگی سے دُور لے گئی تھی۔ اس ایک شعر کو لیجئے ؂

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

جب یہ شعر ایک مشاعرہ میں پڑھا گیا تو اس کی بہت تعریف ہوئی کہ صاحب کیا مدرت اور انوکھا پن ہے۔ مروجہ شاعری کا مکمل انحطاط ان شاعروں کے کلام میں نظر آتا تھا جو مشاعروں کے لئے غزل لکھنے سے پہلے قافیہ ردیف چُن لیتے تھے۔ کمال ہے، جمال ہے، روال ہے وغیرہ اور پھر کھینچ تان کر ان پر شعر لکھ لیتے تھے۔

میں راشد کو مشورہ دیتا تھا کہ آپ ہیئت کو بدل ڈالئے اور ایک نئی روایت کی بنیاد رکھئے۔ اُن کا جواب تھا کہ محض ہیئت بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ بہت سے شاعروں نے آزاد نظمیں لکھی ہیں جن کی وقعت بہت زیادہ نہیں۔ اصل مسئلہ ہیئت اور اظہار کی ہم آہنگی کا ہے۔ میں نے انہیں نئی انگریزی شاعری کی مثالیں پیش کیں جن میں نئے تجربات کئے گئے تھے۔ انہوں نے یہ مثالیں بڑے انہماک سے پڑھیں اور انگریزی شاعری میں ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی۔

۱۹۳۲ء میں میرے والد ملتان تبدیل ہو گئے اور ۱۹۳۴ء کے آخر تک وہیں رہے۔ راشد کے والد پہلے ہی سے ملتان میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ ان کا گھر بھی ہمارے گھر سے ایک دو فرلانگ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں روزانہ ملاقات ہوتی اور رات گئے تک کسی نہ کسی موضوع پر بحث جاری رہتی۔ جب میں چھٹیاں گزرنے پر لاہور آگیا تو راشد کو شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ چنانچہ اپنے خط مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں۔

"مجھے سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی ہے کہ لاہور میں آپ سے ملاقات کے جو اکثر مواقع بہم آسکتے تھے ان سے محروم ہو گیا ہوں۔ ملتان کی شامیں جو ہماری آوارگی کے سبب اور کچھ پروفیسر آئن سٹائن کے "نظریۂ وقت و مقام" کی بنا پر راتوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں میرے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوں گی ـــــ میں نے عمر بھر ایسی دلچسپ ساعتیں کم گزاری ہیں"۔

چند دنوں کے بعد انہوں نے اسی موضوع پر ایک نظم لکھی بھیجی جو یہ ہے:

"باقیات"

"جملہ حقوق محفوظ!"

بہارِ عیش و مسرت نہ رہ سکی باقی — ہے اس کی یادِ غم افزا مگر ابھی باقی
نہ وہ بہار کی وہ محبوب صحبتیں ہی رہیں — نہ صبح و شام کی "آوارگی" رہی باقی!
رہی نہ راہ گزاروں پہ دلکشیِ خرام — رہی نہ روح میں ترغیبِ سیر ہی باقی!
نہ بحث میں "ادبِ نو" کا تذکرہ ہی رہا — نہ بحث ہی میں رہی کوئی دلکشی باقی!
معاشرت پہ نہ مذہب پہ اب ہیں تنقیدیں — نہ اب ہے ذوق و نشاطِ مصوری باقی!
ترے لئے تو ہیں سب بزم ہائے شعر و ادب — میرے لئے وہی تنہائی رہ گئی باقی!
ترے لئے تو ہیں "اثیر و تاج" و "پطرس" بھی — مرے لئے ہے مگر ایک مشہدی باقی!
ہے ایک شمعِ فسردہ سی رہ گئی گویا — فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی باقی!

ملتان۔ اکتوبر ۳۱، ۱۹۳۳ء — ن۔ م۔ راشد

ہیئت اور اظہار کی ہم آہنگی ایک مستقل موضوعِ بحث تھا۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے تین چار نظمیں لکھی تھیں جن کو راشد نے پسند کیا اور دو کو میرے احتجاج کے باوجود شائع کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ان میں ایک نظم میرے پاس ہے جس کو نقل کرتا ہوں۔ مجھے یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ میں شاعر ہوں۔ یہ نظمیں تو صرف ایک ادبی مشق کی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک نقطہ واضح کرنے کے لئے لکھی گئی تھیں۔

مجھے شاعری سے تعلق مری جان؟
مجھے ایسی وابستگی ہے کسی سے؟
یہ بہتان اغیار کی محفلوں سے اٹھا ہے
یہ پیدا ہوا نامرادی کی مٹی میں حسرت کے آبِ رواں سے
یہ سینچا گیا زندگانی کی ناکامرانی کے خونِ جگر سے
یہ اخلاق کی سرد مہری کے باعث
بکھرتا ہے مسموم ساکت ہوا میں
تو حسرت کی دنیا کے کل نیک بندے

دکھائے ہوئے اپنے سینوں سے روحوں کی پژمردگی کو
خلا کو
سنبھالے ہوئے اپنی ویران دنیا کی باگیں
ہیں مشکور اللہ کے رحم و کرم کے
کہ بیٹا مرا میرا شوہر مرا باپ بھائی
شرابی نہیں ہے۔
کسی زندہ عورت کا عاشق نہیں ہے
وہ شاعر نہیں ہے

مجھے شاعری سے تعلق مری جان
یہی بس کہ خواہش کے مرنے سے پہلے
تمنا کی دنیا اجڑنے سے پہلے
ترے میٹھے ہونٹوں کو اک بار پھر یاد کر لوں
انہیں کا کوئی گیت گا لوں کہ جس سے
مہک جائے شاداب ہو جائے دنیا

مجھے ایسی وابستگی مے کشی سے
یہی بس کہ تلخی سے مے کی حقیقت کی تلخی مٹا لوں
یہ آدم کے بیٹوں کی بیکار باہم
ذرا بھر کو تسکین کا روپ بھر لے

اگست سنہ ۱۹۳۴ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ ایک شام ہیئت اور اظہار کی ہم آہنگی پر بات ہوتی رہی میں گھر واپس آنے کے لئے اٹھا تو راشد کہنے لگے کہ بات مکمل نہیں ہوئی۔ میں نے مذاق سے کہا کہ ایک لحاظ سے تو بات کبھی مکمل نہیں ہوگی۔ یہاں سوال شعر لکھنے کا ہے اب آپ بیٹھ کر شعر لکھئے۔

دوسرے دن راشد ملے کہنے لگے میرا خیال ہے کہ میں ہیئت اور اظہار کی ہم آہنگی کے مسئلہ کو حل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا ہوں نظم سنو۔ انہوں نے نظم سنائی۔ میں نے جی بھر کر داد دی اور کہا کہ ایک حد تک نہیں آپ پوری طرح کامیاب ہیں۔ یہ نظم "اتفاقات" تھی۔

اب جب کہ راشد کو ایک بڑا شاعر تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ شروع میں ان کی شاعری کی کس قدر مخالفت کی گئی تھی۔ مقبول حسن خاں لکھتے ہیں۔

"اگر آج وہ (راشد) ہمارے سب سے اہم شاعر بن گئے ہیں تو نتیجہ ہے ان کی ان دقیق کوششوں کا جس کے ذریعے انہوں نے ہم عصر فکری اور تہذیبی شعور کو فن کے مخصوص اور متوازی دائرۂ عمل میں داخل کیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"راشد کی اس نمائندہ حیثیت کی بنیاد آج سے تقریباً تیس سال پیشتر "ماورا" کے تجرباتی انداز اظہار کی صورت میں رکھی گئی تھیں۔ آج بدلے ہوئے ادبی ماحول میں وہ بحثیں جن کا آغاز راشد اور میراجی کی شاعری کے ردِ عمل کے طور پر ہوا تھا بے مقصد اور غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ کل جس کو تجربہ سمجھا جاتا تھا آج وہی مقبول عام روایات کا جزو بن چکی ہے۔"

ان کے ملنے والوں میں سے صرف بخاری صاحب ان کی شاعری کے مداح تھے۔ سالک صاحب نے کبھی اعلانیہ مخالفت تو نہ کی لیکن کہتے تھے کہ نوجوان ہے تجربے کے بعد راہ راست پر آ جائے گا۔ چراغ حسن حسرت بہت زور سے تنقید کرتے تھے کہ کیا خرافات لکھنا شروع کیا ہے

حسرت صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کلکتے میں مولانا آزاد کے الہلال میں کام کر چکے تھے۔ روائتی شاعری کے قائل اور پرانی طرز کی بہت اچھی غزلیں کہتے تھے۔ پرانی روایات سے انحراف ان کے نزدیک اگر گناہ کبیرہ نہیں تو صغیرہ تو ضرور تھا۔ راشد ان کے علم سے بہت متاثر تھے۔ حسرت صاحب راشد کو نئی طرز کی شاعری کرنے سے تو نہ روک سکے لیکن ان کی نظموں میں بہت سی لفظی تبدیلیاں کرانے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ میری رائے میں ان تبدیلیوں سے نظموں کی اہمیت کم ہو گئی۔ بعد میں راشد نے مجھ سے اتفاق کیا کہ انہیں یہ تبدیلیاں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ "اتفاقات" کے پہلے بند کے چند مصرعے پہلی دفعہ یوں لکھے گئے۔

اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
خوفِ موہوم تری روح پہ کیا طاری ہے
چھوڑ دے وہم کے جال
بھول جا اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال

جب یہ نظم "نیا دور" میں شائع ہوئی تو چند لفظ بدل دیئے گئے۔

اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
توڑ دے وہم کے جال
چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال
خوفِ موہوم تری روح پہ کیا طاری ہے۔

وہم کا تعلق کسی بظاہر تو کسی بیرونی واقعہ سے ہوتا ہے لیکن دراصل یہ انسان کی خود پیدا کردہ چیز ہے اس لئے یہ کہنا کہ چھوڑ دے وہم کے جال زیادہ مناسب ہے۔ چھوڑنے کے لفظ سے وہم کی طرف اشارہ ہے۔ توڑنے کے لفظ سے جال کی طرف۔ اعتراض غالباً یہ تھا کہ جال توڑنا تو ایک بات ہے لیکن جال چھوڑنا کیا معنی۔ چھوڑ دے وہم کے جال میں جو خوبصورتی ہے وہ ایک لفظ بدلنے سے جاتی رہی۔ اسی طرح "بھول جا اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال" "چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال" سے بہتر ہے۔ جنوں خیز حسیں رات کے ساعت وزدیدہ میں "بھول جا" "چھوڑ دے" سے زیادہ مناسب ہے۔

راشد کی تقریباً تمام نظمیں ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہیں۔ وہ جب نئی نظم لکھتے تو مجھے بھیجتے اور ساتھ اصرار کرتے کہ اپنی رائے لکھو۔ جب ان سے ملاقات ہوتی تو بھی یہی اصرار ہوتا کہ میری نظموں پر کچھ لکھو۔ چنانچہ ۱۱ جون ۱۹۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"نظموں کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھو کیوں کہ تمہارے خیالات اکثر رہنما ثابت ہوتے ہیں۔ یعنی مزید "بے راہ روی" کے لئے مشعلِ ہدایت بنتے ہیں۔ اب تک جو شعر لکھتا چلا جا رہا ہوں تو اس میں ابتداً اور بعض مرحوم دوستوں کا بڑا ہاتھ بلکہ قصور ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں اور ہماری زبان میں شعر کہنا اور یہ سوچ کر کہنا کہ "کام کا شعر" قلم سے نکلے دل گردے کا کام ہے"۔

اس سے پہلے ۲۰ جولائی ۱۹۴۱ء کے خط میں (جو انگریزی میں ہے) لکھتے ہیں۔

"امید ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے اور ماورا پر تبصرہ لکھو گے۔ میں تمہیں تکلیف نہ دیتا کیوں کہ تم بہت مصروف ہو اور ویسے بھی یہ مناسب نہیں کہ لوگوں سے کہا جائے کہ اپنا تبصرہ (APPRECIATION) لکھیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں اس گہری دلچسپی کی قیمت ادا کرنی چاہیے جو تم میری یاوہ گوئی میں لیتے رہے ہو۔ میں تو باقاعدہ شعر کہنا بند کر دیتا اگر تمہاری مستقل تنقید مجھے تقویت نہ دیتی کہ میں اپنے مقصد کے حصول پر قائم رہوں۔ یہ [illegible] نہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں بہت حد تک اس پر آمادہ تھا کہ میں اپنی پہلی کتاب تمہارے نام سے منسوب کرتا لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ اس میں بعض ایسی نظمیں ہیں جن سے بحیثیت سرکاری ملازم کے شاید تم رفاقت پسند نہ کرو۔"

میں اپنے خطوں میں کبھی مختصر کبھی تفصیل سے راشد کی نظموں پر اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس مضمون کے علاوہ میں نے کوئی چیز شائع نہیں کی۔ اس لئے کہ جب ایک رائے شائع ہو جاتی ہے تو غیر شعوری طور پر رائے کا مصنف کسی حد تک اس کا پابند ہو جاتا ہے۔ اور انسانی کمزوری کی وجہ سے بعض اوقات ہٹ دھرم بھی ہو جاتا ہے۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ راشد کی نظم پڑھ کر میں نے اس پر اعتراضات کئے لیکن نظم کو دوبارہ سہ بارہ پڑھنے کے بعد لکھ بھیجا کہ میری پہلی رائے غلط تھی اور نظم کو اب سمجھا ہوں۔ مجھے اس کا شدید احساس تھا کہ راشد کی شاعری میں ایک مسلسل ارتقا ہے اور وہ میری رائے کو اہمیت بھی دیتے تھے اس لئے میں رائے ان تک پہنچا دیتا تھا لیکن شائع نہیں کرتا تھا۔

۱۷ مارچ ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے سب سے زیادہ غرض اپنے بعض افکار کے اظہار سے ہمیشہ رہی ہے اور ان کی رسالت (COMMUNICATION) کو میں نے اہم مانا ہے۔ میرے نزدیک شاعری محض اصوات یا الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ دوسروں کے افکار میں ہیجان پیدا کرنے کا نثر سے مؤثر تر ذریعہ ہے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ افکار جن کے اظہار سے راشد کو اتنی غرض تھی کیا تھے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کو ایک شدید احساس تھا کہ ہم لوگ بوسیدہ روایات اور عافیت کوشی کے خواب آلود اثرات سے زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکے ہیں۔ اور ایک نہایت بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ اس نیند سے بیدار ہو کر اپنا رشتہ زندگی سے جوڑو۔ ڈرو اس وقت سے جو وقت ہے آنے والا۔

اس موضوع پر وارث علی علوی صاحب نے اپنے مضمون "حرف و معنی کے آہنگ کی تلاش" میں کس قدر وضاحت سے لکھا ہے۔ یہ مضمون راشد پر نہایت پُر معنی تنقید ہے اور اس قابل ہے کہ اس کو غور سے پڑھا جائے ــــ میں اس سے دو ایک اقتباسات درج کرتا ہوں۔

"یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ ہم اب بھی سمجھتے ہیں کہ عشق و محبت، شجاعت اور سخاوت رحم و کرم دریا دلی اور وسیع المشربی، دنیا کو جیتنے اور دنیا کو ٹھکرا دینے کے وہ حوصلے اور جذبات جنہوں نے انسانی تاریخ کے متمدن معاشروں میں رزم و بزم کی دنیاؤں کو سجایا تھا ہمارے دل اب بھی انہی جذبات کا مخزن ہیں۔ ہمارا بورژوا تمدن ہماری تجارتی تہذیب ہمارے متوسط طبقے کے بزدلانہ مفاہمہ اخلاق نہ انطونی پیدا کرسکتے ہیں نہ قلوپطرہ۔ یہ صرف جیب کترے پیدا کرسکتے ہیں۔

..... آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعر بھی آنے والے دنوں کی وحشت سے کانپتا ہے لیکن یہ خوف راہ لوگراؤں اور صوفیوں کا خوف نہیں بلکہ سیاست ٹکنولوجی اور ماس میڈیا کے پیدا کردہ ان نیم ہوش مندوں کا خوف ہے جن کے اعصاب کی ہر لرزش کو ہوش مند مطلق العنان آمر کنٹرول کرتے ہیں.....

یہی بندگان زمانہ اور بندگان درم جن کا زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں رہا وہ منفی انسان ہیں جن سے ہمارا اسلاح کھرا پڑا ہے...... یہ بے روح انسان محض پرچھائیاں ہیں اور اور پرچھائیوں کے لئے حرف و معنی کا ربط کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔"

اور ان سب کے پیچھے درم و جاہ کی ہوس کارفرما ہے اور ہوس کیا ہے۔ راشد کے الفاظ میں بوئے گل بے بو۔

شکست مینا و جام برحق
شکست رنگ عذار محبوب بھی گوارا
مگر ـــ یہاں تو کھنڈر دلوں کے
(ـــ یہ نوع انساں کی
کہکشاں سے بلند و برتر طلب کے اجڑے ہوئے مدائن ـــ)

شکستِ حرف، معنی کے نوحہ گر ہیں

" نمرود کی خدائی "

یہ بے یقینی کے آئندہ ہونے والے مظاہروں کا خوف ایران میں اجنبی کی نظموں میں ملتا ہے۔

مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے

جو لے گیا ایک پل میں

ہزاروں کو غارِ فراموشش گاری

میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے

کہ صدیاں گزرنے پہ ان کی

سیاہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی

" آواز "

یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے اور جن کا تعارف راشد یوں کراتے ہیں۔

اجل، ان سے مل،

کہ یہ سادہ دل

نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،

نہ اہلِ ادب اور اہلِ حساب،

نہ اہلِ کتاب

نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین

نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین

فقط بے یقین

" تعارف "

اس بے یقینی کی اور زندگی سے رشتہ توڑنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

مگر آج شہر خموش ہے۔

کوئی شہر ہے؟

کسی ریگ زار سے جیسے اپنا وصال ہو!
نہ صدائے سگ ہے، نہ پائے دزد کی چاپ ہے
نہ عصائے ہمت پاسباں
نہ اذانِ فجر سنائی دے
[اے تمام لوگو کہ میں جنہیں
کبھی جانتا تھا کہاں ہو تم؟
تمہیں رات سونگھ گئی ہے کیا؟
کہ ہو دُور قیدِ غنیم میں؟
— جو نہیں ہیں قیدِ غنیم میں
وہ پکار دیں]
"شہر میں صبح"
لیکن کوئی پکارنے والا نہیں کیوں کہ سب کے سب قیدِ غنیم میں ہیں۔
مجھے سنگ وحشت بتا رہے ہیں کہ کیا ہوا
مجھے گرد و خاک سنا رہے ہیں وہ داستاں
جو زوالِ جاں کا فسانہ ہے
ابھی بوئے خوں ہے نسیم میں!
تمہیں آن بھر میں خدا کی چیخ نے آ لیا
— وہ خدا کی چیخ کہ ہر صدا سے ہے زندہ تر! —

. . . .

میں پہنچ گیا ہوں تمہارے بسترِ خواب تک
کہ یہیں سے گمشدہ راستوں کے نشاں ملے
— یہ قدیم وحشی پابرہنہ کے نقشِ پا،
اسی راہزن کے یہ نقشِ پا،

تمہیں ساتھ کھینچ کے لے گیا تھا جو نیند میں
یہ کھینچ رہے ہیں سلاسلِ شب مار تک
جہاں بیرہ زال جھنکارتی شب و روز ہے
اسی غار تک!

"شہر میں صبح"

لیکن راشد یاس اور ناامیدی کا شاعر نہیں ہے اس کا تمام زور اس بات پر ہے کہ کچھ بھی ہو زندگی کو مثبت رویے سے قبول کرنا چاہیئے۔

ابھی زندہ میں بھی ہوں
اور لوگ بھی زندہ ہیں
ابھی استوار ہے حق مرا
لب مدعا ابھی وا بھی ہے
ابھی ان خرابوں پہ ایک لمحہ خلا میں ہے
کہ اڑا نہیں
کہو بیرہ زال سے
ہم نہیں ہیں وہ قوم جو
کبھی جاں نثاروں کو
اہلِ درد کو بھول جاتے

"شہر میں صبح"

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ راشد کو شدت سے احساس تھا کہ ہمیں زندگی سے باعمل رشتہ قائم کرنا چاہیئے اسی جذبے کے ماتحت وہ خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے اور ملتان کے سالار بن گئے۔ ۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

" اب تو بار بار اپنی گزشتہ نظموں کی یادہ گوئی کی تہہ کو پہنچ کر ان سے کراہت محسوس کرنے لگتا ہوں۔

شاید تم خفا ہو جاؤ اور شاید یہ آداب کے خلاف ہو لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان اور بالخصوص ہندی مسلمان کے "زندہ" ہونے کا نسخہ ایک ہی ہے، خاکسار تحریک! اگر اس نسخے کو ہم نے استعمال نہ کیا تو ابدی ہلاکت میں بہت کم مدت باقی ہے۔ خدارا دفتر "الاصلاح" اچھرہ لاہور سے کچھ کتابیں منگوا کر پڑھو۔ تم اسے "صرف مذہب" نہیں پاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ کیا ہونے والا ہے۔ صرف آئندہ پانچ سال کے عرصے میں!"

یہ پیشین گوئی کہ آئندہ پانچ سالوں میں بہت کچھ ہونے والا ہے بالکل درست تھی۔ ایک سال بعد یعنی ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس نے ہر اعتبار سے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ آنے والے خطرات سے مقابلہ کرنے کے لئے عمل کیا جائے یا نہ بلکہ سوال یہ تھا کہ کیا خاکسار تحریک میں ایسی صلاحیت تھی کہ وہ مستقبل کے لئے کوئی قابلِ عمل اور سود مند نظام پیدا کر سکے۔

راشد جلد ہی یہ جان گئے کہ خاکسار تحریک کا نظام صرف ایک آمر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ عوام کا زندگی سے ناتہ نہیں جوڑ سکتا۔

ان حالات میں یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ راشد پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ فرار کا شاعر ہے۔ اس الزام کے ثبوت میں ان کی نظم رقص پیش کی جاتی ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر یہ دیکھا جائے کہ نظم لکھتے وقت ان کے تاثرات کیا تھے۔ یکم اپریل ۱۹۴۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"اس خط کا جواز ان باتوں میں کوئی نہیں بلکہ ایک نظم ہے "رقص" جو کل ہی لکھی ہے جس کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ PRIMITIUE MAN یعنی عہد پارینہ کے انسان کے مقابلے میں ہم مہذب اور طباع شہری جن کے قویٰ آج فطرت کے ساتھ جنگ جوئی کے قابل نہیں رہے کس انداز سے کس وجہ سے اور کیوں کر فن میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم عورت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں جو تمام فنون کی تمثیل ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی تلخیوں، زندگی کی کراہتوں کو ہم برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ زندگی پر جھپٹ نہیں سکتے۔ فن اور فنون کے مجموعے عورت سے لپٹ سکتے ہیں۔ صرف لپٹ کر اپنی انتہائی آرزوؤں کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ یہ نظم تمہیں سنانے کی آرزو اور سنا نہ سکنے کی حسرت میں بھیج رہا ہوں۔"

راشد پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کے فکر، ان کی نفسیاتی کیفیتوں، ان کے سیاسی اور سماجی [illegible] ان کی شاعری کے فنی پہلوؤں پر

بہت کم لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فن پارہ خواہ وہ نظم ہو یا افسانہ یا ناول ایک منظم کلیت ہوتا ہے اس کے کسی پہلو کو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن تجزیے کے لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ فنی پہلوؤں سے میری مراد ہیئت کی تشکیل، زبان کا استعمال، تراکیب کی وضع، غنائیت، اظہار میں کفایت وغیرہ ہیں۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے راشد پر الزام لگایا گیا ہے کہ ان کی شاعری مبہم ہے اور وہ مشکل پسند ہیں محض نامانوس اور مشکل الفاظ استعمال کرنے سے شاعری مشکل یا مبہم نہیں ہو جاتی کیوں کہ الفاظ کے معنی تو لغت میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک عام قاری چاہتا ہے کہ شاعری زود فہم ہو اور سطحی جذبات کو فوری طور پر ہیجان میں لے آئے لیکن راشد کی شاعری میں مختلف اجزا کا جو امتزاج ہے وہ فکری اور جذباتی رجحانات کا تصادم، ردعمل اور ہم آہنگی کا ایک مسلسل اور متحرک عمل ہے جس کو سمجھنے اور جذب کرنے کے لئے حس کوشش اور محنت کی ضرورت ہے عام قاری اسے کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہر بڑا شاعر الفاظ کے صحیح اور سیاق کے اعتبار سے مناسب استعمال سے ان میں ایک نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ نئی تراکیب وضع کرتا ہے۔ اقبال کے بعد کسی شاعر نے زبان میں اتنی وسعت پیدا نہیں کی جتنی راشد نے۔ ان کی کم نظمیں ایسی ہوں گی جن میں الفاظ بدلے جا سکیں۔ عافیت کوشی ایک پرانی ترکیب ہے لیکن "عافیت کوشی آبا کے طفیل" میں استعمال ہونے سے اس کے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ چند مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی

کاروان ہائے تمنا کی گزرگاہ نہیں

کہ غمِ عشق چراغِ تہِ داماں ہو جائے

جسم کی مزدِ شبانہ دے کر

اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے

اسے بھی تو ذلت کی پائندگی کے لئے آلۂ کار بننا پڑے گا

اسی طرح راشد نے تشبیہ اور استعارے کے مفہوم میں بھی اضافہ کیا ہے۔

کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعتاً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں

"داشتہ"

شکستِ مینا و جام برحق
شکستِ رنگِ عذارِ محبوب بھی گوارا
مگر ــــ یہاں تو کھنڈر دلوں کے
اور ــــ یہ نوعِ انساں کی
کہکشاں سے بلند تر و برتر طلب کے اجڑے ہوئے مدائن!
شکستِ آہنگِ حرف و معنی کے نوحہ گر ہیں

"نمرود کی خدائی"

کہ جس سے میرے جسم و جان ابر و مہتاب کا
رہ گزر بن گئے تھے

"حسن کوزہ گر"

ستاروں کے خوشوں کی آواز دیکھی
بنفشے کے رنگوں کو تو نے چکھا
اور بہشتی پرندوں کے نغموں کو چھوتی رہی

"مہمان"

جو صدیوں سے بھرپور صدیوں کی
پہنائی بننے چلے جا رہے تھے

"مہمان"

وہ شبنم کا قطرہ
جو صحرا میں نازل ہو لیکن
سمندر سے ملنے کا رویا لئے ہو

"مہمان"

اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ راشد کی شاعری سے تفصیل سے بحث کی جائے۔ میں صرف ان کی تین نظموں کے بارے میں مختصراً کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی نظم "شبابِ گریزاں" کا ایک ایسے نفسیاتی تجربے

سے تعلق ہے جو ہر ایک کو کسی نہ کسی شکل میں پیش آتا ہے۔ دوسری نظم "سبا ویراں" میں زوال اور انحطاط کے المیہ کو ساکت اور جامد تمثال اور تصاویر کی پے در پے آمد سے بہت موثر بنا دیا گیا ہے۔ "شہرِ بے سپہر" میں اسی المیہ کا ذکر ہے جو راشد کی فکر میں بہت اہم درجہ رکھتا ہے۔

جوانی کا زوال ہر انسان کے لئے پر افسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف قانونِ قدرت کا احساس کہ جوانی واپس نہیں آسکتی، دوسری طرف شباب سے وابستہ خوشگوار یکسر رقت انگیز یادیں دل میں ہلچل پیدا کرتی ہیں۔ اگرچہ ہر ایک جوانی کی واپسی یا "شباب گریزاں کو جاتے ہوئے روکنے" کی کوشش نہیں کرتا لیکن یہ خواہش ہر ایک کے سینے میں کبھی نہ کبھی سر اٹھاتی ہے کہ کاش وہ دن واپس آجائیں جو واپس نہیں آسکتے۔ نظم اسی احساس سے شروع ہوتی ہے۔ "مے تازہ و ناب حاصل نہیں ہے تو کیوں کر دُردِ تہِ جام پی کر گزارا" اس کلی کا طعنہ بھی سچا ہے۔ دھندلائی ہوئی تصویریں نئے رنگ میں بھر سکتا ہے۔ نظم کا دوسرا بند جو طعنے کا جواب یا "اک کوششِ ناتواں" کا جواز ہے سحر انگیز خوبی کا حامل ہے۔

ترے آسمان کا
میں اک تازہ وارد ستارا سہی
جانتا ہوں کہ اس آسمان پر
بہت چاند سورج ستارے ابھر کر
جو اک بار ڈوبے تو ابھرے نہیں ہیں
فراموش کاری کے نیلے افق سے

یہاں ارکان کے توازن، قدرتی مد و جزر اور شدتِ احساس کے اظہار سے مرئی اور ظاہر نقوش ابھرتے ہیں اور ایک دوسرے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں جن سے ہنگامہ خیز اور لرزاں متحرک تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں جو قاری کی لذت اندوزی کا اصلی باعث ہیں۔

آگے بڑھنے کے باوجود یہ ہوس نہیں کہ ہزاروں برس بعد کی داستانوں میں اس کے عشق کا ذکر ہو۔ یہ کوشش صرف ایک بہانہ اور ایک پل کا سہارا ہے۔ نظم اسی طرح ختم ہوتی ہے جیسے شروع ہوئی یعنی "کروں گا دردِ تہِ جام پی کر گزارہ"۔ اس نظم میں "آواز" کی طرح شدت کی آمد ہے اور ہر لفظ اپنی جگہ مناسب اور موزوں ہے۔

سبا ویراں راشد کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اس میں زوال اور انحطاط کا جو المیہ ہے وہ غالب کی

غزل "اے تازہ وارداںِ بساطِ ہوائے دل" کی یاد دلاتا ہے۔ نظم کی ہر تصویر ساکت اور جامد ہے۔ حرکت جو زندگی کی نشانی ہے بالکل مفقود ہے۔ سلیمان سر بزانو اور سبا ویران۔ جہاں ان چیزوں سے خالی ہے جو نشاط اور فرحت کا باعث ہوتی ہیں یعنی سبزہ اور پھول۔ ہوائیں پانی کی پیاسی ہیں اور ریگزاروں نے اپنے سر پروں کے نیچے چھپائے ہوئے ہیں۔ ایسے میں جو چیزیں پہلے قابلِ حصول معلوم ہوتی تھیں اور جن کے لئے اتنی کاوش کی گئی تھی اب بیکار نظر آتی ہیں۔ جہانگیری اور جہانبانی ہرن کی چھلانگ سے زیادہ نہیں۔ محبت صرف ایک بھڑک کر ختم ہونے والا شعلہ اور ہوس بوئے گلِ بے بو۔ کہیں سے قاصد فرخندہ پے آنے کی امید نہیں اور نہ کاسۂ پیری میں مے آسکتی ہے۔ نظم کے آخر تک سب تصاویر منجمد اور ساکن ہیں جو فنا کا پیش خیمہ ہیں۔ انحطاط کے لمحات سے ایک فرد کو ایک قبیلے کو ایک قوم کو بلکہ ایک پوری تمدن کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک فرد کے لئے صرف وقت ہی "غارت گر" ہو سکتا ہے۔ قوموں کے لئے دوسری قومیں۔ تمدن کے لئے ایک نوخیز تمدن۔

"شہر میں صبح" کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

راشد نے لکھا:

"فیض نے اپنی شاعری میں اپنے علم اور اپنی ذہانت کا چنداں ثبوت نہیں دیا حالانکہ ان دونوں میدانوں میں وہ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ عیش اندیش شاعروں میں ہے اور شاعری میں محض لذت دیرپا نہیں ہوتی، محض احساسات کے بل بوتے پر شعر کہنا میرے نزدیک اپنی ذات کی نفی ہے۔ شاعر جب تک اپنے ذہن کی تمام قوتوں سے کام نہ لے اور یہ قوتیں جو حواسِ خمسہ کے علاوہ اور ان سے آگے ہیں وہ اپنا فریضہ ادا نہیں کر سکتے"۔ خط بنام آغا عبدالحمید

غلام عباس

راشد: چند یادیں

۱۹۳۲ء کے اواخر میں جب میں لاہور کے مشہور نشری ادارے 'دارالاشاعت پنجاب' سے منسلک ہوا تو اس وقت میری عمر اٹھارہ اُنیس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس ادارے کے ایک اہم رُکن سید امتیاز علی تاج تھے جن کا شمار مُلک کے ممتاز اُدبا میں ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر تھی، انھوں نے ڈراما "انارکلی" لکھا تھا جس کی شہرت اُس کی اشاعت سے قبل ہی دُور دُور پھیل گئی تھی اور لوگ اس ڈرامے کے اقتباسات اُن کی زبان سے سُننے کے بڑے مشتاق رہا کرتے تھے۔

تاج صاحب کے احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ مگر ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر سید احمد شاہ بخاری 'پطرس' تھے۔ جو اُن کے کالج کے زمانے کے رفیق اور دوست تھے۔ ایک زمانے میں ان کی جوڑی کو خاصی شہرت حاصل رہی کیونکہ وہ لاہور کی علمی و ادبی مجالس اور میلوں ٹھیلوں میں ہمیشہ ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔

ایک دن بخاری صاحب تاج صاحب سے ملنے آئے تو وہ بڑے جوش میں تھے۔ کہنے لگے۔ امتیاز! آج میں نے ایک اردو رسالے میں ایک نظم پڑھی ہے جسے بلاشبہ اس صدی کی نظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اتفاقات" اس کا خالق ن۔م۔ راشد ہے جو ہمارے گورنمنٹ کالج ہی کا فارغ التحصیل ہے۔

پھر بخاری صاحب نے بتایا کہ وہ راشد سے ملنے اور اِس نظم کی داد دینے اُن کے مکان پر گئے تھے۔ اُس وقت راشد بڑی تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے، اُن کا رہن سہن کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ کرسی تلاش کرنے لگے جو موجود نہ تھی۔ بخاری صاحب نے کہا۔ رہنے دو۔ فرش پر جو کتابیں پڑی ہیں میں اُن کو جمع کر کے ان پر بیٹھ جاؤں گا۔ پھر وہ دیر تک راشد سے اُس کی نظم پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔

میں نے راشد کو کئی بار مشاعروں میں شعر پڑھتے سُنا تھا، لیکن ان سے شناسائی اُس وقت ہوئی جب

مولانا چراغ حسن حسرت بھی دار الاشاعت پنجاب کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ حسرت صاحب پیشے کے لحاظ سے تو صحافی مگر ادب کا بڑا ارفع مذاق رکھتے تھے۔ ان کی علمی استعداد کا کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر استادانہ مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے گرد اُس وقت کے ابھرتے ہوئے اُدبا و شعرا اور ادب کے طالب علموں کا خاصا مجمع لگا رہتا تھا ان میں اکثر راشد اور میراجی بھی ہوتے تھے۔ حسرت صاحب کو جدید شاعری قطعاً ناپسند تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آزاد شاعری جب قافیہ اور ردیف سے آزاد ہے تو اس میں تعقید لفظی اور اسی قسم کے دوسرے عیوب نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر نئی نظم میں "میں نہیں سکتا بتا" جیسا ٹکڑا ہو تو وہ سخت ناگوار گزرتا ہے۔ نثر ہو تو صاف اور رواں۔

حسرت صاحب کی وسیع القلبی دیکھئے کہ جب میراجی نے اپنی بے قافیہ نظموں کی کاپی حسرت صاحب کو بغرض اصلاح پیش کی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ اور کئی دن تک اُس پر بڑی محنت صرف کرتے رہے۔ اس کے کئی سال بعد دلی میں جب راشد نے اپنی نظموں کے پہلے مجموعے "ماورا" کا مسودہ حسرت صاحب کو اصلاح کے لئے دیا اُنھوں نے اس پر بھی غائر نظر ڈالی۔ اور اُس کے زبان کے بعض اسقام کو دُور کیا۔ راشد نے "ماورا" کے دیباچے میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

راشد نے ایام جوانی ہی میں خود کو خاکسار تحریک سے وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کئی سال تک اس کے سرگرم رُکن بنے رہے۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے انہیں دعوت دی گئی کہ وہ خاکسار تحریک کے بارے میں کالج کی ایک تقریب میں مقالہ پڑھیں۔ اور کالج کے طلبا کو اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کریں۔ راشد نے کہا۔ میں اس تقریب میں شامل ہونے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے خاکساروں کی وردی پہن کر آنے اور ہاتھ میں بیلچہ اٹھانے کی اجازت ہو۔

کالج والوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ راشد اپنی شرائط کے مطابق خاکساروں کی وردی پہن کر اور کندھے پر بیلچہ اٹھا کر کالج گئے۔ اور خاکسار تحریک پر ایک نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات مقالہ پڑھا۔

۱۹۳۷ء میں مجھے "پھول" اخبار کی ایڈیٹری چھوڑ کر دلی جانا پڑا جہاں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے کی ایڈیٹری مجھے سونپ دی گئی۔ اس کے کچھ دن بعد پروفیسر احمد شاہ بخاری نے جو آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے، مجھ سے کہا۔ کہ راشد ریڈیو میں ملازم ہو گیا ہے۔ فی الحال لاہور میں ہے لیکن عنقریب اُسے دلی بلوا لیا جائے گا

اور خبروں کے ترجمے کے کام پر لگا دیا جائے گا۔ تم ذرا اُس کی دلجوئی کرتے رہنا۔

چنانچہ چند روز بعد راشد دلّی آ گئے۔ اور شام کی خبروں کے بلیٹن کے مترجم بن گئے۔ میں نے خبروں کے بعد ان کے دفتر میں جا کر ان سے ملاقات کی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ تنہا آیا ہوں۔ اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔

اتفاق سے اُن دنوں میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا کیونکہ بیوی طویل علالت کی وجہ سے ہسپتال میں تھی۔ اور والدہ نے بھی اُس کی تیمار داری کے لئے ہسپتال ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔ تم میرے ہاں کیوں نہیں آ رہتے۔ راشد مان گئے۔ اور تقریباً ایک ماہ میرے پاس ہی رہے۔ اور یوں ہماری شناسائی نے رفتہ رفتہ ایک گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی۔

ہم دن رات ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ دُنیا جہان کی باتیں کرتے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر ادب ہوتا۔ میری طرح اُنہیں بھی روسی لٹریچر سے بڑی دلبستگی تھی۔ میں نے دستوئفسکی، ٹالسٹائی، گورکی اور چیکوف کے کے افسانے ترجمہ کئے تھے۔ اُنہوں نے الیگزینڈر کیرن کے ناول " YAMA THE PIT " کو اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ ایک بڑا طویل ناول تھا جس کا ترجمہ اُنہوں نے بڑی عرق ریزی سے کیا تھا۔ مگر ظالم ناشر نے نہ تو ترجمے کا کوئی معاوضہ دیا تھا اور نہ کتاب پر بہ حیثیت مترجم ان کا نام ہی درج کیا تھا، اس پر اُدرستم یہ کہ رسالوں اور اخباروں میں اس کتاب کے جو اشتہار چھپتے تھے اُن میں ان کا نام بڑے جلی حروف میں چھپوایا جاتا تھا۔

کبھی کبھی موضوع سخن ان کی شاعری اور میری افسانہ نویسی بھی ہوتا تھا۔ ان کی جو نظمیں میری سمجھ میں نہ آتیں وہ اُن کا ایک ایک نکتہ مجھے اِس طرح سمجھاتے جس طرح کوئی بچے کو سمجھاتا ہے۔ اور اس طرح میں ان کی نظموں کے مفہوم اور ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہو کر اُن سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے لگا۔

وہ میرے مختصر ناول "جزیرۂ سخنوراں" کے بڑے مداح تھے۔ اور ہر چند میں نے ایک معصوم سی شرارت کے تحت اس ناول میں ان کا کردار ایک باغی شاعر کے طور پر استعمال کر کے اُسے سخن ناشناسوں کے ہاتھوں پٹوا بھی دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کی ستائش میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کے کئی سال بعد بھی اُنہوں نے ریڈیو پاکستان سے "میری پسندیدہ کتاب" کے عنوان سے "جزیرۂ سخنوراں" کے بارے میں ایک طویل انٹرویو براڈ کاسٹ کیا گیا تھا۔

راشد تنقید کی بھی بے پایاں صلاحیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے یورپ کے اعلیٰ پایہ کے نقادوں کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے "اردو ادب پر غالب کا اثر"۔ "ظفر علی خاں کی شاعری"۔ "انار کلی"۔ "اختر شیرانی

کے ساتھ لمحے" کے عنوانوں سے جو مقالات لکھے تھے اُن میں تنقید کا بہت اونچا معیار پیش کیا گیا تھا۔

آل انڈیا ریڈیو میں راشد کا تبادلہ جلد ہی خبروں کے محکمے سے تقریروں کے محکمے میں ہو گیا۔ اب وہ تقریروں کے نئے نئے سلسلے سوچنے لگے۔ یہ کام ان کی دلچسپی کے عین مطابق تھا، بڑی محنت کرتے اور سرگرم رہتے۔ جب وہ مقررین کی جستجو میں نکلتے تو رہنمائی کے لئے اکثر مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ کبھی تو گوہر مقصود جلد ہی مل جاتا اور کبھی اُس کی تلاش میں پہروں دلّی کے کونوں کھدروں کی خاک چھاننی پڑتی۔ ہمارے لئے یہ امر باعث طمانیت ہوتا تھا کہ ہم نے اس تقریب کی بدولت دلّی کے بزرگ شعراء کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین (بھارت کے سابق صدر) شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن، مرزا محمد سعید دہلوی، مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، خواجہ حسن نظامی جیسے ذی علم اور برگزیدہ حضرات سے شرف نیاز حاصل کر لیا۔

اس زمانے میں خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے ایک پروگرام بنایا کہ قرول باغ دلّی میں خاکساروں کا ایک بڑا اجتماع ہو جس میں ایک لاکھ سے زیادہ خاکسار شرکت کریں۔ راشد اس تحریک کے رکن ہی نہیں بلکہ ملتان کے ضلع کے سالار بھی تھے۔ بڑی پریڈیں کرتے اور سالاری کے فرائض محنت سے انجام دیتے تھے۔ قواعد کے اتنے پابند تھے کہ ایک مرتبہ جب ان سے کوئی بے ضابطگی ہوئی تو انہوں نے سربازار اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا کر کوڑے کھائے۔ بڑے فخر سے کہا کرتے کہ نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے اگر سالار خود مثال پیش نہ کرے تو کام کیسے چل سکتا ہے۔ مگر اب کچھ بد دل سے ہو گئے تھے۔ علامہ مشرقی نے بلوایا۔ یہ جا کر مل آئے۔ میں نے کہا اگلی دفعہ جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا کہنے لگے۔ اب تو شاید میں بھی نہ جا سکوں۔ اس کے بعد اُنہوں نے تحریک میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔

راشد خاصی تنگدستی کا زمانہ گزار کر دلّی آئے تھے۔ ملتان میں جہاں وہ کمشنر کے دفتر میں کلرک تھے انہیں شاید تیس یا چالیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ جو دلّی میں ایک دم ڈیڑھ سو ہو گئی۔ یعنی تقریباً چار پانچ گنا زیادہ۔ چنانچہ اب وہ آہستہ آہستہ آسائش کی زندگی کی طرف مائل ہونے لگے۔ پینے پلانے کی طرف سے بھی حجاب اُٹھنے لگا۔ مگر جو مشاہرہ انہیں ملتا تھا اُس میں کسی قسم کی فضول خرچی کی گنجائش نہ تھی۔ البتہ ذہن میں طرح طرح کے خیالی پیکر اور ہیولے اُبھرنے لگے تھے جن کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے سے خاصی تسکین ہو جاتی تھی چنانچہ "شرابی"۔ "انتقام"۔ "اجنبی عورت"۔ "رقص"۔ "خودکشی" وغیرہ نظمیں اسی دَور کی یادگار ہیں۔

"ماورا" چھپ گئی۔ چغتائی صاحب نے اس کا بہت خوبصورت گرد پوش بنایا تھا۔ کرشن چندر نے دیباچہ لکھا تھا جیسا کہ توقع تھی کتاب مُلک میں بہت مقبول ہوئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ کچھ رسائل و جرائد میں اس کے

خلاف تنقیدیں بھی چھپیں مگر اس کی مقبولیت پر کچھ اثر نہ پڑا۔

اس دوران میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ راشد کو فوج میں کمیشن مل گیا اور وہ کپتان بن کر ملک سے باہر چلے گئے کوئی ڈیڑھ دو سال بعد واپس آئے تو دلی میں میرے ہی پاس آکر ٹھہرے۔ ان کی عدم موجودگی میں "ماورا" کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا تھا۔ جس کی ایک جلد میں خرید لایا تھا۔ خوش خوش اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اچانک اُن کا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا۔ ناشر نے دوسرے ایڈیشن میں اُن کی وہ نظمیں بھی رسائل سے لے کر شامل کر دی تھیں جو اُنہوں نے "ماورا" کے چھپنے کے بعد پچھلے ڈیڑھ دو سال میں کہی تھیں، حالانکہ انہوں نے ناشر کو اس کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ راشد شاید ان نظموں کو اپنے دوسرے مجموعے کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

وہ اس واقعہ سے سخت پریشان ہوئے۔ رات کو نیند بھی نہ آئی۔ بس تڑپتے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر وردی پہن گھر سے نکل گئے، تین چار دن غائب رہے۔ اس کے بعد آئے تو بڑے ہشاش بشاش لپٹ لپٹ کر گلے ملتے اور قہقہے لگاتے رہے۔

بولے۔ جانتے ہو میں کہاں سے آرہا ہوں؟ لاہور سے۔ میں اس صبح اپنے دفتر سے اجازت لیکر لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ میں سیدھا انارکلی چوک کے تھانے میں پہنچا۔ میں نے تھانے دار سے کہا۔ میں فوج میں کپتان ہوں، میں جنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب ہم جنگ پر ملک سے باہر جائیں تو سرکار ہمارے پیچھے ہمارے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ اب دیکھئے میرے ساتھ میرے پبلشر نے کیا کیا۔ اس کے بعد میں نے تھانے دار کو اس واقعہ کی تفصیل بتائی۔ اس نے کہا صاحب آپ فکر نہ کریں میں ابھی اُس کا بندوبست کرتا ہوں۔ اُس نے فوراً سپاہی بھیج کر ناشر کی دکان پر تالا ڈلوا دیا۔ اس کے ساتھ ہی جس پریس میں کتاب چھپی تھی اُس کے مالک کو بھی طلب کر لیا۔

"ماورا" کا ناشر بڑا اکڑباز تھا، بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کبھی کبھی مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی تھی مگر راشد کی اس کارروائی سے اُس کی ساری اکڑفوں نکل گئی، گڑگڑا کر راشد سے معافی مانگی۔ اور کہا کہ میں پوری رائلٹی کے علاوہ ایک ہزار روپیہ اس کا ہرجانہ بھی دوں گا۔ پریس والے بے قصور تھے اُنہیں معاف کر دیا گیا۔ البتہ اُن کے رجسٹر سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ پہلا ایڈیشن ایک ہزار نہیں جیسا کہ اُس میں درج تھا بلکہ دو ہزار جلدوں کا چھاپا گیا تھا۔ چنانچہ ناشر کو ایک ہزار کی مزید رائلٹی ادا کرنی پڑی۔

راشد مزاجاً سخت گیر تھے۔ کسی سے اُنہیں تکلیف پہنچے تو اُسے آسانی سے معاف نہیں کرتے تھے۔ اپنے خلاف بے جا یا معاندانہ تنقید کی چبھن اُنہیں عمر بھر رہتی تھی۔ ہمارے معاصرین میں ایک افسانہ نگار تھے حیات اللہ انصاری،

انہوں نے راشد کی شاعری پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا۔ اور دلّی کی ایک ادبی مجلس میں پڑھا جس میں مَیں بھی موجود تھا
مقالہ شروع سے آخر تک ترقی پسند مصنفین کا نقطہ نظر لئے ہوئے تھا، کہیں کہیں راشد کی تعریف بھی کی گئی تھی۔
مقالہ بہ حیثیت مجموعی راشد کے زیادہ خلاف نہیں تھا۔ میں نے راشد سے اس کا ذکر کیا تو بڑے چڑ چڑے ہوئے اور بغیر
مقالہ پڑھے اُسی وقت حیات اللہ انصاری کے نام ایک سخت سا خط اور وہ بھی انگریزی میں لکھ ڈالا۔ انصاری صاحب
کو یہ خط پڑھ کر یقیناً غصہ آیا ہوگا چنانچہ اُنہوں نے مقالے سے تمام تعریفی جملے تو حذف کر دیئے۔ اور اس میں بہت
سے اعتراضات شامل کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ نام تھا "ن۔ م۔ راشد پر"

راشد کو اپنی اس بے صبری اور جلد بازی کی عادت کی ایک دفعہ اور بھی سخت سزا بھگتنی پڑی تھی، راشد
کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ انہیں فوج میں کمیشن مل گیا ہے۔ اور اب صرف چند ابتدائی کارروائیاں باقی رہ گئی ہیں، مثلاً
جسمانی معائنہ وغیرہ تو وہ خود ہی فوج کے دفتر میں پہنچ گئے کہ میرا معائنہ کر لیجئے۔ شام کو جب واپس آئے تو اُن کی
بُری حالت تھی۔ ان کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں، گھٹنے زخمی تھے اور منہ سوجا ہوا۔ سارا جسم گرد کا تھا چلنا پھرنا
دوبھر تھا۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ملال بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ کہنے لگے۔ بھائی یہ امتحان تو پل صراط سے گزرنے
سے کم نہ تھا۔ مجھے خار دار تاروں پر سے گزرنا پڑا، خاصے اونچے اونچے درختوں پر چڑھا اور وہاں سے زمین پر
چھلانگیں لگائیں۔ کبھی دوڑتا تھا، کبھی رینگتا تھا، قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا،

بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس جسمانی معائنہ کی صعوبتیں ناحق ہی اٹھائیں۔ کیونکہ انہیں تو اس معائنہ
سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ یہ معائنہ تو صرف جنگ میں لڑنے والے سپاہیوں کے لئے لازمی تھا، لکھنے پڑھنے کا کام
کرنے والوں کے لئے نہیں۔

جب راشد کی نظموں کا دوسرا مجموعہ "ایران میں اجنبی" شائع ہوا تو اس کا دیباچہ پطرس بخاری نے نہایت
محبت اور خلوص سے لکھا۔ البتہ اس میں کہیں کہیں مخصوص طنزیہ رنگ میں راشد پر تنقید بھی کی تھی۔ یہ تنقید راشد
کو بالکل پسند نہ آئی۔ کہنے لگے۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شائع کروں یا نہ کروں۔ میں نے
کہا۔ یہ سچ ہے کہ اس دیباچے میں تمہاری زیادہ مدح سرائی نہیں کی گئی، مگر یقین جانو کہ اس میں کسی بے التفاتی یا عناد کو
ذرا بھی دخل نہیں۔ اگر یہ دیباچہ روایتی مدحیہ انداز میں ہوتا تو پھر بخاری صاحب میں اور دوسرے لکھنے والوں میں
فرق ہی کیا رہ جاتا۔ مگر میں راشد کو مطمئن نہ کر سکا۔

راشد خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں بڑے مستعد تھے۔ ہماری دوستی کی اس طویل مدت کے دوران

اُنہوں نے مجھے بے شمار خط لکھے۔ جو محبت، یگانگت اور خلوص سے بھرے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے اُن کی بے باک طرزِ نگارش اور اعلیٰ انشا پردازی کا رنگ بھی بخوبی جھلکتا تھا۔ نمونے کے طور پر ان کے خطوں کے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں:

۱۔ ۔ "میں نومبر کے آخر میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ریٹائر ہونے کے بعد کیا کیا جائے۔ پاکستان میں آباد ہونا مشکل ہے۔ ہمارے طبقہ میں کلچر کا جو فقدان شروع سے چلا آرہا ہے وہ مجھے راس نہیں آسکتا۔ اگر ایران میں کوئی مفید قسم کی مشغولیت مل گئی تو شاید یہیں بس جاؤں ورنہ یورپ کے کسی ملک میں۔ ایران میں اس وقت مواقع بہت ہیں۔ تاہم اس سوسائٹی کی اخلاقی خامیوں میں، دروغ گوئی جسے ان لوگوں نے ہنر کی حد تک پہنچا دیا ہے، بعض دفعہ اداس کر دیتی ہے"

۲ ـــ پطرس بخاری کے بارے میں میرے ایک انٹرویو کا ترجمہ "اوراق" لاہور میں شائع ہو رہا ہے۔ جو انگریزی میں پروفیسر انور شبنم دل (پنجاب یونیورسٹی) نے نیویارک میں میرے ساتھ کیا تھا۔ یہ انٹرویو قصیدۂ مدحیہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں بخاری کی ذات اور عمل پر ایک طرح سے تنقید بھی شامل ہے۔ شاید اس کے بعض حصوں سے تمہاری عقیدت کو ٹھیس پہنچے۔ تاہم اگر تمہاری نظر سے گزرے تو اپنی رائے سے ضرور مطلع کرو۔

۳ ـــ یہاں گزشتہ پندرہ سولہ مہینوں میں سولہ سترہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے ذہن کو اتنا چاق و چوبند کم پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بجھتے چراغ کی لو نہ ہو۔

۴ ـــ ذوالفقار بخاری صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ بے حد رنج ہوا۔ سب آہستہ آہستہ چلتے چلے جا رہے ہیں۔ بخاری سے رنگین تر اور متنوع تر شخصیت کا مالک کم ہی کوئی ہوگا۔ اُن سے دُکھ بھی پہنچے۔ لیکن وہ کبھی نشتر نہ بنے۔ کانٹے کی چبھن سے زیادہ نہ ہوتے، اور پھر اُنہیں اس چبھن کو دُور کرنے کے بھی ہزاروں مرہم یاد تھے۔ خدا ان کی رُوح کو تسکین دے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

راشد کا ذہنی ارتقا

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو شاعری جن شعرا کی بدولت عہد آفریں تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ان میں راشد اور میراجی کا نام سرِفہرست ہے ۔ ان دونوں شعرا کی نظموں میں ایک ایسے تخلیقی ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے جو اس وقت کے مذاقِ سخن کے لیے نامانوس اور اجنبی تھا۔ طرزِ احساس ، اسلوب فکر، رنگ و آہنگ ، ہیئت و تکنیک ہر اعتبار سے یہ نظمیں اس زمانے کے قارئین اور ناقدین کے لیے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ حالی اور آزاد سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر جوش، حفیظ اور اختر شیرانی تک اردو نظم آہستہ آہستہ بدلتی رہی ہے مگر یہ تبدیلی بہت خاموش اور غیر محسوس تھی اور ان تبدیلیوں کی نمود ہماری نظم نگاری کی دیرینہ روایات کے دائرے میں رہ کر ہی ہوئی ۔ شرر کی نظم بے قافیہ ، عظمت اللہ خاں کی گیت نما نظمیں اور ہندی پنگل سے ان کا شغف ، اختر جونا گڑھی اور اختر شیرانی کے سانیٹ تھوڑے بہت چونکانے والے تھے مگر ان شعرا کے یہاں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے روایت سے وابستگی باقی رہی ، دوسرے یہ کہ اس وقت تک مروجہ ہیئت و اسلوب سے انحراف کسی ایسے مواد سے مشروط نہ تھا جو نئی ذہنی ضرورتوں کی لازمی طور پر پیداوار ہو اور اس کا تعلق کسی سیاسی ، سماجی یا تہذیبی انقلاب سے ہو۔ راشد اور میراجی کے یہاں تبدیلی کا یہ عمل اس طرح اچانک ظہور پذیر ہوا کہ اس نے ایک ہنگامے کی شکل اختیار کرلی ۔ اردو میں نظم نگاری کے جو سانچے اس وقت تک رائج تھے ان میں ایک اکہرا پن تھا ، نظم کے عنوان سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا موضوع کیا ہے ۔ پوری نظم ایک سیدھی سادی منطق کے سہارے چلتی تھی جس کا آغاز اور انجام دونوں پڑھنے والوں پر آئینے کی طرح روشن ہوتے تھے ۔ جذبات و احساسات اور افکار و تصورات خواہ وہ عشق و محبت سے متعلق ہوں ، مناظرِ فطرت اور حبِ وطن کے رنگ میں ڈوبے ہوں یا قوم و ملت کی زبوں حالی سے اثر پذیر ہوں ان میں کسی نوع کی پیچیدگی نہیں ہوتی تھی ۔ شاعر کی بلندی یا پستی کا اندازہ یا تو اس کے

احساسات و تجربات کی پستی و بلندی سے لگایا جا سکتا تھا یا اظہار کے مروجہ سانچوں پر مخالفانہ تندرت سے یا پھر موضوعات، مسائل کی پہنائی اور وسعت سے۔ راشد اور میراجی نے مغرب کے شعرا بالخصوص انگلستان اور فرانس کے جدید شعرا سے متاثر ہو کر نظم نگاری کے فن کو نئے طریقوں سے برتنے کی کوشش کی۔ پابند نظم کے بجائے ایسی آزاد نظم جس میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوں اور ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہے یقیناً ایک نئی چیز تھی مگر صرف اس بات کو ہم اُردو تاریخ کے لیے جدیدیت کا سبب نہیں قرار دے سکتے کیونکہ اُردو میں جو آزاد نظم رائج ہوئی وہ بجنسہٖ فرانسیسی یا انگریزی آزاد نظم کے مماثل نہ تھی، پوری نظم میں ایک ہی بحر اور اس کے ارکان کے دائرے میں رہ کر چھوٹے بڑے مصرعے لکھنا اردو والوں کے لیے بہت زیادہ انوکھی چیز یوں نہ رہی ہوگی کہ ہمارے یہاں بھی مستزاد کی مثال ملتی ہے۔ پھر شرر سے لے کر تصدق حسین خالد کی نظموں تک آتے آتے دل گداز، مخزن، ہمایوں، نیرنگ خیال اور دوسرے رسائل کے قارئین اس نوع کی نظم نگاری سے تھوڑے بہت آشنا ہو ہی چکے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت کے قارئین کے لیے جو چیز سب سے زیادہ جنبی رہی ہوگی وہ نظم کی تعمیر کا ایک نیا طرز اور ارتقائے خیال کی ایک نئی منطق تھی جو سادہ اور بیانیہ نظم سے خاصی مختلف تھی۔ اس نظم میں افسانوی اور ڈرامائی انداز کے وہ جدید اسالیب خلط ملط تھے۔ جہاں بات کہیں درمیان سے شروع ہوتی ہے، نظم میں واحد متکلّم اب صرف شاعر نہیں تھا ایک کردار یا بعض اوقات کئی ایک کردار ہوتے تھے، کہیں خود کلامی کا انداز ہوتا تھا تو کہیں ایسا مکالمہ جس میں مخاطب کا نام لئے بغیر کچھ فقرے ادا کیے جاتے تھے اور ان کے درمیان بھی کئی محذوفات اور مقدرات ہوتے تھے جسے قارئین کو اپنے تخیل سے اپنے ذہن میں پُر کرنا ہوتا تھا۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ ہماری پرانی نظم کی مثال ان حکایات کی سی ہے جن میں ہر واقعہ ابتدا سے انتہا تک ایک خطِ مستقیم کی صورت میں ہوتا تھا۔ پڑھنے والے ایک منطقی انجام تک بہ آسانی پہنچ جاتے تھے مگر جدید نظم میں جدید ناول یا افسانے کا طریق کار اختیار کیا گیا تھا جو خطِ مستقیم کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک پیچ در پیچ سلسلے کی ہوتی ہے جہاں کردار کا ذہنی عمل زمان و مکان کے منطقی تسلسل کو توڑتا ہوا برابر آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔

یہ بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب بات ہے کہ ان دونوں شعرا پر اس وقت جو الزامات لگائے گئے ان میں زبردست تضاد ملتا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ ان کی نظموں میں شدید قسم کا ابہام ہے اور ان کے معنیٰ و مفہوم تک رسائی مشکل ہے لیکن دوسری سانس میں ان شعرا کو جنس زدہ، مریض، فراری،

شکست خوردہ ذہنیت کا مالک، انفرادیت پرست غیر سماجی اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا۔ ان کی شاعری کو فحاشی و عریانی کا نمونہ بھی قرار دیا گیا اور اس میں الحاد کے جراثیم بھی تلاش کیے گئے۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ جب ان نظموں کے معنیٰ و مفہوم تک لوگوں کی رسائی نہیں تھی تو متذکرۃ الذکر خصوصیات کیوں کر ان شعرا سے وابستہ کی گئیں کیوں کہ ان خصوصیات کا تعلق تو معنیٰ و مفہوم اور اسلوبِ فکر سے ہی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان نظموں کے بعض بند یا ٹکڑے یا مصرعے پوری نظم کے سیاق و سباق سے الگ کرکے دیکھے گئے اور انھیں کو ذہن میں رکھ کر ان کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بہت عرصہ تک ہمارے قارئین اور ناقدین ان نظموں کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہے اور اس کی وجہ ان نظموں کی نئی تکنیک تھی۔ ان نظموں میں علامت نگاری کا جو انداز تھا وہ بھی ہماری پرانی نظم کے سیدھے سادے علامتی انداز سے مختلف تھا، اس سے پورے طور پر شناسا ہونے میں بھی اُردو والوں کو کئی برس لگ گئے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب بھی اوسط درجے کا ذہن اس سے پورے طور پر مانوس ہو سکا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں شاعری کی تفہیم و تحسین اور اس سے لطف اندوزی کے جو طریقے رائج رہے ہیں وہ بہت مجموعی اور سطحی نوعیت کے ہیں غالباً مشاعروں کے رواج اور درباروں سے وابستگی نے ہمارے مذاقِ سخن کی تشکیل کی جس میں شعر کی فوری اور جذباتی اپیل یا کچھ عام قسم کے صنائع و بدائع کو ہی واحد پیمانہ قرار دیا گیا ہے ہمارے یہاں ایسے سخن فہم قاری یا ناقد کم ملیں گے جو شعر کے تخلیقی عمل کی نزاکتوں سے بھی واقف ہوں یا ان کی اپنی شعری روایت پر گہری نظر ہو یہی وجہ ہے کہ جب معمولِ عام طرز سے ہٹ کر کسی شاعر کے یہاں اجتہادی میلان ملتا ہے تو اس شاعر کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی دراں حالے کہ ہر اجتہاد کسی نہ کسی رعایت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے چوں کہ اس اجتہادی عمل میں شعر کا مجموعی رنگ و آہنگ یا اس کا ذائقہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا ہے اس لیے ہم روایت سے اس کے اندرونی اور پیچیدہ تعلق کو محسوس نہیں کر پاتے اور اسے ایک بدعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کی شاعری کو ہی لیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کی شاعری اپنے ہم عصروں سے مختلف ہے یا اُس وقت دبستانِ دہلی کے شعرا شاہ نصیر اور ذوق کے اثر سے جس رنگِ کلام پر جان دیتے تھے، اس سے غالب کو ذہنی مناسبت نہ تھی۔ میر کی سادہ اور جذبات میں ڈوبی ہوئی شاعری سے مقابلے میں بھی غالب کے یہاں پیچیدگی اور تعقل کا میلان ملتا ہے لیکن یہ روایت یک سر نئی نہیں تھی، فارسی شاعری پر اگر اس دور کے سخن شناسوں کی گہری نظر ہوتی یا انھوں

نے غالب کی شاعری کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہوتی تو انھیں غالب کی غزل اس قدر اجنبی نہ معلوم ہوتی۔ غالب نے "گلِ رعنا" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی اردو شاعری کو دہلی سے نکال کر اصفہان تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ایک فقرہ غالب کے لیے کلید کا کام دے سکتا تھا۔ راشد اور میرا جی کو بھی سخن فہمی کی اسی روایت سے سابقہ پڑا ورنہ غور کیا جائے تو ان شعرائے مغرب کی نظم نگاری سے اثر قبول کرنے کے باوجود یہ جو نئی قلم لگائی ہے۔ اس پودے کی جڑیں ہماری اپنی شعری روایت میں پیوست ہیں میرا جی نے پودیرا اور ملارمے سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ اردو، ہندی، سنسکرت اور ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کے نامور شعرا سے بھی اثر قبول کیا اور ان سب اثرات کی ترکیب و امتزاج سے اپنے لہجے اور آہنگ کی تشکیل کی ہے۔ اگر ہم سہل پسندی سے کام نہ لیں اور میر، نظیر، عظمت اللہ خاں اور ان سے ذرا آگے بڑھ کر کبیر، میرا بائی، چنڈی داس، ودیا پتی، تکا رام، نام دیو، امارو اور دامودر گپت تک بھی رسائی حاصل کریں جو ہماری اپنی دھرتی سے تعلق رکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ میرا جی نے خالص مشرقی شاعری کی بنیادوں پر اپنی عمارت تعمیر کی، البتہ صنعت گری کے بعض طور طریقے انھوں نے مغرب سے بھی سیکھے۔ اسی طرح راشد کی شاعری سے سرسری طور پر گزرنے والوں نے بھی غور نہیں کیا کہ وہ مغرب کے جدید شعرا سے اثر پذیر ہونے کے باوجود فارسی اور اردو شاعری کی بعض برگزیدہ روایتوں کا وارث ہے۔ راشد اور میرا جی دونوں کو اپنے زمانے میں باغی شعرا کہا گیا انھیں پسند کرنے والوں نے بھی انھیں اسی خطاب سے نوازا مگر میرا خیال ہے کہ بغاوت ایک تخریبی اور منفی عمل ہے اور اس کی جڑیں بہت زیادہ گہری نہیں ہوتیں اس کے برخلاف اجتہاد ایک مثبت عمل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل کو بھی برقرار رکھتا ہے۔

"ماورا" سے لے کر "ایران میں اجنبی تک" اور اس کے بعد "لا = انسان" کی نظموں کو غور سے پڑھا جائے تو راشد کی شاعری کا جو کردار تشکیل پاتا ہے اس کا تعلق ہم اس روایت سے بہ آسانی جوڑ سکتے جسے ہم دانشوری کی روایت کہتے ہیں، مشرق میں رومی سے اقبال تک اس روایت کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس روایت کے زیرِ اثر جو شاعری ہوئی ہے وہ اس شاعری سے الگ اپنا ذائقہ رکھتی ہے جسے ہم خالص متغزلانہ، غنائی یا داخلی محسوسات کی شاعری کہتے ہیں یہ اس شاعری سے بھی الگ ہے جو خالص بیانیہ شاعری کے دائرے میں آتی ہے۔ دراصل ان شعرا کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا امتزاج اور اس امتزاج کی متعدد شکلیں اور سطحیں ملتی ہیں جو ان کے فکری میلانِ طبع کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کے یہاں ذات اور غیر ذات'

ظاہر اور باطن، فرد اور اجتماع، انسان اور فطرت کے تعلق اور ان کی کشاکش اور کشمکش کے رنگا رنگ مسائل کو شعری محرکات کے پس منظر میں رکھ کر غور و فکر کرنے اور جذبہ و وجدان اور تعقل تینوں حربوں کی مدد سے سمجھنے کی سعی ملتی ہے۔ راشد کی شاعری پر جب جب میں نے غور کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری در اصل اقبال کی شعری شخصیت کا تسلسل یا اس کی تشکیلِ نو ہے۔ راشد کے یہاں جو چیز اقبال سے مختلف ہے وہ ان کا زاویۂ نگاہ ہے جو ان کی اپنی شخصیت اور ذاتی وجدان کی دین ہے۔ اقبال کا نظامِ فکر جن بنیادوں پر استوار ہے راشد نے اس سے یقیناً انحراف کیا ہے اور اس معین نظریے سے بھی انھوں نے اپنے آپ کو الگ رکھا ہے جو صرف اقبال سے مخصوص ہے، مگر اقبال کی دانش وری، اس کا طریق کار اور اس کی نظر اسے ضرور وراثت میں ملی ہے۔ اتفاق سے اقبال اور راشد تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً ایک ہی عہد کے شاعر ہیں اس لیے راشد کے اندر کا شاعر بھی کم و بیش انھیں ذہنی و فکری مسائل سے دوچار ہے جسے ہم اقبال کی شاعری میں تلاش کر سکتے ہیں۔ اردو میں اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قومی و ملکی اور مقامی شاعری کی حدوں سے اپنے آپ کو نکال کر اس آفاقی فضا میں رکھنے کی کوشش کی جہاں مشرق و مغرب کی کشمکش اور تصادم کا المیہ جنم لیتا ہے۔ اقبال کی فکر کا محور روحِ مشرق کی بازیافت، اس کے کرب تک رسائی اور اسے متحرک اور نامیاتی صورت دینے کی کوشش ہے۔ وہ مشرق کی انفعالیت اور زوال و انحطاط کے راز کو سمجھنا اور اس کے باطن تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اس کے درد کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ ان معنوں میں مشرق اس کے لیے ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کو شاعرِ مشرق محض رسماً نہیں کہا گیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لقب اس کی شاعری کے اصل سرچشموں تک ہمیں پہنچا دیتا ہے راشد کو اگرچہ یہ لقب نہیں دیا گیا مگر راشد کی شعری کائنات کا احاطہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس کی شاعری کا مرکز و محور بھی مشرق اور اس کی روح ہے۔

راشد کی شعری کائنات کے مرکز و محور کی مماثلت کے علاوہ اگر ہم غور کریں تو راشد کے لہجے کی تشکیل بھی انھیں عناصر سے ہوئی ہے جو بار بار ہمیں اقبال کی یاد دلاتے ہیں اور جن لوگوں کے کان اقبال کی شاعری اور اس کے لہجے سے آشنا ہیں وہ اسے پہچاننے میں دقت نہ محسوس کریں گے۔ مثلاً یہ ٹکڑے دیکھیے:

رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا

گزر گئی ہے تقدس میں زندگی میری
دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا (مکافات)

بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأتِ تدبیر تو نے
اسی خوردہ گیری میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلّت پر (انسان)

یہاں عدم ہے نہ فکر وجود ہے گویا
یہاں حیات مجسّم سرود ہے گویا (زندگی، جوانی، عشق)

جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور
جس کی رفعت دیکھ کر خود جنتِ یزداں ہے چور (وادیِ پنہاں)

نغمۂ سیارگاں بے رنگ و آب
قطرۂ بے مایہ طغیانِ شباب
میری ہستی ہے نحیف و بے ثبات
تاک کی ہر شاخ ہے آفاق گیر
جس سے میری سلطنت تابندہ ہے
انتہائے وقت تک پائندہ ہے (ہونٹوں کا لمس)

آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہہِ راز کریں (انتقامات)

عمر گزری ہے مسائل کی اسیری میں مری
اس سبب سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے — (سپاہی)

زندگی جو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے
ہے اسی اظہار سے حاصل مجھے قرب حیات — (اظہار)

یوں ہیں کہ خدا خود آفرینندہ تیرا
ساحری تیری خداوندی تری — (آنکھوں کے جال)

زندگی تیرے لیے بستر سنجاب و سمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری — (شاعر درماندہ)

ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالا ہے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں — (دریچے کے قریب)

بندگی سے اس مسدد لہار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناگوار — (رقص)

شکر کر اے جانِ کریں

ہوں دریا افرنگ کا ادنیٰ غلام

صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں (ایران میں اجنبی)

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں وہ دورِ اوّل کی نظموں سے ہیں، ان نظموں میں راشد کا اپنا لہجہ بھی ہے لیکن اقبال کے لہجے کی گونج اور اس کے پیرایۂ اظہار سے گہری مماثلت ہمیں قدم قدم پر ملتی ہے۔ آگے چل کر اظہار کی یہ مماثلت کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی ہے مگر راشد کے اپنے انفرادی لہجے اور طرزِ بیان میں بلند آہنگی، صلابت، فعالیت اور طنطنہ، اونچے سروں کی موسیقی کے ساتھ متحرک اور رقصاں پیکروں کی تخلیق اور ایک خاص بلند سطح سے کلام کرنے کی روش ہمیں راشد کو اقبال ہی کے قبیلے کا شاعر سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ بعض ناقدین نے راشد کی شاعری کی یک آہنگی کی شکایت کی ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ اس کا پورا کلام استعالیٰ میں ہے انترہ کی نوبت کہیں نہیں آتی۔ یہ تنقید راشد کے مزاج اور اس کے شعری کردار کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے راشد کا شعری مزاج رومی، اقبال، ڈانٹے اور ملٹن جیسے شعرا سے مماثل ہے جو ایک خاص سطح سے کبھی نیچے نہیں اترتے کیوں کہ وہ جن مسائل اور موضوعات سے دوچار ہیں وہ ان عمومی مسائل اور کیفیات سے الگ ہیں جو غنائی شاعری میں تنوع، لوچ اور لچک پیدا کرتے ہیں۔ راشد ان معنوں میں عوام کا نہیں بلکہ خواص کا شاعر ہے اور اس کی شاعری سے لطف اندوزی کے لیے بھی ایک دانشورانہ مزاج کی ضرورت ہے۔

"ماورا" میں راشد کی جن نظموں میں ہمیں فنی تکمیل کا احساس ہوتا ہے وہ ہیں، بیکراں رات کے سناٹے میں، اتفاقات، گناہ، دریچے کے قریب، رقص، انتقام، اجنبی عورت اور خودکشی وغیرہ۔ اتفاق سے انھیں نظموں کو پہلے پہل تنقید کا ہدف بنایا گیا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ان نظموں کی ہیئت اور تکنیک سے پورے طور پر مانوس نہ ہونے کی وجہ سے غلط معیاروں پر پرکھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نظمیں "دردِ مشرق" کے المیے کا ایک موثر اظہار ہیں۔ ان نظموں کے کردار استعارہ ہیں اس انفعالیت، زوال پذیری، قوتِ نمو کے فقدان اور اپنے باطن سے بے خبری کا جو مشرق کے انسان کے اصل مسائل ہیں جن کا ادراک نہ ہونے سے وہ اس کارزار میں ایک ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہے

جہاں اسے مغرب کی بڑھتی ہوئی قوتوں کا سامنا کرنا ہے۔ ان نظموں میں روایت، مذہب اور تصوف کے ان جامد عناصر پر طنز و استہزا بھی ہے جو اس کردار کی انفعالیت اور شکست کی ذمہ دار ہیں۔ ایسی ہی نظموں کے اقتباسات کی بنا پر راشد کی بے دینی اور گستاخانہ طرزِ کلام کو مطعون کیا گیا۔ مثلاً

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی (گناہ)

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی (دریچے کے قریب)

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مشرق کا آقا ہے مغرب کا آقا نہیں ہے (پہلی کرن)

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیاں میں ہے (شاعرِ درماندہ)

کیوں دعائیں تری بے کار نہ جانے پائیں
تیری راتوں کے سجود اور نیاز

اس کا باعث مرا الحاد بھی ہے

(شاعرِ درماندہ)

بے شک راشد کے یہاں طنز کی تلخی ہے مگر ہم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے اس سے کچھ کم طنز ان اداروں پر نہیں کیا ہے اور علامہ کا مقصد بھی مشرق کے جمود اور تعطل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ مثلاً

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مجھ کو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
کلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی، نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیئے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

مشرق و مغرب کی کشمکش کے المیے کو "ماورا" کی نظموں میں مختلف کرداروں کی نفسی اور زیرِ نفسی کیفیات کے پس منظر میں ٹھوس استعاروں اور پیکروں کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی، بعد میں اس المیے نے ایک مربوط اور منظّم استعارے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ "ایران میں اجنبی" کے عنوان سے جو تیرہ کینٹو دوسرے مجموعے میں شامل ہیں ان کا مطالعہ اس نوعیت سے دلچسپ ہے۔ یہ طویل نظم نہ تو ایران کا سفرنامہ ہے اور نہ ایران کے بارے میں شاعر کے ذاتی تاثرات بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ملکی حدود سے نکل کر راشد نے ایران میں مشرق و مغرب کی کشمکش کو اور بھی قریب سے دیکھا ہے اور اسے روحِ مشرق کی "وحدت" کا عرفان ہوا ہے۔ ان نظموں میں افسانوی اور مکالماتی تکنیک کے جو تجربے ہیں وہ اردو شاعری میں ایک نئے عنوان کی چیز ہیں مگر سب سے زیادہ اہم وہ ذہنی اور فکری تجربہ ہے جسے اقبال کی زبان میں "عذابِ دانشِ حاضر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمندِ عظیم
پھیلی ہوئی ہے

مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں (من و سلویٰ)

مجھے روسیوں کے "ہمہ اوست" سے کوئی رغبت نہیں ہے
مگر ذرّے ذرّے میں
انساں کے جوہر کی تابندگی دیکھنے کی تمنّا ہمیشہ رہی ہے (ہمہ اوست)

اسی روحِ شب گرد کا
اک کنایہ ہے شاید
یہ ہجرت گزینوں کا بکھرا ہوا قافلہ بھی
جو دستِ ستمگر سے مغرب کی، مشرق کی پہنائیوں میں
بھٹکتا ہوا پھر رہا ہے (دستِ ستم گر)

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر شعاعیں
انھیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں (تیل کے سوداگر)

راشد کی ان نظموں میں ایک گہری سیاسی بصیرت ملتی ہے اور انسانی مساوات کا وہ تصوّر جو کسی

فیشن یا وقتی نعرے کا مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ شاعر کے اپنے ادراک کی دین ہے۔ ان نظموں میں ایک نوع کی ہمہ گیری اور آفاقیت بھی ہے اور اس باب میں بھی راشد نے اقبال کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے "ایران میں اجنبی" کی بعض دوسری نظمیں بھی اپنی فنی پختگی، ایمائیت، تہہ در تہہ علامات اور منفرد اسلوب بیان کی وجہ سے اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار ہوں گی جن میں "سبا ویراں" کو بطورِ خاص اہمیت حاصل ہے" ماورا" کی بعض نظموں کو پہلے مبہم کہا گیا تھا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ نظمیں بڑی حد تک اکہری علامتیں رکھتی ہیں البتہ تکنیک نئی ہے۔ مگر "سبا ویران" پیچیدہ علامتی طریق کار کی وجہ سے زیادہ معنی خیز اور وسیع تر مفاہیم کی حامل ہے۔ "حیلہ ساز" "داشتہ" "نمرود کی خدائی" "ظلم رنگ" "سایہ" "کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم" اور "یہ دروازہ کیسے کھلا" بھی ایسی نظمیں ہیں جن میں راشد کا فن "ماورا" کی نظموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پختہ اور ہمہ رنگ کیفیات کا حامل ہے "ماورا" کی نظموں پر پابند نظموں کے آہنگ کا اثر باقی تھا۔ "ایران میں اجنبی" کی متعدد نظمیں مصرعوں کی وحدت کو توڑ کر نظم کو ایک معنویاتی کل کی صورت میں پیش کرنے کی اچھی مثالیں فراہم کرتی ہیں۔ بعض جگہ راشد اپنے مخصوص الفاظ اور پیرایہ ہائے اظہار کی یکسانیت سے نکل کر نسبتاً ایک متحرک اسلوب کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

یہ دروازہ کیسے کھلا؟

وہ کتبہ جو پتھر کی دیوار پر بے زبان سوچتا تھا\
ابھی جاگ اٹھا ہے\
وہ دیوار بھولے ہوئے نقش گر کی کہانی\
سنانے لگی ہے\
نکیلے ستونوں پر وہ صندوق جس پر\
سیہ رنگ ریشم میں لپٹا ہوا ایک کتے کا بت\
جس کی آنکھیں سنہری،\
ابھی بھونک اٹھا ہے،\
وہ لکڑی کی گائے کا سر\
جس کی پیتل کے سینگوں میں بربط

جو صدیوں سے بے جان تھا

جھنجھنانے لگا ہے

وہ ننھے سے جوتے جو عجلت میں ایک دوسرے سے

الگ ہو گئے تھے۔

یکایک بہم مل کے اترا کے چلنے لگے ہیں (یہ دروازہ کیسے کھلا؟)

"لا = انسان" راشد کا تیسرا اور تازہ ترین مجموعہ ہے جو کچھ ہی دنوں پہلے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں راشد کا فن ایک نئی منزل کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ جیسا کہ اس مجموعے کے نام سے ظاہر ہے اب راشد کی شاعری کا مرکز و محور وہ آفاقی انسان ہے جو قدروں کی شکست و ریخت میں اپنے وجود کا معنی و مفہوم کھو بیٹھا ہے۔ گویا راشد اب "مشرق" کے حدود سے نکل کر ایک وسیع تر افق کی طرف گامزن ہیں اور ان کی نظموں میں دانشوری کے جو نئے نمونے نظر آ رہے ہیں وہ انھیں وجودی فکر سے قریب کر دیتے ہیں!

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں

ریگ دی روز میں خوابوں کے شجر بوتے رہے

سایہ ناپید تھا، سائے کی تمنا کے تلے سوتے رہے (ریگ دی روز)

مرگِ اسرافیل سے

اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، پتھرا گیا

جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا

ایسی تنہائی کہ حسنِ تام یاد آتا نہیں

ایسا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں (اسرافیل کی موت)

آئینہ ایک پُر اسرار جہاں میں اپنے

وقت کی اوس کے قطروں کی صدا سنتا ہے

عکس کو دیکھتا ہے اور زباں بند ہے وہ

شہرِ مدفون کے مانند ہے وہ
اس کے نابود کو ہم ہست بنائیں کیسے
آئینہ حسّ و خبر سے عاری (آئینہ حسّ و خبر سے عاری)

زندگی ! تو اپنے ماضی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا پائے گی
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے سونے کنویں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی ؟
اس کی تہہ میں سنگ ریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جز صدا کچھ بھی نہیں (زندگی ایک پیرہ زن)

کیا کہیں گے اس نئے انساں سے ہم
ہم تھے کچھ انساں سے کم ؟
رنگ پر کرتے تھے ہم بارانِ سنگ
تھی ہماری سازو گل سے ، نغمہ و نکہت سے جنگ
آدمی زادے کے سائے سے بھی تنگ ؟ (گداگر)

ایک گرداب کہ ڈوبیں تو کسی کو بھی خبر ہو نہ سکے
اپنی ہی ذات کی سب مسخرگی ہے گویا
اپنے ہونے کی نفی ہے گویا (ہم کہ عشاق نہیں)

بہشت صفرِ ملیم لیکن ہمیں وہ گم گشتہ ہندسے ہیں
بغیر جن کے کوئی مساوات کیا بنے گی
وصالِ معنی سے حرف کی بات کیا بنے گی ؟ (وہ حرفِ تنہا)

یہ خلائے وقت کہ جس میں ایک سوال
کوئی چیز ہم، نہ نشاں ہم (بہ ترتیب نشاں ہم، وصال ہم)

دل خراشیدہ و خوں دادہ رہے
آئینہ خانے کے ریزوں پہ ہم استادہ رہے
چاند کے آنے پہ سائے بھی بہت آئے کبھی
ہم بہت سایوں سے گھبرائے کبھی (میر ہو، مرزا ہو، میراجی ہو)

مری مور جاں، مورِ کم مایۂ جاں
رات بھر زیرِ دیوار، دیوار کے پاؤں میں
رینگتی سانپ لہریں بناتی رہی تھی
مگر صبح ہونے سے پہلے
انھوں نے جو دروازہ کھولا
تو مردہ پایا گیا (مری مورِ جاں)

میں تری صورت ہوں شاید
اور تو معنا مرا
میں ترا پیرو ہوں، تو ہے رہبرِ دانا مرا
سوچتا ہوں نقل لے لوں اصل دے ڈالوں تجھے
اپنے جسم و روح میں "میں" کی طرح پالوں تجھے (رہبر)

وہی روایتِ ازلی کہ ہے
جسے یادِ غایتِ رنگ و بو

جیسے یادِ رازِ مے و سبو
جیسے یادِ وعدۂ تار و پو
چلا آگر میری ندا میں بھی
وہی کشفِ ذات کی آرزو (وہی کشفِ ذات کی آرزو)

دن نکل آیا تو شبنم کی رسالت کی صفیں تہہ ہوں گی
راستے دن کے سیہ جھوٹ سے لد جائیں گے
بھونکنا چھوڑ کے پھر کاٹنے لگ جائیں گے غم کے کتے
اور اس شہر کے دلشاد مسافر جن پر
ان کے سائے سے بھی لرزہ طاری
پیکرِ خواب کے مانند سرِ راہ پلٹ جائیں گے

(ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے)

ان نظموں میں زندگی اور وجود کی لاحاصلی اور بے معنویت کا شدید کرب اور انکشافِ ذات کی منزلوں تک پہنچنے کی وہ سعی ملتی ہے جو آج پوری دنیا کی جدید شاعری کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ راشد کا ہنر یہ ہے کہ انھوں نے اس کرب اور المیے کو محسوسات کی سطح پر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اور فکر کی سطح پر بھی اس طور پر وہ اپنے مخصوص شعری کردار کو برقرار رکھتے ہوئے اردو شاعری کے جدید ترین میلانات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ان نظموں کو پڑھتے ہوئے ہمیں یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم کسی ایسے شاعر کو پڑھ رہے ہیں جس کے فنی شعور کی نشو و نما تیسری اور چوتھی دہائی میں ہوئی تھی۔

"حسن کوزہ گر" "مہمان" اور "ابولہب کی شادی" میں ان کا اسلوب بیان "ایران میں اجنبی" کے سلسلے کی ہی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ "دل مرے صحرا نوردِ پیر دل" اور "اسرافیل کی موت" ان کی وہ اہم نظمیں ہیں جو دانشِ حاضر کے بعض عمیق پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں مگر ان نظموں میں قدرے خطیبانہ آہنگ پیدا ہو گیا ہے اور نیم توضیحی و نیم علامتی انداز کو ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر ان نظموں سے قطعِ نظر کر کے راشد کی تازہ نظمیں پڑھی جائیں تو وہ ہمیں ایک نئے اسلوب اور نئے لہجے کی طرف بڑھتے ہوئے نظر...

آتے ہیں۔ ان کی اشراقیت اور عجمیت تو اب بھی باقی ہے مگر نظموں کی تراش اور ان کے آہنگ میں لوچ اور تنوّع کی کیفیت ملتی ہے۔ دانشورانہ انداز فکر فعالی شاعری کے زیر و بم سے شیر و شکر ہو کر ان کے کلام میں ایک نیا ذائقہ پیدا کرتا ہے اور اسے انسان کا "راشد" "ماورا" اور "ایران میں اجنبی" والے راشد کے مقابلے میں ایک کشادہ شخصیت کا مالک نظر آتا ہے۔ راشد کے ہم عصروں میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر قریب قریب بھی یا تو ترکِ شعر کی منزل میں ہیں یا ان کے یہاں بے رنگی اور پھیکا پن آ گیا ہے، ان شعرا کی تاریخی حیثیت کو ان کی پرانی نظموں کے حوالے سے پہچاننا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے راشد نے اپنے آپ کو اپنی تاریخ کے حوالے سے کیا ہے، وہ جدید اردو شاعری کا ایک نامیاتی وجود ہے۔ اس کی شاعری بدلتی ہوئی زندگی کا استعارہ ہے اور اس میں ایک مسلسل استفہام کی کیفیت ملتی ہے۔

زندگی کو تنگنائے تازہ تر کی جستجو
یا زوالِ عمر کا دیو سپید، یا رو برو
یا انا کے دست و پا کو دھونڈنے کی آرزو
کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

راشد نے لکھا:

"۔۔۔۔ اس خط کا جواز ان باتوں میں سے کچھ نہیں۔ بلکہ ایک نظم ہے "رقص" جو کل لکھی ہے جس کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ (Primitive man) یعنی عہد پارینہ کے انسان کے مقابلہ میں ہم مہذب اور طباع شہری جن کے قوائے آج فطرت کے ساتھ جنگجوئی کے قابل نہیں رہے کس انداز سے کس درجے اور کیونکر فن میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم عورت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں جو تمام فنون کی تمثیل ہے اس لئے کہ زندگی کی تلخیوں، زندگی کی کراہیتوں کو ہم برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ زندگی پر جھپٹ نہیں سکتے فن اور فنون کے مجسمے عورت سے لپٹ سکتے ہیں۔ صرف لپٹ کر اپنی انتہائی آرزوؤں کی تکمیل کر سکتے ہیں۔"

بنام آغا عبدالحمید

ڈاکٹر ضیاء کاشمیری

میرے بھی ہیں کچھ خواب

اے عشقِ ازل گیر د ابد تاب ، میرے بھی ہیں کچھ خواب

میرے بھی ہیں کچھ خواب :

اس دور سے اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے

پھیلے ہوئے صحراؤں سے ، اور شہروں کے ویرانوں سے

ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اداس !

اے عشقِ ازل گیر د ابد تاب

میرے بھی ہیں کچھ خواب !

یہ خواب اور ان خوابوں کے طویل تانے بانے راشد کی شاعری کے آخری دور میں بہت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کے پاس اس کا سرمایۂ آخرت یہی خواب رہ گئے ہیں۔ جن کے سہارے وہ اپنے تخلیقی عمل کا آخری سفر پورا کر رہا ہے۔ راشد کے پہلے دو مجموعوں " ماورا " اور " ایران میں اجنبی " میں خوابوں کا عمل تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے ان مجموعوں میں وہ اپنے عہد کے اجتماعی زوال کا نوحہ لکھنے میں مصروف ہیں اور آخری دور میں وہ اس نوحے سے آگے حال اور مستقبل کے خوابوں کی دھند میں گم ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خواب کیا ہیں؟ اور ان خوابوں کا منظر نامہ کیا ہے؟ اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے اس وقت ہم اس بات کا تجزیہ کریں گے کہ راشد خوابوں کے خوبصورت جزیروں کی طرف کیوں نکل گئے ہیں؟ راشد کے یہ خواب ان کی اجنبیت ALIENATION کا نتیجہ ہیں تو اب مسئلہ یہ بنا کہ یہ اجنبیت ان کے شعری کینوس پر کیسے نمودار ہوئی؟

راشد کی شاعری اپنی پیدائش سے اپنے اختتام تک سامراجی استحصالی نظام میں پیدا ہوئی۔ برصغیر میں سامراجی استحصال کی روایت دو سو سال سے زیادہ پرانی ہے اور اس مسلسل استحصال نے یہاں نمو پذیری کے تمام چشمے خشک کر دیئے تھے۔ اقتصادی سیاسی اور ہمہ گیر ملکی غلامی نے برصغیر کے ذہنوں کو ایک طویل عرصے تک ماؤف کئے رکھا۔ برصغیر کی آزادی کے بعد بھی نو آبادیاتی اثرات برقرار رہے۔ مختلف سیاسی اور انتظامی ادارے ان بدترین اثرات کی تباہ کن زد میں رہے۔ اور آنے والے حکمرانوں نے قومی زندگی سے ان بنیادی تضادات سے اثرات ختم کرنے کی چنداں کوشش نہ کی کہ ان کا طبقاتی کردار خود اس راستے کی بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ راشد کے سامنے نہ صرف برصغیر کے یہ حالات تھے بلکہ تیسری دنیا کے مختلف ممالک میں بھی انھیں استحصالی نظام کے پیدا کردہ اثرات کا جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ مثلاً ایران کی مخصوص سیاسی صورتِ حال براہِ راست "ایران میں اجنبی" ان کا تخلیقی نقش ہے۔ راشد معروضی حالات سے شدید ناآسودگی محسوس کر رہے تھے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ تاریخ کے جس دور میں ہم زندہ ہیں یہ انسانی پستی کا بدترین دور ہے، جب کہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور زندگی کے حسن کو کچل کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی یہ پستی تاریخ کے کسی دور نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ راشد کہتے ہیں "انسان کی مجموعی پستی اور ذلت، جہالت، فقر اور بیماری نے کبھی وہ شدت اختیار نہیں کی تھی جو ہمارے زمانے میں کر لی ہے ساتھ ہی جنگ، استعمار، جہالت اور فقر اور بیماری کو دور کرنے کے لئے انسان کے ادراک اور شعور، دونوں پر کبھی اتنا بار نہ ڈالا گیا تھا جتنا ہمارے زمانے میں ڈالا گیا ہے۔"

(ایران میں اجنبی ص ۲)

انسان کی مجموعی پستی اور ذلت کی مختلف شکلیں آیئے ذرا راشد کی شاعری میں دیکھتے چلیں۔ زندگی، راشد کے ہاں کتنی مکروہ صورت میں نظر آتی ہے اس کے مختلف روپ دیکھئے۔

زندگی اک پیرہ زن!
جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز و شب پرانی دھجیاں!
تیز، غم انگیز، دیوانہ ہنسی سے خندہ زن
بال بکھرے دانت میلے پیرہن

دھیموں کا ایک سونا اور نا پیدا کراں تاریک بن!

"زنجبیل کے آدمی" میں راشد کی ذہنی کیفیات زیادہ واضح ہیں۔ اور اذیت و کرب کی یہ شکلیں بنتی ہیں۔

مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے وہ تیز بُو
[نہیں اس سے پست تو میں نہیں، نہیں محض مضحکہ خیز ہوں]
مجھے جلتے مُردوں کی
کم سنوں کی اُبلتی لاشوں کی
بھیڑ بکریوں کے لہو کی
وہ تیز بُو
مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے وہ تیز بُو
کہ مجھی کو قتل کیا ہو جیسے کسی نے شہر کے چوک میں!

راشد کے ہاں زندگی کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ اور ان مختلف شکلوں سے بننے والا معروضی منظر ان کی ذات میں شدید کرب کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ماضی کے استحصال سے پیدا ہونے والا یہ منظر راشد کے ہاں ایک بحران کو جنم دیتا ہے، یہ وہ بحران ہے جس میں گرفتار ہونے کے بعد ان کی تخلیقی شخصیت کو ایک نئے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربہ اجنبیت ALIENATION کا ہے، یہ اجنبیت نتیجہ ہے معروضی حقیقتوں میں ذات کی گہری شمولیت کا۔ معروضی حقیقتوں کا ادراک سماجی شعور پیدا کرتا ہے اور یہی سماجی شعور اجنبیت کے تجربہ کا موجب ہے۔ پھیلی ہوئی وسیع دنیا انسانی آشوب کے ان گنت مظاہر کا شب و روز مظاہرہ کرتی ہے، انسانی آشوب کے اس مظاہرہ میں قدم قدم پر آدمی خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ خارجی دنیا کے تشدد، جبر اور استبداد سے اپنی شناخت نہیں کر سکتا اور عدم شناخت کا یہی مرحلہ آدمی کو اجنبیت کا شکار بنا دیتا ہے۔

فرد کے ہاں اجنبیت ALIENATION کے تجربہ کی جو ممکن شکلیں بن سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ فراریت

۲۔ مزاحمت

۳۔ اور ٹھوس سماجی حقائق کے شعور سے مستقبل کے خوابوں کی تلاش۔

راشد کے ہاں 'ماورا' کے دور میں فراریت کا تجربہ تھا۔

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے

زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

مرے محبوب، جانے دے، مجھے اس پار جانے دے

اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا

کبھی اس ساحل ویراں پر میں پھر نہ آؤں گا

گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے!

'ماورا' سے 'گماں کا ممکن' تک کے لیے سفر میں تجربات اپنے مختلف مراحل سے گزرتے ہیں اور آخری دور میں سماجی حقیقتوں کے شعور سے پیدا ہونے والے حال و مستقبل کے خوابوں کے تانے بانے پھیلے ہوئے ہیں۔ سماجی بدبختی اندر انسانی صورت حال کا المیہ ان میں اجنبیت ALIENATION پیدا کرکے انھیں خوابوں کے جزیروں کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن یہ خواب ذاتی مسائل کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ سماجی ناہمواری کی تخلیق ہیں۔

معاشرتی زندگی میں بے شمار مظاہر کارگر رہتے ہیں۔ مختلف مواقع پر انسان کو اس عمل سے گزرتے ہوئے اذیت و تصادمات کے مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معاشرتی عمل سے پھوٹنے والے تصادم سے آج کے دور کا اجنبیت زدہ انسان ظاہر ہوتا ہے۔ جس کے اجنبی چہرے پر اذیت کے زخم ملتے ہیں۔ 'اجنبیت' کے جدید فلسفہ کا ایک رُخ یہ ہے کہ یہ سارے معائب معاشرتی عمل میں بدقسمتی کے حادثات نے پیدا کئے ہیں۔ حادثات کی قوت نے بدقسمتی پیدا کرکے انسان کو اس آشوب میں مبتلا کردیا ہے لہٰذا انسان اسی سبب سے معاشرے میں اجنبیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یوں انسان محض اداسی، ناسٹلجیا یا کھوکھلے احتجاجات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ نظریہ یورپ کے بورژوا فلسفہ کی پیداوار ہے۔ مگر آج تیسری دنیا کے حوالے سے یہ سمجھتے ہیں کہ اجنبیت کو حادثات کی قوت نہیں بلکہ تاریخ کی باطنی قوتیں پیدا کرتی ہیں۔ معاشرے میں اجنبیت کی قوتوں کو کسی عہد کے سماجی رشتے پیدا کرتے ہیں اور یہ سماجی رشتہ تاریخی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں، لہٰذا اجنبیت کا تصور، تاریخ کے سماجی عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ راشد کی شاعری میں اجنبیت کے تصور کو ہم اسی حوالے سے سمجھ سکتے

ہیں اور اس کی تشریح و توضیح کر سکتے ہیں۔ ان کے شعری تصورات گواہی دیتے ہیں کہ وہ معاشرے میں اجنبیت کی قوتوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جس معاشرے پر اجنبیت کی قوتوں کا غلبہ انسانی قوتوں کے امکانات کے ظہور اور عمل کو شدت سے متاثر کرتا ہے اور ثقافتی ترقی کو زبردست ضعف پہنچا کر معاشرتی وجود کو درہم برہم کرتا ہے۔ اس معاشرے میں جہاں یہ قوتیں موثر ہوں فرد کی عزت و وقار اور انسانی عظمت کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ انسانی عظمت کی بحالی ان قوتوں کے خاتمہ پر ہے۔ اجنبیت کی قوتوں کی موجودگی میں معاشرہ ہمیشہ غلط فلسفیانہ تصورات اور اعلانات کے گمراہ کن حلقوں میں اُلجھا رہے گا۔ مگر اجنبیت کی قوتوں کے خلاف معاشرتی بغاوت بھی ہمیشہ وجود اختیار کرتی ہے۔ افراد اجنبیت کا شکار ہو کر فراریت کی جگہ مثبت رد یے اختیار کر کے ان کا خاتمہ مزاحمتی عمل سے کرتے ہیں۔

راشد کے شعری منظر نامہ میں اجنبیت کی قوتوں کے خلاف عملی مزاحمت کی کوئی شکل نہیں ہے عملی مزاحمت کی تحریک نئی نسل کی پیدا کردہ ہے۔ جب کہ راشد جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس نے مزاحمت کی صرف ابتدائی شکل اختیار کی تھی، یعنی حال و مستقبل کے خوابوں کی شکل۔ وہ ان خوابوں کو سماجی حقیقت سے الگ نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خواب کے پاؤں کسی نہ کسی حقیقت پر استوار ہوتے ہیں۔ بحیثیت ایک شاعر کے وہ خوابوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر اپنے خواب رکھتا ہے وہ صرف موجود اشیا اور حالات کے خواب ہی نہیں رکھتا بلکہ ان اشیا کے بھی جو موجود نہیں ہیں، اور جنھیں موجود ہونا چاہیئے۔ یہ خواب کسی عدم سے نمودار نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہر خواب کے پاؤں کسی موجود اور فوری حقیقت پر استوار ہوتے ہیں۔ آیئے راشد کے اس بیان کو ان کی اس نظم کے حوالے سے دیکھیں جس نظم سے ہم نے اس مضمون کا آغاز کیا تھا۔ "میرے بھی ہیں کچھ خواب"

یہ نظم راشد کے خوابوں کے تانے بانے سے تشکیل پاتی ہے۔ نظم کے کینوس پر خوابوں کی مختلف شکلیں بنتی ہیں اور کہیں کہیں محض پرچھائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ راشد نے واضح اور دھندلی شکلیں نظم کے کینوس پر بکھیر دی ہیں۔

نظم کے کینوس پر بننے والی پہلی شکل تہذیبی و معاشرتی بنجر پن کی ہے۔ یہ خوابوں کے منظر نامہ کا پہلا منظر ہے۔ ہمارے سامنے ایک غیر تخلیقی منظر ابھرتا ہے سوکھے دریا، پھیلتے صحرا، شہروں کے

ویرانے اور ویرانہ گر ___ اور ان سب اشیاء کو دیکھ کر آخر میں شاعر کا محسوساتی عمل ۔ تحیر، اداسی۔ انسانی بربادیوں پر ذات کا ردِ عمل۔ اور رد عمل میں خوابوں کی شکست۔ خوابوں کے اس منظر نامے کا دوسرا اہم منظر وہ ہے جہاں شاعر کے خواب روایت کی بندھنوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ حقیقت بننے سے پہلے ان خوابوں پر روایات اور [illegible] کا اثر ہوتا ہے۔

کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ اسمار کے نیچے
اُجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے
شیراز کے مجذوب تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیب نگونسار کے آلام کے انبار کے نیچے!

اس نظم (میرے بھی ہیں کچھ خواب) میں خوابوں کی تین ایسی شکلیں اور ہیں جو ابھی تک اپنی وضاحت نہیں کر سکی ہیں۔ یہ ایسے خواب ہیں جو اپنے آپ کو مکمل نہیں کر سکے ہیں۔ شاعر کا تخلیقی جوہر ابھی تک ان کے صحیح نقوش کا تعین نہیں کر سکا۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر ان کے نقوش کو مرتب کرنے میں سرگرداں ہے، مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

کچھ خواب ہیں آزاد مگر بڑھتے ہوئے نور سے مرعوب
نے حوصلۂ خوب ہے نے ہمتِ ناخوب
گو ذات سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی انھیں محبوب
ہیں آپ ہی اس ذات کے جاروب
___ ذات سے محجوب!

کچھ خواب ہیں جو گردشِ آلات سے جویندۂ تمکین
ہے جن کے لیے بندگیٔ قاضیٔ حاجات سے اس دہر کی تزئین
کچھ جن کے لیے غم کی مساوات سے انساں کی تامین
کچھ خواب کہ جن کا ہوسِ جور ہے آئین
دنیا ہے نہ دیں!

کچھ خواب ہیں پروردۂ انوار، مگر ان کی سحر گم
جس آگ سے اٹھتا ہے محبت کا خمیر، اس سے شرر گم
ہے کُل کی خبر ان کو جُز کی خبر گم
یہ خواب ہیں وہ جن کے لیے مرتبۂ دیدۂ تر ہیچ
دل ہیچ ہے، سر اتنے برابر ہیں کہ سر ہیچ
—— عرضِ ہنر ہیچ!

راشد، ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے شاعر ہیں۔

ان درختوں میں مرا اک ہاتھ
عہدِ رفتہ کے سینے پہ ہے
دوسرا اک شہرِ آئندہ میں ہے
جو یائے راہ

ماضی اور حال دونوں آشوب کے زمانے ہیں کہ ان میں شاعر کی ذات اک مسلسل
یت کے حصار میں گرفتار ملتی ہے۔ یہ وہ حصار ہے جو علامتی طور پر صدیوں کے اس پار پھیلا
ہے۔ جس کے آغاز کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اس آشوب کے تسلسل اور استمراری عمل کا گہرا احساس
کی ذات میں موجود ملتا ہے۔ انسانی آشوب کی تاریخ کتنی پرانی ہے؟ کیا معلوم؟ ہاں ماضی کے
ن، نیم روشن اور تاریک صفحات پر انسانی خون کے چھینٹے مسلسل مل سکتے ہیں اور یہ تسلسل ماضی
ال سے ملا دیتا ہے۔ حال کی یہ شدت راشد کے آخری مجموعے تک بدستور پہنچتی کراہتی سنائی
ہے:

زندگی، تو اپنے ماضی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سوئے کے کنوئیں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی،
اس کی تہہ میں عکس دیکھے کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر آرزوئیں،

وہ سایۂ عہدِ گزشتہ کے

کبھی واردات کے بال و پر

کبھی آنے والے دنوں کا پرتوِ زندہ تر

وہ ہوائیں ہیں کہ سدا سے

آگ کے رقصِ وحشی و بے زمام میں ناچتی

کبھی گھر کے سارے شگاف و درز میں چیختی

کبھی چیختی ہیں پلک لگے

کبھی چیختی ہیں سحر گہے!

اُن ہونیوں کے خواب سے،

اُن ہونیوں کے مرحلۂ ناب سے،

جاگے ہوئے کچھ لوگ

اب ہونٹوں کے تپ پہ کھڑے کانپتے ہیں،

کندھوں پہ اٹھائے ہوئے نعروں کے بیاباں۔

اک کونج ابھی اِن کے تعاقب میں ہے

بڑھتے ہیں ہر دم لرزاں ۔

[کیا یہ ہے سزا اُن کی •

جو زیبائی کو

یا نور کو

یا سیت کی دارائی کو

برباد کریں؟]

ہم جیسے سزا یافتہ ہیں!

ماضی اور حال کا یہ آشوب راشد کے ہاں بالعموم مستقبل میں ٹھوس معنوی خواب کی شکل اختیار

کرلیتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کے ہاں یہ سوال بھی پیدا ہو گیا ہے:

ہم آدمی کو زندہ کرسکیں گے کیا؟

آدمی جو راشد کی شاعری کی ایک توانا علامت ہے، یہ علامت اپنے پورے سیاق و سباق سے آتی ہے، آدمی، گوشت پوست کا وجود، چلتا پھرتا ڈھانچہ، اپنے تہذیبی حوالوں سے آتا ہے اور اس کائنات میں ایک مکمل نقش ہے۔ راشد اسی مکمل نقش کے بارے میں متفکر ہیں جسے ماضی اور حال کے عذاب نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ صدیوں کے استحصال، کشت و خوں، جنگوں اور ہتھیاروں کے خونی استعمال نے اس آدمی کے خوبصورت نقش کو مجروح کر دیا ہے۔ راشد کہتے ہیں کہ آدمی کے سکون کے خواب کیا لوٹ آئیں گے؟ یا اس کے سر پہ تباہی مسلط رہے گی۔

وہ رات جو سیاہ جنگلوں کو چاٹتی رہی
وہ آج ہم پہ ایسے آئی ہے کہ جیسے آئے رات
کینوں میں جو کسی بڑے فریج میں ناگہاں
اسیر ہو کے رہ گئے

ہم آدمی کو زندہ کرسکیں گے کیا؟
——— مگر وہ مرحلے
فسانہ و فسوں کے صد ہزار مرحلے
جو راہ میں پھر آئیں گے؟

تباہی! یہ بتا کہ اور مرحلہ بھی ہے
کہ جس کو پار کرسکے گا آدمی؟
وہ دیکھ وحشیٔ قدیم جو لہو سے
سوچتا رہا سدا
پھر آج رنگ و نور سے اُلجھ پڑا۔
اسی کا تنوسے

جو سن رہے ہیں ریڈیو سے

دھرم دھما دھما دھرم دھما دھرم —

بتا وہ راستہ کہاں ہے جس سے پھر

جنوں کے خواب

یا خرد کے خواب

یا سکوں کے خواب

لوٹ آئیں گے

بتا وہ راستہ کہاں؟

یہ آدمی زندہ ہوکر 'نیا آدمی' کی شکل میں ان کے ہاں ابھرتا ہے۔ نئے آدمی کا نزول 'نئی آگ' سے ہو رہا ہے۔ جو نئی معنویت کی حامل ہے۔ یہ نئی آگ سب کا سرور ہے اور نیا آدمی اس نئی آگ کی معنویت سے سرشار ہے۔

'بوئے آدم زاد' بھی نئے آدمی کی علامت ہے۔ اس نظم میں دیو استبداد کی علامت ہے۔ یہ علامت انسانی تاریخ کی صدیوں پر محیط ہے۔ استبداد کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ استبداد کے دیو اپنی بو سے ابتر حال ہو چکے ہیں۔ ان کے پاؤں شل ہیں۔ اور ہاتھ سرد ہیں۔ بے نور آنکھیں پتھرا چکی ہیں اور اب دیو مزموم کی تمثال بن گئے ہیں۔ یہ استبداد کی اس علامت کے ڈھانچہ کا نقشہ ہے۔ ظاہر ہے یہ ڈھانچہ اپنی قوت کے سرچشمے زائل کر چکا ہے اور اس کی صلاحیتیں ماند پڑ چکی ہیں۔ راشد نے 'بوئے آدم زاد' کے خاتمے پر مستقبل کا ایک خواب دیکھا ہے کہ 'آدم زاد' اب اترنے والا ہے اور دیوؤں کے تمام حوصلے مات کھا چکے ہیں۔ یوں وہ ماضی کے استبداد کو حال میں ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور حال کی بے معنویت ایک نئے 'آدم زاد' کے خواب سے بامعنی ہو رہی ہے وہ 'آدم زاد' جو صدیوں سے اپنے حق و مرتبہ سے محروم تھا اب اپنا حق مانگے۔

— بوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں؟

دیو اس جنگل کے سناٹے میں ہیں

ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں!

— یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغ زاروں میں سدا
چاندنی راتوں میں وہ بے خوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں ہاتھ سرد
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے باب نبرد ؟

— ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، ژولیدہ شاخوں سے اُلجھ
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موم کی تمثال دیو !
ہاں اتر آئے گا آدم زاد ان شاخوں سے آج
حوصلے دیوؤں کے مات

راشد کے ہاں ' شہرِ وجود اور مزار ' (گمان کا ممکن) کے آخری حصے میں خوابوں کی ایک آدرشی دنیا آباد ہے۔ جہاں ماضی کے ہزاروں سال حال کے آدرش سے منسلک ہو جاتے ہیں اور حال میں موجود انسان ' معنی و حرف کی شبِ وصل نو کی برات ' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ حرفِ امید انسانی نقوش کے مثبت تصورات کو تخلیق کرتا ہے۔ دن کا چہرۂ لازوال، صدیوں سے ان آدرشوں کو ابھرتے دیکھتا ہے۔ یہ خواب تکمیل کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ ہر عہد کے انسان خوابوں سے حقیقت کا وجود تلاش کرنے میں مصروف کار رہتے ہیں۔ راشد تاریخ کے انہی خواب گروں میں سے ہیں۔ وہ انسانی مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ نئے آدمی کے حوالے سے خوابوں کو ٹھوس وجود کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

تو، مرے وجود کے شہر
مجھ کو جگا بھی دو

مری آرزو کے درخت مجھ کو دکھا بھی دو
وہ کلی کلی جو گڑا رہے ہیں دو رویہ
کتنے ہزار سال سے برگ و گل —
مجھے دیکھنے دو وہی سحر،
وہی دن کا چہرۂ لازوال
وہ دھوپ
جس سے ہماری جلد سیاہ تابِ ازل سے ہے

اے مرے وجود کے شہر
مجھ کو جگا بھی دو!
مرے ساتھ ایک ہجوم ہے
میں جہاں ہوں
زائروں کے ہجوم بھی ساتھ ہیں
کہ ہم آج
معنی و حرف کی شبِ وصلِ نو
کی برات ہیں!

"دل مرے صحرا نوردِ پیرِ دل" میں مشرق و مغرب کی 'ایک دلی' کا "رویا" بھی موجود ہے۔ جس کی گونج اس طویل نظم کے کئی مقامات پر سنائی دیتی ہے یہ ایک مثالی رویا ہے جو بقول راشد فہمِ انساں سے ورا ہے۔ یہ 'ایک دلی' کیسے ظہور میں آئے گی؟ راشد خاموش ہیں۔ موجودہ خوفناک اقتصادی زوال کی موجودگی میں اس کے امکانات کیا ہیں، راشد کچھ نہیں کہتے ہاں بس ایک مثالی رویا ان کے ذہن پر مسلط ہے کہ ایسا ہونے والا ہے کیونکر ہوگا یہ فہمِ انساں سے ورا بات ہے۔

راشد کے ہاں انسان کے روشن مستقبل کے خوابوں کی بشارت موجود ہے۔ ان کا رویہ اس

سلسلے میں رچائی ہے ۔ یہ ان کا عام انسانی رویہ ہے اور اسی کے زیر اثر وہ نئے خوابوں کی بشارت دیتے ہیں جو انسان کے شاندار مستقبل کی ضمانت دیتی ہے ۔ 'آدم کی ولادت' پر 'نئے جشن' ہو رہے ہیں اور دھرتی 'نئے دل کے نئے خواب' دیکھ رہی ہے ۔

جدید شاعروں میں روشن مستقبل کی یہ تعبیر راشد کے علاوہ اور کسی شاعر میں نہیں ہے۔ "ماورار" کی بے معنی فراریت" کا "انسان" اور "گماں کا ممکن" تک روشن شکلوں میں پُر معنی ہو جاتی ہے ۔ اب شاعر انسانی معاشرہ کے لئے عالمگیر شانتی کا طالب ہے اور انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرتا ہے ۔ اس کے خواب ٹھوس سماجی حقیقتوں کی بنیادوں پر کھڑے ہیں اور خواب یہ ہیں :

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب ہیں آزادیٔ کامل کے نئے خواب
ہر سعیٔ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے خواب
یا سینۂ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب !

راشد نے لکھا :

ہمارے اَدب کی کم مائیگی اور بے پایابی کا شکوہ کسے نہیں ۔ نہ جانے ایسا کیوں ہے، شاید ہم جانتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ جانتے ہیں ۔ واقعات کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے جو ہماری قوم، ہمارے کلچر اور ادبیات کو بہائے لئے جا رہا ہے جس کے سرچشمے شاید سات سمندر پار ہیں ۔"

خط بنام جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی

راشد کی چند نظموں کی ابتدائی صورتیں

ن م راشد ایک باشعور فنکار تھے۔ اپنے خیالات اور محسوسات کو موزوں ترین لفظوں میں پہنچ ین تک پہنچانے کے لیے اپنی نظموں میں محنت و کاوش کے ساتھ تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے ایک طرف ان کا فن آخر وقت تک آگے بڑھتا رہا اور دوسری طرف ان کی نظمیں ابلاغ، ساخت اور ار کے اعتبار سے بہتر ہوتی چلی گئیں۔ اکثر نظمیں وہ مجھے بھیج دیتے اور رائے معلوم کرتے۔ میں جو کچھ لکھتا ے توجہ سے پڑھتے اور اگر اتفاق کرتے تو نظم میں ترمیم و تبدیلی کر لیتے۔ مثلاً راشد کی ایک نظم ہے "اس پیڑ ے بوم کا سایہ"۔ یہ نظم نیا دور میں شائع ہو چکی ہے اور لا = انسان کے علاوہ نیا دور کے اسی شمارہ ن م راشد نمبر میں "انتخابِ کلام" میں شامل ہے۔ جب یہ نظم موصول ہوئی اس وقت رسالہ چھپ نے کے لیے تیار تھا۔ میں نے نظم درست کر لی لیکن خط میں لکھا کہ راشد صاحب! یہ نظم نامکمل ہے۔ آپ نسان کی غزل، مجذوب مربیہ، برگد کا درخت، نیند کی دلدل کی امیجری سے اوہام زدہ ابہت نفسیا احساس تو پیدا کر دیا ہے لیکن اس میں کوئی سمت اور مثبت رویہ پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اس میں تاریکی تو ہے وشنی نہیں ہے۔ خط آیا تو لکھا تھا کہ آپ کی بات قابلِ توجہ ہے، میں اس نظم پر دوبارہ غور کر رہا ہوں۔ یہ ظم جب "لا = انسان" میں شائع ہوئی تو نیا دور میں چھپی ہوئی اس نظم کے آخر میں پچیس مصرعوں کا اضافہ ا کہ انھوں نے نہ صرف اسے مکمل کر دیا بلکہ ذہن کے لیے ایک مثبت سمت بھی مقرر کر دی۔ پہلے نظم کا لہجہ نوطی تھا اب مستقبل میں پھول کھلتے اور مہکتے نظر آنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ شکل میں یہ نظم شاعری اور کر دونوں کے اعتبار سے زیادہ پُراثر ہو گئی ہے۔

راشد کی ایک نظم ہے "گماں کا ممکن۔ جو تو ہے، میں ہوں"۔ یہ ان نظموں میں سے ہے جسے راشد نے اتنی اہمیت دی کہ اپنے آخری مجموعۂ کلام کا نام بھی اسی نظم پر رکھا۔ ۹ فروری ۱۹۷۱ء کو خط آیا اس میں

لکھا "چند دن ہوئے نظم "گماں کا ممکن ۔ جو تو ہے، میں ہوں" بھیج چکا ہوں۔ حسب معمول اس نظم میں چند ترمیمیں درج ذیل ہیں۔ نظم کے حصّے (۳) میں ایک مصرع ہے — "میں وہ مصرع ہوں جو اُجلا ہی سہی، نارسا بھی ہے" اس میں لفظ "مصرع" کو بدل کر "مطلع" کر دیجیے۔ "میں وہ مطلع ہوں......" حصہ (۵) کے بند اوّل میں ایک مصرع ہے — "ان فرشتوں کے دھنو ٹوٹ گئے"۔ اسے یوں بدل دیجیے۔ "گرز اٹھانے ہی فرشتوں کے دھنو ٹوٹ گئے"۔ حصہ (۶) کے بند اوّل میں ایک مصرع ہے — "کندھوں کے گمانوں پہ اُٹھا آگے بڑھا" اسے یوں بدل دیجیے — "پلکوں کے تلے گہرے خیالوں پہ اُٹھا آگے بڑھا" — اس کے بعد لکھا کہ "نظم کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ اس میں میں نے چند ذاتی اور چند اجتماعی یادیں آپس میں بُننے کی کوشش کی ہے اور یہ کہنا چاہا ہے کہ انسان مسلسل گمانوں کا شکار ہے۔ صرف اس حد تک پہنچ سکتا ہے جہاں تک یہ گمان اجازت دیں۔ یعنی گمان کے ممکن تک۔ اور حقیقت کا دراصل کوئی وجود نہیں۔ ہے تو محض سیمیائی وجود ہے جو محض گمان کے ساتھ اضافی حیثیت رکھتا ہے۔" ان ترمیموں کو دیکھیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان سے نظم کی قوتِ اظہار بڑھ گئی ہے۔ شاعری راشد کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ تخلیقی سرگرمی اور ان کی روح کا حقیقی اظہار تھی۔

راشد کی ایک نظم ہے "پانی کی آواز" راشد صاحب نے یہ نظم مارچ ۱۹۷۵ء میں مجھے بھیجی۔ چند دن بعد میں نے انھیں خط لکھا اور اس نظم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ۱۱ جولائی ۷۵ء کو راشد صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا "برادر عزیز۔ آپ نے اس نظم میں ایک نیا زاویہ نکالا ہے۔ اب اس پر نظرِ ثانی کرنا ضروری ہو گیا۔ اس کا پہلا مسودہ ضائع کر دیجیے اور موجودہ مسودے کی بنا پر کتابت کرائیے۔" یہ نظرِ ثانی شدہ نظم تو میں نے نیا دور (شمارہ ۶۷ — ۶۸ ص ۳۷ — ۳۹) میں شائع کر دی لیکن پہلا مسودہ ضائع نہیں کیا۔ یہ نظم راشد کے آخری مجموعے "گماں کا ممکن" میں (ص ۱۱۳ تا ۱۱۶) شامل ہے۔ اس نظم کی پہلی صورت جسے راشد صاحب نے ضائع کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس مضمون کے آخر میں تقابلی مطالعے کے لیے شامل کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ پہلی صورت اور آخری صورت میں تبدیلیوں سے فنی، معنوی اور ہیئت کے اعتبار سے کیا پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ایک

ایسا دلچسپ مطالعہ ہے جس سے راشد کے فن کے مطالعے کے لیے نئے راستے کھلتے ہیں۔ اس ذہنی عمل کا مطالعہ اُن نئے شاعروں کے لیے از بس ضروری ہے جو فن شعر میں کچھ کر دکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

راشد کی ایک نظم "پیرِ زید" ہے۔ یہ موصول ہوئی تو میں نے لکھا کہ راشد صاحب اگر "نیک بادشاہوں کے!" کے بجائے "نیک دل بادشاہوں کے" کر دیا جائے تو اظہار بہتر ہو جائے گا۔ سولہویں سطر ـــ تمہاری ابھی تک جل رہی ہے کیا ـــ کے بارے میں میں نے لکھا کہ اس میں "ذم" کا پہلو نکلتا ہے۔ راشد صاحب نے نظم میں تبدیلی کر دی اور بدلی ہوئی شکل میں یہ نظم نیا دور (شمارہ ۶۱-۶۲، ص ۲۵۴) میں شائع ہوگئی۔ اس نظم کی "پہلی صورت" آخر میں دی جا رہی ہے۔

راشد کی ایک اور نظم ہے ـــ ہم کہ عشاق نہیں .... ۶ نومبر ۱۹۶۶ء کو خط آیا لکھا تھا "ابھی حال ہی میں غلام عباس صاحب کی وساطت سے آپ کو تین تازہ نظمیں بھجوائی ہیں۔ اُمید ہے آپ تک پہنچ چکی ہوں گی نظم "ہم کہ عشاق نہیں......" میں ایک آدھ جگہ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کا جو نسخہ آپ تک پہنچا ہو اُسے دُرست کر لیجیے۔ کرم ہوگا۔"

ساتواں بند	غلط	مرگِ ناگاہ سے اُس کی ہیں شناسا ہم بھی
	صحیح	مرگِ ناگاہ بہ صد عزم سے اُس کی ہیں شناسا ہم بھی
نواں بند	غلط	ہاں مگر............ آمیختہ ہے
	صحیح	ہاں مگر رقصِ برہنہ کے لیے نغمہ کہاں سے لائیں

دُہل و تار کہاں سے لائیں ؟
چنگ و طنبور کہاں سے لائیں؟
جب زباں سوکھ کے اک تار سے آویختہ ہے
ذات اک ایسا بیاباں ہے جہاں
نغمۂ جاں کی صدا ریت میں آمیختہ ہے!

گیارھواں بند	غلط	اپنی ہی ذات کی یہ مسخرگی ہے گویا

صحیح اپنی ہی ذات کی سب مسخرگی ہے گویا

راشد کی چار نظمیں حسن کوزہ گر ۱، ۲، ۳، ۴ نیا دور میں شائع ہو چکی ہیں۔ حسن کوزہ گر (۱) شمارہ (ص ۱۸۵ — ۱۹۰) میں شائع ہوئی اور حسن کوزہ گر ۲، ۳، ۴ شمارہ ۶۷ — ۶۸ (ص ۱۷ — ۲۱) میں شائع ہوئیں۔ یہ چاروں نظمیں اس شمارہ (ن۔م۔ راشد نمبر) کے آخر میں "انتخاب کلام" کے تحت بھی شامل ہیں۔ حسن کوزہ گر (۱) میں جو تبدیلیاں راشد نے دوبارہ کیں وہ خطوط تلاش کے باوجود نہ مل سکے البتہ حسن کوزہ گر (۲) میں جو ترمیمیں کیں وہ بہت بنیادی نوعیت کی ہیں۔ ۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء کو ایک خط میں لکھا "برادرِ عزیز۔ اُمید ہے کہ اور نظموں کے علاوہ حسن کوزہ گر (۲) موصول ہو چکی ہوگی۔ اس خط کے ساتھ حسن کوزہ گر (۳) بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے یہ بروقت مل جائے اور باقی نظموں کے ساتھ شامل ہو سکے۔ حسن کوزہ گر (۲) میں غالباً تیسرے یا چوتھے صفحے پر کہیں یہ مصرع درج ہے۔ دور کھیتوں میں کوئی بھیڑ ہو میاتی ہے۔ اس مصرع پر غالباً بھیڑیں پالنے والوں کو بھی اعتراض ہوگا اور بکریاں پالنے والوں کو بھی! اسے یوں بدل دیجیے: " دور کھیتوں میں جو بکری کوئی ممیاتی ہے۔ حسن کوزہ گر (۴) لکھ رہا ہوں۔ شاید ہفتہ دس دن تک بھجوا سکوں گا۔ ورنہ پرچہ زیادہ نہ روکیے۔ روکئے تو کہیں یہ نوٹ درج کر دیجیے کہ حسن کوزہ گر (۱) اس سے پہلے نیا دور کے فلاں شمارے میں شائع ہو چکی ہے اور راشد کے مجموعے لا = انسان میں بھی شامل ہے۔" حسن کوزہ گر (۲) کے بارے میں میں نے تفصیل سے خط لکھا جس میں چند باتوں کی طرف راشد صاحب کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ ۷ اگست ۱۹۷۵ء کو لندن سے تار آیا جس میں حسن کوزہ گر (۲) کو روکنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اسی دن ایک خط بھی لکھا جس میں تحریر تھا "برادرِ عزیز۔ بے حد معافی چاہتا ہوں۔ تار مل گیا ہوگا۔ آخری نسخہ حسن کوزہ گر کا بھیج رہا ہوں۔ آپ کی سب باتوں سے تو مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جب بھی اس نظم کو دوبارہ پڑھا، اطمینان نہ ہوا۔ اس لیے رکوا دی۔ لیکن اب امکان نہیں کہ مزید حذف و ترمیم سے کام لوں گا۔" [illegible] اپنی آخری صورت میں نیا دور شمارہ ۶۷ — ۶۸ میں شائع ہوئی۔ اس کی پہلی صورت۔ اس مضمون کے آخر میں شامل کی جا رہی ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس نظم میں راشد نے کئی اہم بنیادی تبدیلیاں [illegible]

ہیں کہ نظم کچھ سے کچھ بن گئی ہے۔

آخر میں ایک نظم کا اور ذکر کرتا چلوں۔ ساقی فاروقی نے راشد کی ایک نظم "ریگ دیروز" کا پہلا مسودہ بھجوایا۔ اور لکھا کہ: یہ نظم لکھنے سے چھپنے تک IMPROVE ہوتی چلی گئی ہے۔ یہ راشد کے CRAFTSMANSHIP کی زندہ مثال ہے"۔ یہ نظم راشد کے مجموعے لا = انسان میں شامل ہے۔ اس کی پہلی صورت اس مضمون کے آخر میں شامل کی جا رہی ہے۔

یہاں میں نے راشد کی نظموں کی ابتدائی اور آخری صورت کا تقابلی مطالعہ اور تجزیہ پیش نہیں کیا ہے۔ اس وقت تو میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مختصر تعارف کے ساتھ وہ چند نظمیں، جن کے مسودات میرے پاس محفوظ ہیں، آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ آپ خود ان ترمیموں پر غور کر کے دیکھیں کہ فنی نقطہ نظر سے ان تبدیلیوں سے نظم کی شکل و صورت میں، اس کی ہیئت میں، اس کی قوت اظہار میں کیا کمزوری یا کیا قوت پیدا ہو گئی ہے۔ راشد ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے فنکار تھے ان کے اثرات آئندہ اور زیادہ واضح طور پر محسوس ہوں گے۔

وہ نظمیں جن کا ذکر اس مضمون
میں آیا ہے، یہ ہیں:

۱۔ حسن کوزہ گر (۲)
۲۔ ریگ دیروز
۳۔ پانی کی آواز
۴۔ پیسرڈ

ان نظموں کی ابتدائی صورتیں
اگلے صفحے پر دیکھیے:

حسن کوزہ گر (۲)

اے جہاں زاد،
میں کوزوں کی طرف، اپنے تغاروں کی طرف
کیسے آنسو کی بھواروں سے یہ پھر بھیگ گئیں!
اب جو بغداد سے لوٹا ہوں تو میں سوچتا ہوں —
سوچتا ہوں تو مرے سامنے آئینے کے مانند رہی
سر بازار کبھی، صحن کبھی، بستر سنجاب کبھی
تو مرے سامنے آئینے کے مانند رہی!
لکھ رہا ہوں تجھے خط اور اک آئینہ
مرے ہاتھ میں ہے،
اس میں کچھ بھی نظر آتا ہی نہیں،
اب ایک ہی چہرے کے سوا
کیا ترے چہرے سے خالی کوئی آئینہ
کہیں ہے کہ نہیں؟)
لکھ رہا ہوں تجھے خط،
ہاں مجھے لکھنا ہی کہاں آتا ہے؟
جانتا ہوں تجھے پڑھنا بھی کہاں آتا ہے!
ہاں تجھے آئینے کی لوح پہ خط کیوں نہ لکھوں؟
انگلیاں پونچھ رہا ہوں کہ یہ پھر بھیگ گئیں

اے جہاں زاد،
نشاط اس شب بے راہ روی کی
میں کہاں تک بھولوں؟
زور مے تھا کہ مرے ہاتھ کی لرزش تھی
کہ اس رات کوئی جام گرا، ٹوٹ گیا،
تجھے حیرت نہ ہوئی،
کہ ترے گھر کے دریچوں کے کئی شیشوں پر
اس سے پہلے کی بھی درزیں تھیں بہت!
تجھے حیرت نہ ہوئی!
"وقت" کیا چیز ہے — تو جانتی ہے؟
کیسے سمجھاؤں تجھے وقت کسے کہتے ہیں؟
وقت اک ایسا پتنگا ہے جو دیواروں پہ
آئینوں پہ، پیمانوں پہ، شیشوں پہ
سدا رینگتے

میں نے چاہا ہے کئی بار پکڑ لوں اس کو
جو مرے ہاتھ سے ہر بار نکل جاتا ہے!
کیسے سمجھاؤں تجھے وقت کسے کہتے ہیں؟
اتنا کہہ دوں کہ نئے سال کے آغاز میں
لوٹ آؤں گا!

اپنے گاؤں کو جو لوٹا ہوں، جہاں زاد،
تو میں سوچتا ہوں
شاید اس جھونپڑے کی چھت پہ یہ مکڑی
مری محرومی کی،
جسے تنی چلی جاتی ہے، وہ جالا ہوں میں!
یہ سیہ جھونپڑا جس میں پڑا سوچتا ہوں،
میرے افلاس کے روندے ہوئے اجداد کی
بس ایک نشانی ہے یہی!
میں جو لوٹا ہوں تو وہ سوختہ بخت آ کے
مجھے دیکھتی ہے
دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے،
جانتا ہوں کہ مجھے اس سے کوئی عشق نہیں
(کیا کبھی اور کسی سے بھی رہا اس کے سوا؟)
طفیل اک سادہ محبت کا شب و روز کے
اس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں)
جو کبھی کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر، کبھی گا لیتے ہیں،
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں،
دل کے جینے کے بہلنے کے سوا اور نہیں۔
حرف سرحد ہیں، جہاں زاد، معانی سرحد
عشق سرحد ہے، جوانی سرحد
اشک سرحد ہیں، تبسم کی روانی سرحد
دل کے جینے کے بہلنے کے سوا اور نہیں —
(دردِ محرومی کی سرحد بھی کوئی ہے کہ نہیں؟)

میرے اس جھونپڑے میں کتنی ہی خوشبوئیں ہیں
اُسی اک رات کی خوشبو کی طرح رینگتی ہیں،
وہ مرے گرد سدا رینگتی ہیں —
در و دیوار سے لپٹی ہوئی اس گرد کی خوشبو بھی ہے
ان تغاروں میں خیالوں کی نئی مٹی کی خوشبو
بھی ہے
میرے افلاس کی،
تنہائی کی یادوں کی،
تمناؤں کی خوشبوئیں بھی!
پھر بھی اس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں —
وہ سیہ بخت سہی حسن میں کچھ کم بھی نہیں

مرے بچوں کے سوا اور کوئی غم بھی نہیں
میرے جوتے، مری پگڑی،
مرے بکھرے ہوئے کوزے
(مرے خوابوں کی پریشانی کے لیے)
وہ انہیں دیکھتی ہے، مجھ پہ برس پڑتی ہے۔
ترش روئی کے سوا کچھ بھی نہیں
تلخ گوئی کے سوا کچھ بھی نہیں!
یہ مرا جھونپڑا تاریک ہے، گندہ ہے،
پراگندہ ہے!
ہاں کبھی دور درختوں سے پرندوں کی صدا
آتی ہے
دور کھیتوں میں کوئی بھیڑ جو ممیاتی ہے
تو میں جی اٹھتا ہوں،
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کر نکلا!
ورنہ اس گھر میں کوئی سیج نہیں
عطر نہیں ہے، کوئی پنکھا بھی نہیں
تجھے جس عشق کی خو ہے،
مجھے اس عشق کا یارا بھی نہیں
(تو کہاں آئے گی اس گھر میں جہاں زاد،
کہاں اِس در و دیوار سے سر پھوڑے گی؟)

تو ہنسے گی، اے جہاں زاد،
عجب بات کہ جذبات کا حاتم بھی ہیں میں
اور اشیا کا پرستار بھی ہیں
اور ثروت جو نہیں اس کا طلبگار بھی ہیں!
تو جو ہنستی رہی اس رات تذبذب پہ مرے
میری دو رنگی پہ ہنس دے گی تو حیرت کیوں ہو؟
میں فقط ایک حقیقت کا قصیدہ خواں ہوں،
وہ حقیقت جو ٹھٹھرتی ہوئی صدیوں
کے کنارے رو دی،
اور روتی ہی رہی روتے چلی جائے گی.....
یہ حقیقت ـــ جو مرا آئینہ ہے۔
یہ مرے خود ساختہ کوزوں میں نہاں
یہ مرے فن میں نہاں،
میری ہیئت کی تگ و دو میں نہاں
اسی بے کمال حقیقت کا قصیدہ خواں ہوں،
عشق جینے کے بہانے کے سوا کچھ بھی نہیں!
یہ حقیقت مرے آغوش سے ہے دور ابھی
کبھی فرصت کی نہایت میں چلی آتی ہے
سسکیاں لیتی ہوئی!
رات کی ہم سفری کے لیے
اصرار کیے جاتی ہے۔

اس سے میں کہتا ہوں:
سُن! مجھ سے سفر کی کوئی امید نہ رکھ
میں ابھی قید ہوں اوہام کی زنجیرِ دل میں!
ان نئے سال کے آغاز میں شاید یہ مری
وحشتِ خونیں مجھے آزاد کرے!
اور پھر قافلے ریشم کے سرِ راہ
نظر آنے لگیں
راہ گم کردہ نسیم آنے لگے
اور میں ذات کے اس کشف میں دم لینے لگوں
جس سے ہر عشق کا آغاز ہوا
اور سورج کی ولادت کے نئے جشن میں
اک تازہ ملاقات نمو پانے لگے
جس سے ہر بوسے کا،
ہر راز کا آغاز ہوا!

ریگِ دیروز

تو محبت کے خرابوں کا مکیں
کنجِ دل میں کسی باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ
جو کسی فتنۂ ناگاہ سے ڈر کر چونکے
تو رہیں سدِّ رہ کا دینہ کے بھاری پردے
تو محبت کے خرابوں کا مکیں!
ایسے تاریک خرابے کہ جہاں
دُور سے تیز پلٹ جائیں وفا کے آہو
ایسے سُنسان خرابے کہ جہاں
ایک بس ایک صدا گونجتی ہو
وہ بھی آلامِ کہن سال کی یا گویا ہو
تو محبت کے خرابوں کا مکیں
ریگِ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتا رہا
سایہ ناپید تھا —
سایے کی تمنا کے تلے سوتا رہا!

(نیویارک
۱۷ جولائی ۱۹۵۵ء)

پانی کی آواز

صدائے پائے آب سن کے آج میں
ادب سے اٹھ کھڑا ہوا
"سلام اے حضور آپ آ گئے کرم کیا
کہ آپ حُسن سے لدی ہوئی
شریر عورتوں سے بھی زیادہ
قابلِ وصال ہیں ——
ہم آپ ہی کے انتظار میں
سحر کے گرد،
دوپہر کے گرد،
اپنے دل کی رات کے نواح میں
ہمیشہ گھومتے رہے
ہم اپنے اونٹ رنگ باغچوں کی جھاڑیوں
کو چھانتے رہے
کہ آپ اُن میں چھپ گئے نہ ہو کہیں
یہی ہمیں خیال تھا ——
مگر کوئی بھی اپنے خواب آپ انتخاب
کر نہیں سکا
اسی طرح یہ آپ کا ورودِ ناگہاں بھی ہے.
سمندروں میں بھی ہیں آپ،
بھاپ میں بھی آپ ہیں،
کنوؤں میں بھی ہیں،
مسجدوں کی موتے زیرِ ناف سے اٹھی ہوئی
شریف نالیوں میں بھی تو
آپ ہی کا راج ہے
لہو میں بھی شراب میں بھی آپ ہیں
ہزار بار اپنے آنسوؤں میں بھی دکھائی دیے
آپ کی جھلک ہیں.
مگر یہ سچ ہے اس طرح مصاحبہ نہیں ہوا
نہ اِس ادا سے اِس حشم سے آپ نے کرم کیا
نہ آپ آئے اِس فسوں گری نہ اِس شکوہ سے۔
نہ جب تک آپ آئے تھے
درخت جن کی سرنوشت سرکشی سوا نہیں

یہ سرنوشت بھول کر
جراوں سے کبھی کنارہ گیر ہو گئے،
گھروں کے صحن صحن میں
سگِ گزشتہ اندھنوں پہ اودیاک استخوان
کا درد رنگ ناچنے لگا
اور آنکھوں کو چپ نہیں لگی مگر
تمام عکس اپنے نکتہ ریز ماضیوں کو
یاد کر کے تو تلے ہوئے!

اب آپ کے نزدل سے
بس اتنا ہو
کہ ترشرو، جنوں زدہ، طویل سلسلے راہ لیں،

مگر نہ ہو
درخت بادباں بنیں
یہ رہگذر، یہ جانور، یہ آدمی، یہ اُن کے سادہ
جھونپڑے
اَجل کے کارواں بنیں
کرم کے اِس عتاب سے
یہ بے زباں زباں بنیں!

پیریڈ

کرسمس کے دِن

اقبال
اپنے گھر کے باہر چبوترے پہ کھڑا،
روحوں کی پیریڈ سے
سلامی لے رہا تھا۔
سب کے پاؤں اُکھڑے ہوئے تھے
سوائے رومی کے
سوائے نیٹشے اور برگساں کے
سوائے چند نیک بادشاہوں کے!
اقبال، غصّے میں بھرا ہوا
گھر کے اندر چلا گیا۔
اور دوبارہ
اپنی مومن بتیاں بنانے لگا ـــ
میری مومن بتی کیوں بجھ گئی ہے؟
اسے پھر سے کیسے روشن کروں؟
تمہاری ابھی تک جل رہی ہے کیا؟
کہتے ہیں روحوں کی پیریڈ
اس سال پھر ہو گی
اور اب کی ـــ عید کے دن
لیکن اب سلامی کون لے گا؟

مصاحبہ
سعادت سعید

راشد کا فن

سوال:۔ آپ نے فن کار کی حیثیت سے عملِ تخلیق کا تجربہ کیا ہوگا۔ آپ کے نزدیک فنی تخلیق کے عمل کی نوعیت کیا ہے؟ خاص طور پر شعری تخلیق کیونکر عمل میں آتی ہے۔

جواب:۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنی تخلیق کا عمل عام تولید کے عمل یا جنسی عمل کے ساتھ قریب ترین مماثلت رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تولید کی صلاحیت سب جانداروں کو عطا کی گئی ہے لیکن فنی تخلیق پر صرف انسان ہی قادر ہے اور انسانوں میں بھی سب کو اس سے بہرہ نہیں ملتا۔ جہاں عملِ تولید کا مقصد نسل کی افزائش ہے، فنی تخلیق کا منتہا شاید زندگی کے حسن اور پاکیزگی اور نیکی میں اضافہ کرنا ہے یا ظاہری اور باطنی حسن دونوں میں۔ لیکن جیسے جنسی عمل کی فوری محرک افزائش نسل کی خواہش نہیں ہوتی، اسی طرح فنی تخلیق کا عمل بھی افزائش حسن وغیرہ کی تمنا سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ دونوں کی اصل محرک حصولِ لذت کی وہ خواہش ہوتی ہے جو ہر جاندار میں خاص طور پر انسان کے اندر رکھی گئی ہے۔

جیسے جماع کی حالت میں ہر جاندار اپنے اندر ہیجان کی شدت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح فن کار بھی فنی تخلیق کے دوران میں عجیب و غریب ہیجان سے دوچار ہوتا ہے، اسے ہیجان ہی کہا جا سکتا ہے، سرور نہیں، کیونکہ اس کی مثال نہ تو شراب کے نشے کی ہے، نہ اس نشاط کی جو ایک عابد نماز کی حالت میں محسوس کرتا ہے، اس ہیجان کے دوران میں یہ احساس موجود نہیں کہ اس ہیجان یا اس عمل کا نتیجہ بالآخر کیا نکلے گا، نہ اس کی قدر و قیمت ہی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ لیکن اس عمل سے فوری طور پر وہ تھیلیاں ضرور خالی ہو جاتی ہیں جن سے جاندار کا جسم اور فنکار کا ذہن بھرا ہوتا ہے۔ اس ہیجان کے سرد ہو جانے کے بعد ایک گونہ تسکین محسوس ہونے لگتی ہے، بلکہ اس تسکین کے اندر اپنا ایک خلا ہوتا ہے جس کے دوبارہ حصول کے لئے اس کی تمنا بار بار پیدا ہوتی رہتی ہے۔ تاہم جیسے کامیاب جماع کے لئے جماع کی پیدائشی صلاحیت، جماع کے فن کا علم اور خواہش کا مل اجتماع ضروری ہے۔ اسی طرح فنی تخلیق کے کامیاب عمل کے لئے بھی کچھ پیدائشی صلاحیت کچھ فن کا علم اور کچھ خواہش کا اجتماع لازم ہے، اگر فن یا شعر محض بے خودی کے نشے میں تخلیق ہو سکتا، یعنی خالق کو اپنے اس عمل میں شرکت کا شعور

لہ نہ ہوتا تو یہ ایک ایسا عمل بن کر رہ جاتا جس سے اس کا عامل خود اکتانے لگتا، اس صورت میں شاید بڑے سے بڑے انعام کا لالچ یا معاش میں بلند سے بلند مقام کے حصول کی تمنا بھی فنکار کو فنی تخلیق کے عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

جب شاعر شعر کہتا ہے تو اس میں دو ہستیاں برابر کی شریک ہوتی ہیں، ایک تو شاعر کی شعوری انا اور دوسری کوئی فرشتۂ غیب جسے تحلیلِ نفسی کی زبان میں غیر شعوری انا بیان کیا جاتا ہے، ہماری شاعری میں اس کو سروش یا ہاتف کا نام دیا گیا ہے، شعر کی تخلیق کے لئے ان دونوں کا وصال ضروری ہے، لیکن یہ دونوں بھی یکجا ہونے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتے جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ فن کار یا شاعر کسی خاص واقعے کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی رکھتا ہے، اس وقت تک فن کار یا شاعر کے اندر ہیجان پیدا کرنے پر مائل نہیں ہوتے جب تک انہیں اس گہری وابستگی کا یقین نہ ہو، ہاں جب یہ دونوں مل کر ہیجان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ایک تیسری ہستی، یعنی فن کار یا شاعر کے اندر چھپے ہوئے محتسب کی ہستی، اس کو اس کی لغزشوں سے برابر آگاہ کرتی رہتی ہے، بلکہ لبا اوقات تو وہ سے بار بار یاد دلانے لگتی ہے کہ شاعری محض بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ اس وصال کے موقعے پر (جہاں تک شاعر کے عملِ تخلیق کا تعلق ہے) کچھ اور ذوات بھی شریک ہو جاتی ہیں، مثلاً الفاظ اپنے اصوات، اپنے باہمی آہنگ اور مفہوم کے ساتھ، یا مثلاً قافیے، ردیفیں اور اوزان، اصنافِ سخن، فصاحت و بلاغت کے وہ اصول جن کا علم شاعر نے مدرسے میں یا اپنے معلموں کے ذریعے کسب کیا ہو۔ ان سب کی حیثیت شاعر کے دست بستہ غلاموں کی ہے۔ لیکن اگر شاعر چوکنا نہ رہے تو ان میں سے ہر ایک اس کا آقا بن کر اس پر سرداری کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے ان کا شیوہ یہ ہے کہ اگر شاعر کے ماتھے پر شکن دیکھ پائیں تو فوراً کنارہ کش ہو جاتے ہیں، اور اگر شاعر انہیں شفقت کی نگاہ سے دیکھے تو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ہر چند کہ شاعر اس قابل نہیں ہوتا کہ اپنی تخلیق کے حسن و قبح کو الگ کر سکے، لیکن اسے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ کاغذ پر منتقل کیا ہے اس میں کہاں تک اصلیت اور کہاں تک نقالی ہے، یعنی اسے اپنی کمزوریوں کا علم ہوتا ہے، بلکہ بعض دفعہ یہی کمزوریوں کا علم یا احساس خوف میں تبدیل ہو کر اس کے تخلیق کے عمل کو شل کر دیتا ہے، جیسے مارچ کی حالت میں اپنی ناکامی کا وہم جماع کو ناکام کر دیتا ہے! تاہم قاری اور نقاد جب شاعر یا فن کار کو اس کی معاشرتی ذمہ داریاں یاد دلانے لگتے ہیں یا اس کے سیاسی یا مذہبی عقائد کا واسطہ دینے لگتے ہیں تو ان کی اس عنایت کو شاعر کے عملِ تخلیق سے براہِ راست کوئی نسبت نہیں ہوتی، اور وہ ان میں سے کسی کو دخل انداز نہیں ہونے دیتا، جب تک اسے ان سے طبعاً گہرا ذاتی جذباتی لگاؤ نہ ہو۔

سوال:- جدید سائنسی معاشرے کے اثرات نے فرد کی ذات کو بہت زیادہ اہمیت بخشی ہے اور ہر شخص کے

زندگی کو مشاہدہ کرنے کے معیار تقریباً شخصی اور ذاتی ہو چکے ہیں آپ اس اندازِ نظر کو تمام تر انسانی معاشرتی ماحول میں کس زاویئے سے دیکھتے ہیں؟ اگر اجتماعی قدروں پر کسی فردی قدروں کو ترجیح دی جاتی ہے تو ان قدروں کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

جواب:۔ فرد کی ذات کو جو اہمیت ہمارے زمانے میں نصیب ہوئی ہے وہ میری رائے میں جدید سائنسی معاشرے کے اثرات کے باعث نہیں ہوئی، بلکہ اس معاشرے نے فرد کی ذات پر جو ضرب لگائی تھی یا اس کی شکست و ریخت کا جو سامان پیدا کر دیا تھا یہ اس کا ردِ عمل ہے کہ ہمارے زمانے کے فلسفیوں اور ماہرِ نفسیات نے فرد کی ذات کی اہمیت پر دوبارہ زور دینا شروع کر دیا، اور اگر زندگی کو مشاہدہ کرنے کے معیار شخصی اور ذاتی ہو گئے ہیں تو یہ عہدِ حاضر کے ان معاشرتی فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات کے افکار کا نتیجہ ہے، جنہوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ سائنس کی ایجادات کے عملی استعمال نے صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے ہو یا جنگوں کی خاطر۔ انسان کو ایک اجتماعی دیوانگی سے دو چار کر دیا ہے، ان کے نزدیک اس دیوانگی کا تیر بہدف علاج یہ تھا کہ فرد اپنی ذات کو مکرر شناخت کرنے کے قابل ہو، تاکہ وہ سائنسی دور کے سیلابوں میں بہہ جانے سے بچ جائے۔ فرد کی قدریں اپنی جداگانہ اہمیت ضرور رکھتی ہیں لیکن اجتماعی قدروں سے بالکل الگ تھلگ بھی نہیں ہوتیں، یعنی فرد کی قدروں کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اپنے اجتماع کا جزو لاینفک ہے، اور اجتماع کے عروج و زوال کے لئے براہِ راست ذمہ دار بھی، مثلاً فرد کی آزادی کے مسئلے ہی پر غور کیجئے تو اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ فرد اپنے فکر و عمل میں اتنا آزاد ہو کہ معاشرے کی ترقی میں ممد ہو سکے اور معاشرے کو زوال سے روک سکے، اگر یہ مقصد در پردہ نہ ہو تو فرد کی آزادی محض ایک تحریر بن کر رہ جائے، جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو! یا فرد کی باطنی ہم آہنگی کے سوال کو لیجئے، اس کی ضرورت بھی محض اس لئے ہے کہ جس معاشرے کے افراد باطنی طور پر مربوط اور ہم آہنگ نہ ہوں وہ معاشرہ کبھی بھی اس حد تک ہم آہنگ نہیں ہو سکتا کہ اس سے بحیثیتِ مجموعی کوئی ایسا کارنامہ وجود میں آسکے جو عالمِ انسانی کی بقا اور ترقی میں ممد ہو، یا جو فطرت کا منشا اعلیٰ پورا کر سکے، اسی طرح فرد کے جسم اور ذہن کی کامل تربیت کے بغیر ایسا معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا جو فرد کی اپنی حفاظت کا ضامن ہو، در آنحالیکہ ہر معاشرے کا مقصد فرد کی حفاظت اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

سوال:۔ بحیثیت مترجم آپ کو کن دقتوں سے سابقہ پڑا ہے؟ کیا ترجمے کے عمل کو کسی سطح پر تخلیق کا عمل کہا جا سکتا ہے؟ اگر ترجمہ تخلیق کا درجہ اختیار کرتا ہے تو اس کی بنیاد فن کے کن عناصر پر ہوتی ہے؟

جواب:۔ ترجمہ کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اب تک شاید کسی زبان میں ایسی ڈکشنری مرتب نہیں کی گئی جو الفاظ کے مترادفات کے علاوہ ان کے معانی کے تمام "سایوں" یعنی نہایت جزئی اختلافات پر بھی حاوی ہو۔ ابھی تک

کی وجہ سے نثر کا ترجمہ شعر کے ترجمے سے آسان ہے۔ شعر میں یہ سلسلے نہ صرف بے صداقت ہوتے ہیں بلکہ خاص قسم کے جذباتی تاثرات پیدا کرنے کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کے لئے نہ صرف اس موضوع کے ساتھ کماحقہ واقفیت ضروری ہے جس سے کوئی تحریر تعلق رکھتی ہو۔ بلکہ الفاظ کے اصوات، ان کے تلازمات، ان کے محلِ استعمال، ان کے کنایاتی پہلوؤں، ان کی ترتیب توازن اور دروبست وغیرہ سے آگاہی بھی لازم ہے۔ اور صرف اس زبان کے الفاظ کے ان خصائص سے ہی نہیں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہو بلکہ اس زبان کے الفاظ کے متعدد خصائص سے بھی آگاہی کی ضرورت ہے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہو۔ حیدرآباد (دکن) کے مترجموں نے نہایت لفظی ترجمے کی رسم چلائی تھی۔ لفظی ترجمے سے مترجم کی کئی مشکلات حل ہو جاتی ہیں لیکن قاری الفاظ کے حسن متنوع استعمال کا عادی ہوتا ہے اسے پس پشت ڈال دیا جاتا ہے مثلاً میں نے کہیں پڑھا: جب کسی قوم میں کوئی بڑا آدمی پیدا ہوتا ہے تو ساری قوم کی روح امیر ہو جاتی ہے۔ یہاں امیر انگریزی کے لفظ RICH کا لفظی ترجمہ ہے۔ حالانکہ یہاں امیری سے مراد دولت مندی نہیں بلکہ سیرابی ہے۔ شاید امیر کی بجائے "مالا مال" کا استعمال زیادہ برمحل ہوتا۔ اسی طرح کہیں اور یہ جملہ نظر سے گزرا: "میں نے اپنی کار میں نیا مورچہ ڈلوایا"۔ معلوم ہوا کہ مورچہ یہاں "بیٹری" کا ترجمہ ہے۔ امریکہ میں ایسی مشین ایجاد کی گئی ہے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکتی ہے لیکن صرف رسمی دستاویزوں کا۔ افسانے جس میں زبان کا استعمال کنایوں اور استعاروں کے ذریعے ہوتا ہے اس کے بس کی بات نہیں۔ اور شاعری کا ترجمہ مشین کے ذریعے تو شاید ہمیشہ ناممکن رہے گا۔ ترجمے کے عمل کو تخلیقی عمل کہنا مشکل ہے کیونکہ اس کا بنیادی مقصد ایک زبان کی تخلیق کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے تاکہ اصل کا مفہوم اصل زبان نہ جاننے والوں تک پہنچایا جا سکے۔ لیکن جب کوئی مترجم اصل کے نازک سے نازک استعارے اور کنایے تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے علم اور محنت کی داد دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے تخلیق کہنا شاید مشکل ہو۔ کیونکہ تخلیق کا مقصد (ادب میں) نہایت شخصی ہوتا ہے۔ اور اس کا مصنف کے ذاتی تخیل اور احساس سے گہرا تعلق ہے بلکہ ذاتی تخیل اور ذاتی احساس اور ذاتی جذبے کے بغیر کوئی تحریر تخلیق کا درجہ اختیار نہیں کرتی۔

سوال:۔ آپ نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف فن پاروں کے ترجمے کئے ہیں کیا آپ کی ان فن پاروں سے طبعی یا ذہنی مناسبت تھی یا یہ ترجمے کسی خارجی ضرورت کے تحت وجود میں آئے؟

جواب:۔ ترجمہ کرنے میں ایک خاص قسم کا چیلنج پایا جاتا ہے اور ایک حد تک یہ خواہش بھی کہ جس تحریر سے ہم نے خود حظ اٹھایا ہے اس سے دوسروں کو بھی بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا جائے جیسے آدمی کسی شعر کو پسند کرنے کے بعد دوسروں کو سنا کر لذت حاصل کرتا ہے۔ تاہم میں نے اکثر ترجمے اس خواہش کے علاوہ ان رسائل کے مطالبے پر

کرنے کے لئے بھی کئے جن کی ادارت کا شرف مجھے حاصل رہا۔ یا جن کے اڈیٹروں کے ساتھ دوستی رہی اور جن کی ذاتی خوشنودی
مجھے منظور تھی۔ بعض ترجمے اپنے وقتی افلاس کو رفع کرنے کے لئے بھی کرنا پڑے۔ مثلاً الگزانڈر کیپرن کے ناول "یاما" کا ترجمہ
(جو میرے نام کے بغیر چھپا اور جس کا معاوضہ بد دیانت ناشر ہضم کر گیا) یا فرینکلن چلی گیٹنز کی فرمائش پر ولیم سیرین کے
ناول "امی میں تمہاری ہوں"۔ اور ڈاکٹر لورین آئزلے کی کتاب "وقت کا آسمان" کا ترجمہ۔ اب جو جدید فارسی نظموں
کے ترجمے کر رہا ہوں تو ان کا آغاز "نیا دور" کے جمیل جالبی صاحب کی فرمائش پر کیا لیکن اس میں بڑی حد تک اپنی طبعی اور
ذہنی مناسبت کو بھی دخل ہے۔

سوال:۔ آپ نے اپنے کسی مضمون میں اپنی چند نظموں کے بارے میں بعض نقادوں کی آرا سے اختلاف کیا ہے اور ان
نظموں میں منفی کی بجائے مثبت تصورات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کیا کسی شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف مثبت اقدارِ
زندگی ہی کا پرچار کرے یا منفی رجحانات پر مبنی کسی نظم کو ہم فن پاروں کے زمرے تک میں شامل نہیں کر سکتے؟ نیز منفی رجحانات
سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب:۔ جس مضمون کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے میں نے اس میں کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ فن صرف مثبت اقدار ہی
کا حامل ہوتا ہے یا ہونا چاہیے بلکہ میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "انسان کی راست رو اور زور کار انا ہی قابلِ قدر
نہیں بلکہ اس کی غلط کار اور راہ گم کردہ انا بھی بڑی ارزش رکھتی ہے۔ اور بعض دفعہ تو اس کی مدد سے انسانی سوال کا
جواب بہتر اور جلد تر مل جاتا ہے۔" لیکن بعض نقادوں کی اس قسم کی آرا کی تردید کرنا ضروری تھا جو میرے نزدیک غلط
مفروضوں کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہنا ضروری تھا کہ جن نظموں میں ان نقادوں کو "فرار" یا "شکست خوردہ ذہنیت"
وغیرہ نظر آئی تھی وہ دراصل فرار اور شکست خوردہ ذہنیت کی پردہ دری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا اظہار
ضروری ہے تاکہ ان نظموں کی تفہیم یا ان کے ساتھ ہمدردی کی جو راہیں ان نقادوں نے بند کر دی تھیں دوبارہ کھل سکیں۔
کیونکہ جب تک ان نقادوں کی یہ آرا برقرار ہیں ان نظموں کو ہمیشہ میرے ذاتی "عقائد" کا اظہار سمجھا جاتا رہے گا اور میں
حاشا وکلا اپنے آپ کو ان معنوں میں عقائد کا شاعر قرار نہیں دے سکتا جن معنوں میں اقبال عقائد کے شاعر تھے۔ میں زیادہ
سے زیادہ جذباتی ردعمل کا اظہار کرتا ہوں اور شاعری میں اس کی بڑی گنجائش ہے اور ہونی چاہیے لیکن جن نظموں
پر ان نقادوں نے میری طرف سے "منفیت" کا الزام لگایا تھا وہ مختلف کرداروں کی زبان سے لکھی گئی تھیں اور یہ نقاد
ان نظموں کے اسی پہلو سے بے خبر رہ گئے تھے۔

میں نے جہاں تک مجھے یاد ہے "منفی جذبات" کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں کی۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ ان

سے کیا مراد لینی چاہیے۔ "منفی جذبات" کی کوئی جامع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اور ان کی درجہ بندی اور بھی مشکل ہے۔ بعض ابتدائی قسم کے منفی جذبات میں حسد، خوف، نفرت، غصہ وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم شاید بعض لوگ منفی جذبات" میں مثال کے طور پر "رقت" کو بدترین منفی جذبہ قرار دیں۔ بعض ظلم یا ناانصافی کو۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون کون سے منفی جذبات انسان کے حق میں لہٰذا ادب کے حق میں زیادہ مضر ہیں اور ان سے بچنا ضروری ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ منفی جذبات کا تعلق علم اخلاق سے زیادہ ہے اور ادب سے کم۔ شاعر یا ادیب یہ حق رکھتا ہے کہ ہر قسم کے جذبات کی جن میں منفی جذبات بھی شامل ہیں عکاسی یا ترجمانی کرے البتہ علم اخلاق کی رو سے اس قسم کے جذبات کا مالک ہونا یا ان کا اظہار کرنا پسندیدہ نہ ہوگا شاید نفسیات کے نقطۂ نظر سے بھی منفی جذبات انسانی شخصیت کی کوتاہی کا ثبوت سمجھے جائیں کیونکہ منفی جذبات کی حالت فرزانگی اور دیوانگی کے درمیان کی حالت ہے۔ وہ شخص جس کا مرکزِ ثقل منفی جذبات ہوں، فرزانہ نہیں کہلا سکتا نہ وہ پوری شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب یہ منفی جذبات لذت کا ذریعہ بننے لگیں تو یہ زہریلے جذبات میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر متواتر نظر رکھے، ان کے بے ہودہ پن کا یا ان کے اندر چھپی ہوئی دیوانگی کا خیال رکھے تو یہ منفی جذبات انسان کی روح کی شکست و ریخت کا باعث نہیں بنتے۔ اردو کی قدیم شاعری پر یہ حادثہ گزرا کہ اکثر قدیم شاعر منفی جذبات کی اپنی ذات کے اندر تحلیل کرتے رہے۔ خاص طور پر حسد کے جذبے تک کی اور رقت کی۔ انہوں نے ان جذبات کو اپنی کسی کمزوری پر محمول نہ کیا۔ نہ وہ اس کی مضحکہ خیزی کو دیکھ سکے بلکہ حسد یا رشک یا رقابت اور رشک یا رقت گویا اردو شاعری کی "عادت" بن کر رہ گئی۔ اس کا باعث ایک حد تک وہ خارجی حالات ضرور تھے جن کے تحت قدیم اُردو شاعر زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن اصل میں یہ منفی جذبات ان کے اپنے اندر موجود تھے۔ اور ان کا اظہار وہ پورے "خلوص" کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ہم اپنے زمانے میں ایک تو ان منفی جذبات کو علم نفسیات کی روشنی میں بہتر پہچانتے لگے ہیں دوسرے ہمیں ان کی پردہ دری کرنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ میں نے اپنی شاعری میں ان منفی جذبات کی نشاندہی کی ہے جو ہمیں اپنے معاشرے اور اپنے زمانے میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان منفی جذبات کے "ارتکاب" کی کوئی تلقین نہیں کی۔ وہ نقاد جو منفی جذبات کی شاعری کے عادی تھے انہیں میری شاعری میں بھی صرف ان کا "ارتکاب" ہی نظر آیا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ گناہ کرنا اور کسی اور کے گناہ کا ذکر کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنی تحریروں میں نام نہاد منفی جذبات ہی کا ذکر کرنا چاہے تو اسے اس بات کا حق حاصل ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ادب زندگی کے مقصد اور مفہوم کو سمجھے بغیر تخلیق کیا جا سکتا ہے یا اس سے کامل طور پر کنارہ کشی یا چشم پوشی ادب یا ادیب کی اپنی ذات کے لئے مفید ہے۔ تہذیبوں کے زوال کے زمانے میں ان "منفی جذبات" کا غلبہ پیدا

ہونے لگتا ہے۔ اور شاعر خاص طور پر ان جذبات سے لذت اندوزی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف ان منفی جذبات کا فخریہ اظہار بنفسہٖ تہذیب کے زوال کی علامت بن جاتا ہے۔ اخلاق کے اصول تو بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی نفسیات بنیادی طور پر نہیں بدلتی۔ اگر اخلاقی "اصولوں" کا نہیں تو نفسیاتی اصولوں کا لحاظ رکھنا شاعر اور ادیب کے لئے ضروری ہے۔ یعنی اسے اس سے مفر نہیں ہونا چاہئیے۔ یعنی منفی جذبات کا اظہار ذاتی استلذاذ کے ساتھ کرنا یا انہیں ارفع و اعلیٰ اقدار قرار دینا ادب میں بھی ویسا ہی قابلِ اتہام ہونا چاہیئے جیسے معاشرے میں یا زندگی میں، البتہ یہ معلوم نہیں کہ کون کون سے جذبات کس کس معاشرے میں یا کس کس زمانے میں منفی اور مثبت ہوتے ہیں!

<u>راشد نے لکھا</u>

"میرے خیال میں اُردو ادبیات کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک شاعر نے پُخنے کے درد کے زیرِ اثر نظم لکھی ہو۔ ــــ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے قدیم اُردو کے شعرا کے ٹخنوں میں نہیں بلکہ دلوں میں موچ آیا کرتی تھی اور وہ اکی کھیلتے نہیں بلکہ عشق بازی کرتے ہوئے!" "دردِ دل" کے بجائے دردِ ٹخنہ سے ابہام حاصل کرنا اُردو ادب کے تمام مراسم کو توڑنے کے مترادف ہے! اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کے لئے جائز طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں ــــ!

اس خط کے ساتھ ایک نظم "لمحہ جاوداں" بھیج رہا ہوں۔ اس میں اس خیال کا اظہار مقصود ہے کہ شاعر کی محبوبہ چند لمحوں کے لئے اس کے "قابو" میں آگئی ہے۔ ساتھ کے کمرے میں اس کا ایک دوست وقت گزارنے کے لئے سو رہا ہے۔ وہ جاگ اُٹھے گا اور (رقیب یا نشین خیال ہے) کہ اسے کہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ان چند لمحوں سے پورے طور پر استفادہ کرنے کی ہوس شاعر پر غالب آجاتی ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ اب بہنے دے باتوں میں وقت نہیں کھو ــــ وغیرہ۔ نظم ایک حد تک شہوانیت سے لبریز ہوگئی ہے اور اس لئے میں اس کی اشاعت کا رد اس میں پسند کر دوں گا۔

اپنی نظم کے متعلق زیادہ کہنا محض انانیت کے مترادف ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ پہلا بند کسی حد تک "قدیم" تراکیب واقع ہوا ہے لیکن اگلے بند اچھے خاصے نئے ہیں۔ درحقیقت پہلا بند اس نظم کی محض تمہید ہے"!

خط بنام: آغا عبدالحمید

ن۔م۔ راشد
ساقی فاروقی

حرفِ ناگفتہ

ایک ادھوری کتاب

لندن

پہلی جنوری ۶۵ء

راشد صاحب،

بزرگ شعرا کی اُس کھیپ میں، جس میں آپ کے علاوہ مجاز، میراجی اور فیض بھی شامل ہیں، میں آپ کا سب سے زیادہ قائل ہوں۔ جس طرح آپ اور فیض، اقبال اور اختر شیرانی کے اختتام اور اضمحلال سے پہلے متاثر اور پھر نبرد آزما ہوئے۔ اسی طرح تقسیم کے بعد پروان چڑھنے والے شاعروں کی نظم نگار نسل، فیض اینڈ کمپنی کی ساحرانہ آواز کے ساتھ چلتے چلتے، ۱۹۶۰ء کے دوراہے پر میراجی کے سائے سائے، آپ کی شاعری کے پیچ دار زینے سے اترنے لگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ عمل یکایک ہوا نہ یہ کہ یہ کوئی جارحانہ فعل تھا جس کے پیچھے کسی سوچی سمجھی اسکیم کا دخل تھا بلکہ نام نہاد ترقی پسند شاعری کے جبڑے جگالی کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ نئے لوگوں کے لئے ترقی پسندوں کے الفاظ، افکار اور اظہار کی یکسانی ایک قبائے تنگ تھی جس میں جدید شاعری کے رموز اور اسرار کی دھجیاں نہیں لگائی جا سکتی تھیں، پھر پیوندکاری شاعر کا شعار بھی نہیں۔ ادھر پچھلی ربع صدی میں اس کرۂ ارض پر ایسی ناگہانی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ آدمی کی سانس اکھڑ گئی، فاصلوں کا سکڑنا اور دور دراز کے گونگے براعظموں کے مسائل کی یگانگت، اظہار کے پیچیدہ وسائل مانگتی تھی۔ میراجی کی طرف پھر آپ کی طرف نئے نظم نگاروں کی ہجرت بلا سبب نہیں تھی۔ اس ہجرت یا مراجعت سے نئی نسل کے مسائل پیدا ہوئے۔ اگر ۱۹۱۶ء کو یورپ میں جدید شاعری کا نقطۂ آغاز مان لیا جائے تو یہ کوئی ساٹھ سال پرانی ہوئی۔ اپنے یہاں ابھی اس کا چالیسواں ہو رہا ہے۔ چالیس سال میں کوئی عظیم روایت نہیں بنتی۔ اس لئے میر، غالب یا اقبال کی تمنا فضول ہے کہ ان کی شاعری کی پشت پناہی کے لئے فارسی میں اظہار اور اسلوب کی صدیوں پرانی عظیم روایات کھڑی تھیں اور جدید شاعر کو، آپ ہی کے الفاظ میں، اظہار اور رسائی کی نئی روایات بنانی پڑیں۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت اہم اور بڑی قابلِ قدر بات ہے اور جدید اردو نظم نگاری اپنے پیش رووں میراجی، راشد اور فیض کی ہمیشہ احسان مند رہے گی۔ اور یہیں سے آپ کے بعد

کے آنے والوں کی الجھن بڑھتی ہے۔ اسلوب سے روشناس ہونے کے بعد آدمی خیال اور جذبے سے ہمکنار ہوتا ہے اور جدید شاعری کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ آپ تینوں کی شاعری اس عظمت سے خالی ہے جو، مثال کے طور پر، انگریزی کی جدید شاعری کے پہلے تیس برس میں ییٹس، پونڈ اور ایلیٹ کے یہاں ملتی ہے۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ان تینوں کا سارا کلام میری سمجھ میں آگیا ہے۔ مگر انگریزی کے تنقید نگاروں کی رہنمائی سے اور اپنی عاجزانہ جستجو سے میں نے ان کے بنیادی علامات کی کلید کا سراغ ضرور لگا لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جدید دنیا کے پیچ در پیچ مسائل کے اظہار کے لئے ان کی شاعری نے اس استعارے کو جنم دیا ہے جو صرف ذہنی اور جذباتی پیچیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔

فیض کے یہاں پیچیدگی تو کیا، خیال اور جذبے دونوں کی نیرنگی کا عجز موجود ہے جس کا ذکر میں اپنے ایک مضمون میں خاصی تفصیل سے کر چکا ہوں۔ پتہ نہیں کہ آپ کی نظر سے گذرا کہ نہیں (با ہر رہنے کے کچھ مزے ہیں آدمی بری شاعری سے ہی محفوظ نہیں رہتا برے مضمون سے بھی صاف بچ نکلتا ہے) میراجی کے یہاں جذبات کی وہ جدید پیچیدگی موجود ہے جس کے بغیر اظہار ذات ناممکن ہے اور آپ کے یہاں پیچیدہ خیالات کی وہ رنگت تو ہے جو جدید شاعری کو درکار ہے اور ماورا سے لا = انسان تک خیال کی ایک پیچواں جہت بھی ہے مگر جذبات کی وہ پیچیدگی نہیں ملتی جو میراجی کا مقدر تھی۔ آپ کہیں گے کہ اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ آپ میراجی نہیں ہیں مگر میں تو کسی اور ہی المیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ آپ کے یہاں خیالات کی پیچیدگی تو بڑھتی رہی ہے مگر جذبات کو سلجھانے کی تمنا آخر اتنی شدید کیوں ہے؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنے خیالات سے مطمئن اور جذبات سے خوفزدہ ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ کشمکش آپ کی شاعری میں کیوں نہیں آتی؟

آپ کا۔ ساقی

پوسٹ اسکرپٹ۔ آج پاکستان ایمبیسی میں جب میں نے میاں ممتاز دولتانہ سے پاکستان کی بقا اور اردو کے مستقبل کی بات کی تھی تو آپ خاموش کیوں ہو گئے تھے۔؟

ہونیٹن ہاؤس، فلڈ اسٹریٹ، لندن۔ ایس ڈبلیو ۳

۱۵ر جنوری ۱۹۷۵ء

عزیز گرامی ــ آپ کا ۱۰ر جنوری کا خط ملا۔ آپ کا یہ جملہ دلچسپ ہے: "نئے لوگوں کے لئے ترقی پسندوں

کے الفاظ، افکار اور اظہار کی یکسانی ایک قبائے تنگ تھی جس میں جدید شاعری کے رموز و اسرار کی دھجیاں نہیں لگائی جا سکتی تھیں۔" آپ نے یہ کہہ کر گویا غیر عمداً مجھے اپنی وہ مشکل یاد دلا دی ہے جو جوانی میں درپیش تھی۔ مجھے ہی نہیں بلکہ فیض اور میراجی اور کئی اور شاعروں کو انجانے طور پر اس کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ نہ صرف غزل کی شاعری میں ہمیں الفاظ، افکار اور اظہار کی وہی یکسانی نظر آتی تھی جو آپ کو ترقی پسندانہ شاعری میں دکھائی دی۔ بلکہ اپنے قریب ترین پیشروؤں کی شاعری میں بھی ہم نے اپنے آپ کو اسی یکسانی یا یک آہنگی کے روبرو پایا۔ خاص طور پر اقبال کے "حسن اقتشام" کے باوجود جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اور ان کی تمام تر ذہنی توانائی کے باوجود جس کے اعتراف سے کسی کو مفر نہیں۔ اُن کے کلام میں شروع سے آخر تک ایک یک آہنگی کی فضا پائی جاتی ہے۔ اسلوب کی یکسانی کا ذکر نہیں، لیکن وہ ایک ہی فارمولے کو رٹتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کے بعد ترقی پسندوں نے بھی گویا یہی نہج اختیار کیا تھا۔ اقبال کے کلام کی ابتدا ہی میں جب ایک بار آپ یہ دریافت کر لیں کہ جنوں، ایمان، خودی، عمل وغیرہ کے بغیر مردِ کامل ظہور میں نہیں آسکتا تو ان کی باقی شاعری افسوسناک حد تک حرفِ مکرر بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ایک طرح سے اختر شیرانی کا تھا۔ جس میں جذبات کا "اضمحلال" تو تھا ہی۔ لیکن جذبات کی تکرار بھی کم نہ تھی۔ اور شاید اس تکرار سے آپ کو "اضمحلال" کا احساس ہوا ہو۔ "ترقی پسندوں" کا جرم محض الفاظ، افکار اور اظہار کی یکسانی ہی نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے ذاتی فیصلے کی قوت یا اپنے "انتخاب" کو ہاتھ سے دے دیا تھا جب شاعر اس جرم کا مرتکب ہو تو اس کے کلام میں دوسروں کی گونج خود بخود پیدا ہونے لگتی ہے۔ ترقی پسند اقبال ہی کے مانند انسانی مسائل سے دست و گریباں تھے۔ ان کا فارمولا اُن کی خاطر کسی اور نے تیار کیا تھا۔ درحالیکہ اقبال کا فارمولا، ذاتی علم و حکمت، سوچ بچار اور تجربے کا حاصل تھا۔ اس لئے اقبال کی موت ترقی پسندوں کی موت سے مختلف ہوگی۔ اور اسے ایک طویل زمانہ درکار ہوگا۔ اختر شیرانی میں الفاظ، افکار اور اظہار کی یکسانی یا جذبات کا اضمحلال ہی نہیں۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ محض "عصمت" اور "عصمت دری" کے نفسیاتی گنجلک (COMPLEX) میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس گنجلک نے اس کے جسم و روح کے گرد احاطہ کر رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہم شاعروں کے ہاں محض الفاظ، افکار اور اظہار کی یکسانی ہی جدید شاعر کے لئے (وہ کسی زمانے سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو) سرگردانی کا باعث نہیں ہوتی۔ بلکہ زمانے کا فرق بھی اس کو نئے الفاظ، افکار اور اظہار کی تلاش پر اکسانے لگتا ہے۔ آپ نے خود گذشتہ ربع صدی

میں کرۂ ارض کی ناگہاں تبدیلیوں" "فاصلوں کے سکڑنے" اور "دور دراز کے براعظموں کے مسائل کی یکجائیت" کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے "اظہار کے پیچیدہ وسائل" کی جستجو کی دلیل قرار دیا ہے جس میں آپ کے نزدیک گویا نئے یا نئی نسل کے شاعر مصروف ہیں۔ اسی احساس نے فیض، میراجی اور اس نیاز مند کو اپنے زمانے میں زندگی کی نئی ترجمانی پر اکسایا تھا۔

انگریزی زبان کے جن تین شاعروں یعنی YEATS ، EZRA POUVD اور T.S. ELIOT سے آپ بجا طور پر متاثر یا مرعوب نظر نہیں آتے۔ ان تینوں شاعروں میں نہ صرف وہ تنوع ہے جس کی وسعتیں لامکانی ہیں۔ بلکہ ان کی نظر بھی آفاقی ہے۔ ہماری تہذیب کے شاعروں میں انہی کے مانند، گو ان سے پہلے، اسی قسم کے تنوع اور اسی قسم کی آفاقی نظر کے حامل، ابوالعلا معری، رومی، حافظ، بیدل اور غالب گزر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر عظیم شاعروں کی کمی ہے تو انگریزی میں بھی زیادہ فراوانی نہیں۔ انگریزی کے اکثر و بیشتر شاعر، فارسی اور اردو کے اکثر و بیشتر شاعروں کے مانند اپنے پاؤں سے آگے نہیں دیکھتے اور اپنے ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اپنے قریبی قومی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ ایسے شاعر ہر زبان میں کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں جن کی نظر بسیط و بلند نزد و دور اور دیدہ و نادیدہ کی تمام وسعتوں کا احاطہ کر سکے۔ اس کا اصل سبب جاننا مشکل ہے۔ لیکن قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس معاشرے میں تعلیم و تربیت کا ماحول وسیع تر ہو، اس میں ایسے شاعر پیدا ہونے لگتے ہیں جن کی حساسیت دوسروں سے روشن تر ہو۔ ہمارے ہاں عظیم شاعروں کے فقدان یا قلت کا باعث بیشتر یہ رہا کہ محض روزانہ معاش کے فشار کے نیچے شاعر اس قدر دبا ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی کشادگی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ وہ امراء و سلاطین سے آزوقۂ حیات وصول کرنے کے لئے ان کے قصائد تو لکھتا ہی تھا لیکن اپنی غزل تک اکثر انہی امراء و سلاطین کی خوشنودی حاصل کرنے کی احتیاج کے تحت لکھتا تھا۔ جب اس قسم کے ماحول سے شاعر کو سروکار ہو تو اس کی پرواز کی کوتاہی قابلِ فہم ہے۔ انگریزی شاعری کی تمام روایت میں امراء و سلاطین کی خوشنودی کی تمنا سراسر غائب ہے۔ اس کے علاوہ ہماری زندگی میں وہ فطری حسن بھی موجود نہیں، بلکہ انسان کے تخلیق کئے ہوئے حسن کے تحفظ کی تمنا اور اس کے تحفظ کا سلیقہ تک مفقود ہے۔ جو شاعر کو الہام بہم پہنچاتا ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے ہاں درسگاہوں میں مذہب، فلسفہ اور منطق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ تعلیم عظیم شعر کی بنیاد بنتی تھی جس طرح YEAT ، POUND اور ELICT کی تعلیم میں

عیسائیت اور اس کے فلسفے کی تعلیم شامل رہی اور اس نے ان کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔ پھر مغرب میں ایسے، ہزاروں موقعے ہیں، دانش گاہیں ہی نہیں، کتاب خانے ہیں۔ ذرائع آمدو رفت وسیع ہیں۔ مواصلات کے ذرائع عرصے سے برسرکار ہیں، تفریح گاہیں ہیں۔ عجائب گھر اور نگار خانے ہیں۔ جن سے شاعر اور ادیب کے ذہن کو کشود حاصل ہوتی ہے۔ انگریزی کے جن شاعروں کا آپ نے نام لیا ہے۔ وہ تینوں نہ صرف اپنی تہذیب کے ماضی و حال سے کامل طور پر آگاہ تھے۔ بلکہ بدھ مت، چینی تہذیب، یونانی فلسفے (جو سب فلسفوں کی بنیاد ہے) وغیرہ کے علم کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ پھر جس سائنٹفک ماحول میں انہوں نے زندگی بسر کی، وہ ان کے ذہنوں کو روشن رکھنے کے لئے کافی تھا۔ بلکہ سائنٹفک ترقی سے انہیں جو اطمینان یا مایوسی حاصل ہوتی تھی وہ ان کے شاعرانہ جذبات اور افکار بلکہ الفاظ تک کا سرچشمہ الہام بن جاتی تھی۔

اگر ان حالات میں آپ کو فیض کے ہاں "خیال اور جذبے کے اظہار کا عجز" یا میراجی کے ہاں محض "جذبات کی پیچیدگی" اور میرے کلام میں "محض پیچیدہ خیالات کی رفعت" نظر آئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم تینوں اگر مغرب میں پرورش پاتے تو ہم بھی ELIOT اور POUND، YEATS بن کر دکھا دیتے۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر علم و فراست کو جلا دینے والے وہی ادارے، بلکہ پورا ماحول ہمارے ہاں بھی ہوتا جو مغرب میں صدیوں سے رہا ہے تو ہمارے ہاں بھی عظیم یا عظیم تر شاعر پیدا کرنا مشکل نہ تھا۔ اگر ہم تینوں کا کلام بقول آپ کے "عظمت سے خالی" ہے تو اس کا باعث بڑی حد تک وہ حالات ہیں جن میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ وہ حالات جن میں طبائع کو محض محدود حد تک تحریک ملتی تھی۔

تاہم آپ نے فیض اور میراجی اور اس نیاز مند کے بارے میں، جو بعض مفروضات قائم کئے ہیں ان میں میں آپ کا ہم نوا نہیں ہوں پہلے تو میں آپ کے ان کلمات کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکا: "نیرنگی کا عجز" "جدید پیچیدگی"، "پیچیدہ خیالات کی رفعت" وغیرہ۔ اور پھر جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں وہ رفعت ہے جو جدید شاعری کو "درکار" ہے، تو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ شاعر جدید یا قدیم شاعری کی کسی "ضرورت" کو پورا کرنے کے لئے شعر کیوں کہے؟ اور اپنے خیالات میں "پیچیدگی" یا "رفعت" محض اس غرض سے کیونکر پیدا کرے کہ یہ جدید شاعری کو "درکار" ہوگی؟ شاعری تک رسائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ مجھے عجیب ہی نہیں غریب بھی نظر آیا۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فیض ہو یا میراجی یا یہ نیاز مند ہم میں سے کوئی بھی یقیناً عظیم شاعر نہیں۔ (شاید صرف احمد ندیم قاسمی عظیم ہے جو اپنی کتابوں کے اشتہارات میں اپنے آپ کو عظیم شاعر،

عظیم مفکر، عظیم انسان"، کی حیثیت سے روشناس کراتا رہتا ہے۔ اور اسے اس بات کا حق بھی پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ عظمت کے مفہوم سے کامل طور پر بے بہرہ ہے۔ تاہم یہ کہہ کر کہ "فیض کے ہاں پیچیدگی تو کیا خیال اور جذبے دونوں کی نیرنگی کا عجز موجود ہے" یا میرے کلام میں "جذبات کی وہ پیچیدگی نہیں ملتی جو میراجی کا مقدر تھی" یہ گویا میراجی کے ہاں جذبات کی وہ پیچیدگی موجود ہے جس کے بغیر اظہارِ ذات ناممکن ہے لیکن (گویا) خیالات یا پیچیدہ خیالات کی رفعت مفقود ہے۔ تینوں شاعروں کو رد کر دینا، بڑی جسارت چاہتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تینوں شاعروں کو جو علم یا تجربہ زندگی سے حاصل ہوا ہے وہ ان کے اندر جا کر وہ نور نہ بن سکا جو آئندہ صدیوں کے راستوں کو روشن کر دے اس لئے وہ عظیم نہیں ہیں۔ لیکن جذبات اور خیالات کے تناسب کی کمی بیشی کی بنا پر "آئندہ عظمت سے خالی" قرار دینا تعجب کا باعث ہے۔ یوں تو YEATS، ELIOT اور POUND کی نظموں میں بھی آپ کے مفروضے کے باوجود۔ نقادوں کو کئی جگہ اس تناسب یا توازن میں کمی بیشی کا احساس ہوا ہے۔ لیکن ان کی عظمت کا سرِ نہاں محض یہ تناسب نہیں بلکہ وہ بصیرت اور وہ روّیہ ہے جس کے وہ حامل تھے: "ذہنی اور جذباتی پیچیدگی" سے اس استعارے نے جنم نہیں لیا "جو جدید دنیا کے پیچ در پیچ مسائل کے اظہار کے لئے" درکار تھا۔ بلکہ وہ شاعر جو تلوار تھے ان کی شان ہی اور تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تمام تر آرزومندی میں اور ہماری آرزومندی میں بڑا فرق ہے اس آرزومندی کے اظہار کے لئے جن استعاروں کی ضرورت تھی ہم تینوں انہی کی تلاش میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہی استعارے، ان پیچ در پیچ مسائل کے اظہار کے لئے کافی ہیں جن تک ہماری نظر پہنچتی ہے۔

آپ نے اپنے خط میں "جدید شاعری کے رموز اور اسرار" کا ذکر کیا ہے۔ جس کی "دھجیاں" ترقی پسندوں یا کسی اور شاعری کی "قبائے تنگ" کا پیوند نہیں بن سکتی تھیں۔ ہو سکے تو ان رموز و اسرار کی مزید تشریح کر دیجئے تاکہ مجھے مزید روشنی حاصل ہو۔

جناب ساقی فاروقی کے نام — مخلص:۔ راشد

عزیز ساقی۔ تمہارے مکرّر آنکہ (پوسٹ سکرپٹ) کا جواب الگ دے رہا ہوں۔ کیونکہ اس کا ہماری ادبی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے خیال میں پاکستان کی بقا یا اُردو کی بقا کے بارے میں دولتانہ صاحب سے سوال بے موقع تھا۔ ایک تو وہ پاکستان کے سفیر ہیں۔ ان کا جواب رسمی اور سرکاری ہی ہو سکتا تھا۔ دوسرے

وہ کوئی ایسا جواب کیوں دیتے جس سے بددلی PESSIMISM کا اظہار ہوتا تیسرے سفارت خانے کے ماحول میں وہ پیش پا افتادہ جواب ہی دے سکتے تھے چوتھے تمہارے اُن کے تعلقات میں جہاں تک میں جانتا ہوں وہ راہ و رسم نہیں کہ وہ تم سے کوئی "دیانتدارانہ بات کہنا ضروری سمجھتے۔ پانچویں وقت کم تھا چھٹے میں خاموش نہیں ہوا، بلکہ میں نے اس سوال کو تضیع اوقات جان کر بات کا رخ بدل دیا تھا تم سے بہرحال معافی چاہتا ہوں۔

مخلص۔ راشد

لندن۔ ۲۰ رجنوری ۷۵ء

راشد صاحب۔ آپ کا ۱۵ رجنوری والا خط ملا۔ بصیرت حاصل ہوئی۔ فنی، علمی اور ادبی اداروں کی نایابی اور عزلت پسند معاشرے کی لاپروائی کے باب میں جو باتیں آپ نے کی ہیں وہ خیال انگیز بھی ہیں اور عبرت آموز بھی۔ مگر آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ہم نرم گام لوگ ہیں اور باد مغرب کی سنسناہٹ سے ڈرتے ہیں۔ اور شاید تیز رفتار مغرب کے پس منظر میں ہماری سست رفتاری کے کچھ نئے معانی بھی بنتے ہوں۔ میں گیارہ اور آپ بائیس سال سے ملک سے باہر ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مشرق کے مسائل کے حل کے لئے ہم مغرب کا انداز نظر ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ہم اپنی اصل سے کٹ کر اپنے اندر سمٹ تو نہیں گئے ہیں۔ ذلت اور شکست کے جس دوزخ سے ہمارا پاکستان گزرا، میں اور آپ، دونوں اس کے تماشائی رہے۔ آخر تماشہ بننے کے بھی تو کچھ آداب ہوں گے۔ یہی ذلتیں اور شکستیں تو ادب کی میراث ہیں۔ انہیں ذلتوں اور شکستوں سے تو "ماورا" کا خمیر اٹھا تھا جب تک اپنی مٹی میں اپنے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے نہ ہوں یا ادیب ان تجربات سے نہ گزرے جس سے وہ خطۂ زمین گذرا جس کی خوشبو اس کے مشامِ جاں میں بسی ہوئی ہے تو وہ بڑا ادب پیدا کرنے کا اہل نہیں یعنی وہ لکھے گا تو پھوکی کہ یہ اس کی سرشت ہے مگر وہ جہاں گیری اس کی دسترس سے باہر ہوگی جو اُسے خیز لینے سے آگے نکالے۔ ٹیگور کی آفاقیت سے اگر بنگال کو نکال دیا جائے تو وہ ہوا میں لٹکے نظر آئیں گے۔ کھُلا کہ سرحدوں سے وفاداری ہی آدمی کو سرحدوں سے باہر لے جا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سرحد سے کیا مراد ہے اور مٹی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ کیا آدمی تمام عمر چپک لالے پر لکھے اور لنڈ دآدم پر ادب پیدا کرے۔ آخر وفاداری کے معنی کیا ہیں۔ میری ناچیز رائے میں جب ای۔ ام۔ فورسٹر

صاحب دوستی پر ملک کو قربان کرنے کی بات کرتے ہیں تو وہ ملک سے غداری نہیں کر رہے بلکہ یہ تو اس ادب، فلسفے، نگر اور زمین سے وفاداری ہے جس کے باعث انہیں سوچنے کی یہ جسارت ہوئی (اور کسی نے انہیں قتل بھی نہیں کیا) سرحد اور سرحد میں بڑا فرق ہے۔ ادیب اور شاعر کی سرحدیں عام آدمیوں کی سرحدیں سے مختلف ہوتی ہیں (یاد رکھیئے کہ عام آدمیوں کی مزید تحقیر کے لئے ای ای کمنگس نے "عام" اور "آدمی" کو ملا کر MOST PEOPLE لکھا ہے) ادیب اور شاعر جب عام آدمیوں کی سرحدوں کو اپنی سرحدیں سمجھنے لگتا ہے تو "شکوہ" اور "جواب شکوہ" لکھتا ہے۔ پانی پت کے سنڈاس سے "مسدس" کی عفونت پھیلتا ہے اور ماڈل ٹاؤن میں ہنہنا کر "شاہ نامہ اسلام" کی دولتی جھاڑتا ہے۔

بیدار ادیب اور شاعر اپنے گرد اپنے ادب اپنے ماضی اور اپنے کلچر کا حصار بناتے ہیں۔ اور اسی حصار سے اپنی طاقت اخذ کرتے ہیں۔ اسی طاقت سے حصار سے پرے دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی تمنا انہیں عام آدمیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ چاہے ترکی میں رہے چاہے برازیل میں، جب تک وہ اپنے حصار میں ہیں انہیں بیرونی حملوں سے کوئی خطرہ نہیں خطرہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کسی احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔ اور حصار پر اعتبار نہ رہے۔ یہی بے اعتباری انیس ناگی اور افتخار جالب جیسے لونڈوں کو پیدا کرتی ہے جو اپنے اپنے ٹنڈو آدم میں بیٹھے لندن، پیرس اور نیویارک سے خیال اور اسلوب کی بھیک مانگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے سورج اس وقت تک روشنی نہیں پہنچاتے جب تک اپنے چاند سے گہری آگاہی نہ ہو۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

جب آپ بین الاقوامی ادب کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حصار ٹوٹ کر ایک ہو جائیں اور اپنی مقامی حیثیت کھو دیں یا یہ کہ ہر حصار اپنی جامعیت باقی رکھے اور دوسرے حصار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ فاصلوں کے سمٹنے کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی عہد کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش میں اپنے ادب اور اپنی زبان کا مزاج بھول جائے۔ کسی ادیب یا شاعر کا دائرہ تاثر یا رسوخ اس کی زبان کے دائرہ تاثر و رسوخ کے باہر نہیں ہوتا۔

میں جب جدید شاعری کی بات کرتا ہوں تو میری مراد اردو جدید شاعری، فرانسیسی جدید شاعری اور انگریزی جدید شاعری ہوتی ہے یعنی کسی زبان کی جدید شاعری صرف اسی زبان کی قدیم شاعری کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اور اسی لئے ایلیٹ کی یہ بات کہ زندہ فنکاروں کی اہمیت

صرف اس ادب کے مردہ فنکاروں کے رشتے سے ہے، بہت دور رس مطالب رکھتی ہے۔ شاعری کا حریر دور تک جدید اور قدیم سے مزدور بنتاہے مگر اس کی معراج یہ ہے کہ وہ حریر ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنی کوتاہ قلمی کے باعث، جدید و قدیم کی بحث کو الجھا دیا۔ آپ کا طعنہ بےجا نہیں۔ بات چونکہ جدید شاعری کی ہو رہی تھی اس لئے میں نے "رموز و اسرار" والی بات لکھی تھی۔ ویسے جدید شاعری کے رموز و اسرار وہی ہیں جو قدیم شاعری کے رموز و اسرار ہوں گے۔ اور ان معنوں میں یہ کلیشے کہ ہر سچا اور اچھا لکھنے والا اپنے زمانے میں جدید ہوتا ہے، غلط نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر گزرتا ہوا لمحہ شاعر کی ذات پر منکشف ہوتا رہتا ہے۔ یہ انکشاف گزرے ہوئے لمحوں کی رہنمائی کے بغیر نہ ہو اور شاعر کی ہنرمندی یہ ہو کہ اس کے عہد کا اسلوب جس طرح اس کی ذات پر منعکس ہو رہا ہے اس کے الفاظ میں ممکن سچائی یا پوری سچائی کے ساتھ آجائے۔ اس لئے ناصر کاظمی کا انکشاف فراق گورکھپوری کے انکشاف سے مختلف ہوگا یا سلویا پلاتھ کی بغاوت ڈبلو۔ ایچ۔ آڈن کی بغاوت سے علیحدہ ہوگی کہ ہر تغیر شاعر کے محسوسات کے ذخیرے میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ مگر پچھلے پچاس سال کے عرصے میں جدیدیت کے معنوں میں بھی تبدیلی آئی کہ اس تغیر میں رفتار کا ہولناک عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اور آج سے پہلے جس نرم روی سے کائنات کی دریافت ہو رہی تھی اس میں بجلی کی سی تیزی آگئی۔ اور نئے علوم اور ترسیل کے نئے وسائل کے باعث، کسی گزرتے ہوئے لمحہ میں، کئی چیزیں ایک دم سے شاعر کی ذات پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اس پیچیدار لمحے کی گرفت کے لئے ظاہر ہے شاعر کی شخصیت کا پیچیدار ہونا بھی ضروری امر ہے۔ میں جب پیچیدگی کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر نظم بھول بھلیاں بن جائے۔ نہیں صاحب نہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب کسی شاعر کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہو تو آپ کو پتہ چلے کہ اس شاعر کی ملاقات بنتے بگڑتے۔ ٹوٹتے پھوٹتے۔ جلتے بجھتے، بے تہہ اور تہہ دار تمام لمحوں سے ہوئی ہے۔ اور اگر ایسا ہوگا تو اس کے یہاں کسی خیال کی چمک۔ کسی احساس کا نرالا پن، کسی لفظ کی تازگی، کسی اسلوب کا بانکپن ضرور نظر آئے گا کہ ن۔ م۔ راشد کا عہد غالبؔ کا عہد نہیں ہے اور نہ ن۔ م۔ راشد غالب ہیں۔

نئے شاعروں کے نام چلّی کے مشہور یا دوسرے مشہور شاعر پارلنے کہ یہ قد اور عمر دونوں میں نرودا سے چھوٹے ہیں، ایک بڑی بانی نظم لکھی تھی اور ختم کچھ اس طرح کی تھی: جو چاہے لکھو، جس طرح چاہے لکھو، صرف ایک شرط ہے کہ خالی صفحے میں اضافہ ضرور ہو۔ اضافہ میں IM PROVE کے معنوں میں لکھ رہا ہوں۔ ہمارے

یہاں سینکڑوں نظمیں لکھی جا رہی ہیں مگر صفحے خالی کیوں ہیں۔ شاید یہ شرط بہت کڑی ہے۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔ وسکی چڑھ رہی ہے۔ اجازت چاہتا ہوں۔ شب بخیر۔

آپ کا۔ ساقی

۳۱۔ مونٹ پلیئر ٹیریس، چیلٹنہم۔ انگلستان

۲۲ مارچ ۱۹۷۵ء

عزیز گرامی۔ آپ کے ۲۰ جنوری کے خط کا جواب اب دے رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ وسط فروری میں یہاں منتقل ہوئے۔ نقل مکان سے پہلے اور بعد کے مسائل کا آپ کو ذاتی طور پر بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ اور میرے لئے ان مسائل کو جواب میں تاخیر کا بہانہ بنانا ضروری نہیں ہے۔ ابھی تک یہ تو محسوس نہیں ہو سکا کہ میں یہاں صدیوں یا برسوں سے رہ رہا ہوں۔ لیکن پرسوں سے ایک حد تک سبکباری کا احساس شروع ہوا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ آپ کو خط لکھنے یا ٹائپ کرنے بیٹھ گیا ہوں۔

اپنے تازہ خط میں یہ کہہ کر کہ "ہم (ایشیائی) نرم گام لوگ ہیں اور باد مغرب (بلکہ ہر ہوا) کی سنسناہٹ سے ڈرتے ہیں۔" گویا آپ نے اپنے اس اندیشے کا حل تلاش کر لیا ہے کہ اردو کے اس دور کے کم از کم تین شاعروں کی شاعری "عظمت سے خالی ہے۔"

میں "مشرق کے مسائل کے حل کے لئے مغرب کا انداز نظر ڈھونڈنے کی وکالت نہیں کر رہا تھا۔ اول تو جس مسئلے سے ہم رو در رو ہیں وہ مشرق کے یا فقط مشرق کے مسائل کا حل تلاش کرنا نہیں۔ دوسرے مجھے مغرب کے تجربے سے فائدہ اٹھانے میں اور "علم کی تلاش میں چین تک جا نکلنے میں" کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آتا میں صرف اس بات کا یقیناً حامی ہوں کہ ہمیں مغرب کے تجربے سے، اس کے سود و زیاں سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ پھر یہ نہ بھولئے کہ آج مشرق و مغرب کے اکثر مسائل یکساں ہو گئے ہیں یا اس طرح ایک دوسرے میں الجھ گئے ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہے۔ یہ آپ نے بجا فرمایا کہ اپنی مٹی میں اپنے قدم مضبوطی سے جمے رہنے چاہئیں۔ لیکن میں اس پر اتنا اضافہ ضرور کروں گا کہ صرف قدم ہی مٹی میں جمے ہونے چاہئیں سر اور منہ اور ہاتھ نہیں۔ ہمارے ہاں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جنہوں نے اپنا سر منہ اور بازو تک اپنی مٹی میں مضبوطی سے جما رکھے ہیں۔ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے اپنا سر دھڑ بڑی حد تک گزرتی ہواؤں میں سانس لینے کے لئے کھلا

لکھا چاہیئے۔ اس کے بغیر اپنے ہی خطے کی خوشبو "مشام جاں" کو چنداں فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

آپ کے اس نظریے سے مجھے اتفاق نہیں کہ "سرحدوں سے وفاداری ہی آدمی کو سرحدوں سے باہر لے جا سکتی ہے" دنیا کی دو قومیں کم از کم ایسی ہیں جنہوں نے اپنی پوری تاریخ میں (عہد حاضر سے قطع نظر) کبھی سرحدوں کا کوئی احترام روا نہیں رکھا۔ یہ دو قومیں یہودی اور مسلمان ہیں۔ اور ان دو قوموں ہی نے دنیا کے بڑے سے بڑے جوہر پیدا کئے ہیں۔ آپ نے ٹیگور کے ذکر میں بنگال کی جغرافیائی سرحد کو وہ سرحد قرار دیا ہے جس سے اس کی "آفاقیت" پیدا ہوئی۔ دوسری طرف آپ (ایک حد تک اکی ایک سانس میں) "عام اور خاص آدمیوں کے درمیان کی سرحد" کی طرف اشارہ کر کے خود ہی سرحد کے لفظ کو نئے معنی پہنا رہے ہیں۔ ایک سرحد کامل طور پر جغرافیائی سرحد ہے اور دوسری اجتماعی یا اخلاقی یا اقتصادی۔ کرن کہتا ہے کہ شاعر یا ادیب کو اپنی اجتماعی اور اخلاقی سرحدوں کو وسعت نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ ان سرحدوں کو وسعت دینے کے لئے اکثر اپنی جغرافیائی سرحدوں کو بھی کھینچتا تانا ضروری ہو جاتا ہے۔ شاعر یا ادیب کی نظر میں (بصیرت کے معنوں میں) جتنی وسعت اور کشادگی پیدا ہوگی اتنی ہی اس کی وفاداری اپنی جغرافیائی سرحدوں سے کم ہوتی جائے گی۔ ہاں ہر شاعر اور ادیب مجبور ہے (اور اس بارے میں ادیب اور عام آدمی میں کوئی فرق نہیں) کہ وہ اپنے شعور اور فراست کے لئے اسی سرزمین کے سرچشموں کا ممنون ہو جس سے اس کا خمیر مایہ اٹھایا گیا۔ لیکن انہی سرچشموں میں عمر بھر غوطے لگاتے رہنا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں سیر و سفر کی سہولتوں نے، مختلف زبانوں اور تہذیبوں سے آشنائی کے روز افزوں ذرائع نے، نئے نئے علمی انکشافات نے۔ کتابوں کی فراوانی نے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ اپنی گردنیں ریت سے باہر نکال کر دیکھیں اور کسی آنے والے طوفان سے نہ ڈریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام اسباب نے انسان کو قوی تر بنا دیا ہے۔ اور اس کی یہ تازہ حاصل کی ہوئی قوت اس کے ان فرائض کو پورا کرنے میں مزید مددگار ثابت ہو رہی ہے جنہیں ادا کرنے کے لئے اسے اس سیارے پر پھینکا گیا ہے۔ آج کوئی انسان کسی "حصار" کے اندر قید نہیں رہ سکتا اور اسی لئے حصار پر "اعتبار" یا بے اعتباری کا سوال دور از کار ہے۔ اگر اردو کے بعض شاعر یا ادیب آپ کے قول کے مطابق "لندن پیرس اور نیویارک سے خیال اور اسلوب کی بھیک مانگتے ہیں" تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہمیشہ تہذیبیں ایک دوسری کے تجربات سے اپنے کام کی چیزیں مستعار لیتی رہی ہیں۔ بلکہ ایک تہذیب کے بعد دوسری اس سے بہتر اور قوی تر تہذیب اس وقت تک

وجود میں نہیں آئی۔ جب تک اس نے پہلی تہذیب یا تہذیبوں کے تجربات سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ یہ سب تہذیبیں جو گذری ہیں اور جو آئندہ نمودار ہوں گی ایک بہت بڑی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جسے ہمارا علم اور بصیرت احاطہ نہیں کر سکتے۔ اگر یونانی فنیقیوں سے، عرب اور یوروپی یونانیوں سے، یوروپی اور ہندی عربوں سے وہ سب کچھ مستعار نہ لیتے جو انہوں نے لیا تو وہ اس پر وہ اضافہ بھی نہیں کر سکتے تھے جس سے ایک نئی ہر بار نئی تہذیب وجود میں آئی۔ آج ہم جو کچھ فرنگی سے مستعار لے رہے ہیں وہ ایک ناگزیر مجبوری تو ہے ہی لیکن اسی میں یہ امکان پوشیدہ ہے کہ ہم کسی نئی تہذیب کے علم بردار ثابت ہوں (''ہم'' کہہ کر میں صرف پاکستانیوں ہی کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ پورے ایشیائیوں کو احاطہ کر رہا ہوں) اصل بات کسی ''سورج'' یا ''چاند'' سے آگاہی کی نہیں، بلکہ دوسروں کے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اور اپنی بصیرت کے حوالے سے اس میں وہ اضافہ کرنا ہے کہ وہ آنے والوں کی راہوں کو منور کرتی چلی جائے۔ ایسی ''بھیک'' جو صرف ایک آدمی کا پیٹ بھر دے کافی نہیں۔ بلکہ کسی فیض جاری سے اکتساب کرنے کے بعد اسے جاری ترفیض میں منتقل کرنا اور کرتے رہنا ضروری ہے۔

ادب کے ذکر میں غالباً ''بین الاقوامی'' کی اصطلاح درست نہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی میں بہت سی قوموں کا اور ان کے الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہونے کا شائبہ موجود ہے۔ میں تو ایسے عالمگیر یا عالمی یا آفاقی ادب سے ارادت رکھتا ہوں جو سرحدوں سے بے نیاز ہو اور انہیں پشت پا پھینک دے جو اس انسان سے الجھا ہوا ہو جس کا وطن محض اس کی انسانیت ہے۔ آپ صرف اپنے عہد اپنی زبان اور اپنے ادب اور ان کے مزاج کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب سے وہ مخلوق وجود میں آئی ہے جس کی دو ٹانگیں دو ہاتھ ایک سر اور اس سر کے اندر نہایت پیچیدہ قسم کی کلیں ہیں ایسی کلیں جو اس لئے وہاں ڈال دی گئی ہیں کہ اس کی جسمانی اور ذہنی تخلیق کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے اور پھر ان سب سے بڑھ کر جس کے ساتھ ایک ایسا تھیلا لگا ہوا ہے جو ہر چیز کو ہڑپ کر جاتا ہے اور جسے ہڑپ کرنے کے قابل کوئی چیز نہ ملے تو بری طرح کراہنے لگتا ہے بلکہ دوسروں پر حملہ آور ہو کر خود فنا ہونے سے پہلے ان کو فنا کرنے پر تل جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس دن سے سارا مسئلہ تنہا اس مخلوق کی بقا کا ہے۔ اسی مخلوق کی بقا کے لئے سینکڑوں مذاہب ہزاروں فلسفے اور ان پر مبنی ہزاروں سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی سلسلے وجود میں آئے اور ایک مقررہ میعاد میں اس مخلوق کی بقا کو محفوظ کرنے کے بعد اپنی آخری بے حاصلی کی نذر ہو گئے۔ ادیب اور شاعر کا واسطہ بھی

اسی مخلوق سے ہے وہ کہیں بستی ہو وہ" ارتقا کی کسی منزل پر کیوں نہ ہو وہ کسی زبان میں کیوں نہ بات کرتی ہو اور اس کے پیٹ اور ہاتھ پاؤں اور سر و رو کسی قسم کے خوبصورت یا بدصورت اعمال کی طرف اس کی رہنمائی کیوں نہ کرتے ہوں۔ یہی مخلوق جس کے درد ناچیز ذرے ہم اور آپ بھی ہیں وہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلے سے گریز صرف ایسے اعمال ہم سے ظاہر کرا سکتا ہے جو نہ صرف بے سود ہوں بلکہ اس مخلوق کے لئے لہٰذا خود میرے اور آپ کے لئے ضرر رساں بھی۔ اس پس منظر میں یہ سوچنا کہ آدمی عہد کے مزاج کو یا اپنی زبان اور اپنے ادب کے مزاج کو سمجھنے سمجھانے میں لگا رہے تو "بڑا ادب" خود بخود وجود میں آتا چلا جائے گا محض پادر ہوا بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر آپ بار بار "حصاروں" کا ذکر کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے "حصار" نظر نہیں آتے۔ بے شک میری شاعری میں اپنی پاکستانی اصل کی طرف بے شمار اشارے ہیں۔ یہ بھی شاید میرے علم و بصیرت میں تناسب کمی ہی کا نتیجہ ہو۔ لیکن مجھے ہمیشہ انسان اور مجموعی انسان کی آزادی اور مسرت سے واسطہ رہا ہے۔ کیونکہ میں اسی میں اس کی بقا سمجھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اپنے زمانے کی شاعری اور ادب بلکہ اپنے زمانے کا فلسفہ اور اپنے زمانے کی تاریخ سمجھنے کے لئے اس بات پر مجبور ہیں کہ قدیم زبان ادب، فلسفہ اور تاریخ کا علم اور ادراک حاصل کریں محض اس لئے نہیں کہ "زندہ فنکاروں کی اہمیت صرف اس ادب کے مردہ فنکاروں کے رشتے سے ہے۔" بلکہ اس لئے بھی کہ اسی سے ہمیں وہ فراست نصیب ہوتی ہے جس سے ہماری اپنی تخلیقات نمو پا سکیں۔ اور وہ تخلیقات انسانی تہذیب کا جزو بن سکیں۔ جہاں تک میں اردو کی "جدید" شاعری اور "جدید" ادب کو جانتا ہوں۔ اس کے پیروکاروں کا یہ حسن ظن کہ ان کے رشحات قلم اپنا کوئی عدیل کسی زمانے یا کسی خطے میں نہیں رکھتے محض طفلانہ لاف زنی ہے اور اس کو زیادہ اہمیت دینا وقت ضائع کرنا ہے۔ ان میں سے بعض جن سے میری سرراہ ملاقات ہوتی رہتی ہے، مجھے کنوئیں کے مینڈک نظر آئے۔ جو اسی چھوٹے سے گڑھے کو جس کے اندر وہ پیدا ہوئے اور جس میں وہ ہمیشہ قید رہیں گے سمندر سے عظیم تر جانتے ہیں۔ یہ لوگ ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ان کے شعور اور ادراک کی سطح پر لوٹ جائیں۔ پاکستان کے گزشتہ سفر میں ایک نوجوان نے بڑی دلچسپ بات کہی: "راشد صاحب۔ آپ کا فکر ہمارے فکر کے قریب ہے۔ لیکن آپ کی زبان وہی قدیم زبان ہے۔" دیکھا آپ نے اس میں نخوت کے ساتھ کتنی جہالت اور جہالت ہی کی نخوت پائی جاتی ہے؟

مخلص :- راشد

۱۰ر اپریل ۱۹۷۵ء

عزیز ساقی۔ اس خط کے ساتھ ایک خط کی نقل بھیج رہا ہوں جو میں نے ضیا جالندھری کے نام لکھا ہے ہو سکے تو اس کی فوٹو کاپی بنوا کر رکھ لو۔ اور یہ نقل مجھے واپس کردو۔ یا ویسے ہی پڑھ لینے کے بعد لوٹا دو۔

جی چاہتا ہے ہم آئندہ جب ملیں تو ہر صحبت میں ایک نئے شاعر کا کلام مل کر پڑھ ڈالیں بعض کے مجموعے میرے پاس ہیں۔ اور بعض کے تمہارے پاس ہوں گے۔ میں اپنے والے مجموعوں کی فہرست تیار کر رہا ہوں۔ تمہیں ایک نقل بھجواؤں گا۔ ان کا کلام مل کر پڑھنے سے کئی "نکات" حل ہوں گے! کیا خیال ہے؟!

مخلص:۔ راشد

افکار کا ندیم نمبر اگلے ہفتے بھجواؤں گا۔

لندن

۱۵ر مئی ۱۹۷۵ء

راشد صاحب! اب کے آپ کے خط کے جواب میں عمداً تاخیر ہو گئی یعنی وہ نظمیں عنا گیر تھیں جو میں نے پچھلی صحبت میں آپ کو اور عبداللہ حسین کو سنائی تھیں اور کاہلی الگ تھی اس لئے معاف کر دیجئے۔

میں خطوں کے اس سلسلے کو سوال جواب کی کتاب نہیں بنانا چاہتا اور ہر چند کہ ہمارے ادب کے حلال خوروں کی تنقید کے مذبح خانوں میں "جھٹکے" کی رسم عام ہے، مسئلہ بات کو آگے بڑھانا ہے بات کو ختم کرنا نہیں۔ آپ کے ادراک اور میری جہالت کے توسط سے اگر ادب اور ادب کے رشتے سے زندگی کے بارے میں دو نسلوں کے متوازی تعصبات سامنے آجائیں تو شاید بات آگے بڑھے۔ اور جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے ادب کا موضوع آدمی ہے یعنی "آدمی" کا انسان کی طرف سفر۔ اور آدمی کوئی جوہری توانائی نہیں جسے کسی دارالتجربے میں دریافت کر لیا جائے بلکہ ایک متحرک سیمابی جرثومہ ہے۔ اس لئے وہ بڑی سچائی جو آپ نے دریافت کر لی ہے اور وہ چھوٹی سچائی جو میں دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، دونوں کے ایک معنی بنتے ہیں اور ادب میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔

میں نے کب کہا کہ "اجتماعی اور اخلاقی" سرحدوں کو وسعت نہیں دینی چاہیئے بلکہ میں تو ایک قدم اور آگے جانے کو تیار ہوں کہ سرحدوں کو وسعت دینے کے فیصلے کی طاقت بھی ادیب کی سرشت کے

دائرے سے باہر ہے۔

"حصار" "پرا دو سرحد" پر آپ کے گرجنے برسنے کا لطف آیا۔ میرا منشا شاعر کے لئے زنداں بنانا نہیں تھا بلکہ اس المیے کی طرف اشارہ تھا کہ اپنے کلچر اپنی زبان اور اپنی مٹی سے جس والہانہ وابستگی کی ضرورت ہے لوگوں میں عنقا نظر آتی ہے۔ مجھے آج تک کوئی ایسا انگریز شاعر نہیں ملا جس نے اپنی تاریخ اور اپنے ادب کا مطالعہ کئے بغیر، فرانسیسی تاریخ اور ادب پڑھ کر، انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا ہو" بھیک کے سلسلے میں "فیض جاری" والی بات آپ جیسا روشن طبع آدمی ہی لکھ سکتا تھا، بہت دور کی لگی۔ آپ کے غور و فکر کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں مگر اس باب میں آپ نے اس حقیر فقیر کے دو کلیدی الفاظ "گہری آشنائی" شاید نظر انداز کر دیئے فیض کے الفاظ میں ؏

اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

ایک ضمنی بات اور، یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں نے "سرحدوں کا کوئی احترام روا نہیں رکھا" وطن کی تلاش میں ملک ملک کی ہجرت اور بات ہے مگر "یروشلم یروشلم" اور "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" والی کراہیں تو آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ اور جب تک آدمی کراہتا رہے گا سرحدوں کا احترام باقی رہے گا کہ یہ سرحدیں اسے ورثے میں ملی ہیں۔ ماضی سے قطع تعلق ہوا میں معلق ہونے کے مصداق ہے۔ پھر تو حیوان اور انسان کے درمیان بھی کوئی حدِ فاصل نہ رہے گی کہ یادوں کا یہ ذخیرہ ہی تو انسان کو حیوان سے افضل کرتا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۷۵ء۔ آج صبح سے ہی جی ڈوبا جا رہا ہے۔ بیوی نے کافی نہیں بنائی۔ کار اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ پھر دفتر میں پتہ چلا کہ میری سکریٹری حاملہ ہے۔ رنج اس کا نہیں کہ وہ جا رہی ہے بلکہ دکھ یہ ہے کہ جب وہ حاملہ ہو رہی تھی تو میں کہاں تھا۔ ایسے ناگہانی دن میں فانی کا ایک شعر الگ پریشان کرتا رہا ؎

اپنے دیوانے پر اتمامِ کرم کر یا رب ، در و دیوار دیئے اب انہیں ویرانی دے

عجب پراگندگی اور برہم طبعی ہے۔ غزل پر بات کرنے کا اس سے بہتر اور کون سا دن ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ غزل کیوں؟ جواب یہ ہے کہ اس کا اعجاز اس کے ایجاز میں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں نے غزل لکھنی بہت بعد میں شروع کی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے

ذیم فول نقادوں کی تحریروں کے باعث شک وشبہ میں مبتلا رہا کہ ہو نہ ہو جو صنف سخن ایسے ایسے اہل خیر کو پسند آئے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہوگا۔ یہ بعد میں پتہ چلا کہ غزل کی ایک پرت عوام اور پروفیسروں کے لئے ہوتی ہے۔ اور باقی تمام پرتیں خواص کے لئے مخصوص ہیں۔ میں اپنی ذہنی جلا کے لئے حالی، فراق، عسکری اور سلیم احمد کا ممنون ہوں۔ کلیم الدین احمد والی بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ان کا مطلب یہ تھا کہ غزل تو خیر مبارکباد کی مستحق ہے کہ "نیم وحشی" ہے مگر نظم ایک مکمل وحشی صنف سخن ہے اس لئے ان دونوں پر لعنت اور سب کو نثر لکھنی چاہیئے اور نثر میں بھی تنقید سے شغف کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ نثر آدمی نے اس وقت لکھنی شروع کی جب وہ مہذب ہونا شروع ہوا اور شاعری اس کے دور جہالت کی یادگار ہے جب وہ اپنے بال اور ناخن بڑھائے ننگ دھڑنگ۔ بٹنے کے جنگلوں میں شکار کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔

میں نظم اور غزل کی اس OUT OF DATE بحث میں آپ کا اور اپنا زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا مگر سچائی کے اس لمحے میں ایک اعتراف اور کرتا چلوں کہ اس سلسلے میں آپ کا رویہ قطعی ناواضح ہے اور آپ کی رائے کو اپنی رائے سے بھی زیادہ غیر معتبر سمجھتا ہوں۔ صرف اس لئے نہیں کہ بری بری غزلیں لکھ کر پہلے آپ نے کتاب میں شامل کیں بلکہ اس لئے بھی کہ پھر نکال کیوں دیں۔ مجھے آپ کی محنت کے اکارت جانے کا افسوس نہیں ہے مگر یہ LOVE - HATE والا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر یہ کہ اپنی نظموں میں فارسی غزل کے رول سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس سارے عمل میں مجھے آپ کی خفگی کم اور خوف زیادہ نظر آیا۔

جدید شعرا کے ظہور سے پہلے بے شمار غزل گو اپنی غزلوں پر عنوانات چسپاں کر کے نام نہاد نظم نگاروں میں شامل ہو جاتے تھے۔ میں عبرت حاصل کرنے کے لئے جوش ملیح آبادی کے کئی دیوانوں میں غوطہ لگا چکا ہوں۔ جوش صاحب کی پوری شاعری پر تبصرہ نہیں کر رہا۔ میں ان کی کئی نظموں کا بڑا معترف ہوں۔ مگر ذوق کا یہ عالم ہے کہ ان کا کلام دیکھتے ہی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ آگے کہیں ان پر کھل کر بات ہوگی۔ آپ ہی پہل کیجئے نا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شاعری نظم غزل نہیں ہوتی شاعری ہوتی ہے۔ اور جو اصناف اپنے عہد کو سمیٹنے کی استطاعت نہیں رکھتیں وہ آپ غائب ہوتی جاتی ہیں۔ مثنوی قصیدہ، ہجو اور سہرا ایسی صنفیں انگریزی کے سانیٹ کی طرح مر مرا گئیں یا ہچکیاں لے رہی ہیں۔ غزل زندہ رہی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں جدید حساسیت کو قبول کرنے کے بے شمار امکانات ہوں گے۔ آج انہیں امکانات کی پردہ دری کے

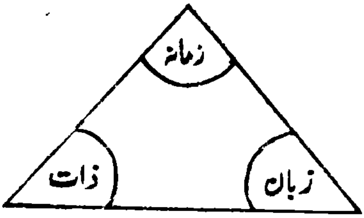
سلسلے میں اردو کی دو اولین جدید غزل گویوں پر گفتگو مقصود ہے۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ نظم و نثر کی تمام اصناف میں غزل وہ واحد صنف ہے جس سے مجھے اپنی شناخت کا سراغ ملتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ناول، افسانے، تنقید اور نظم کی طرح اس کے سرے مغرب میں نہیں ملیں گے۔ یہ عید، شلوار، چغتائی اور لسّی کی طرح ہماری اپنی ہے۔ اپنی ہے اور کھری ہے۔ اور جس طرح تمام موشگافیوں کے باوجود جاپان میں ہائیکو زندہ ہے۔ ہمارے یہاں غزل زندہ رہے گی۔ یعنی پاکولے کی دریافت لسّی کی موت نہیں ہے۔

یوں تو جو سچائی اپنے عہد کے زنداں سے آگے نکل جائے جدید ہوتی ہے۔ ان معنوں میں عیسیٰؑ، محمدؐ، کارل مارکس یا ہومر، بلیک، نطشے یا میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ سب جدید تھے۔ مگر جس جدید غزل کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں، میرے نزدیک اس کی ابتدا یگانہؔ اور فراقؔ سے ہوتی ہے۔ یعنی جدید نظم کے پیش رُوں میراجیؔ، راشدؔ اور فیضؔ سے پانچ سات سال پہلے۔

جدیدیت میرے نزدیک تین مختلف عناصر کا وہ نامیاتی عمل ہے جس سے کسی مصرعے کا خمیر اٹھتا ہے۔ میرا مطلب زمانے کے ادراک، ذات کے اظہار اور زبان کی دریافت سے ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں نظم کی کوئی ایسی بڑی روایت نہیں تھی اس لئے جدید نظم نگاروں کا کام نسبتاً مشکل اور نسبتاً آسان تھا۔ آسان اس لئے کہ ایک تو انہیں اپنے یہاں کسی عظیم روایت کی زنجیریں نہیں توڑنی پڑیں۔ (یہاں خوش قسمتی یا بدقسمتی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔) دوسرے مغربی زبانوں میں اسلوب کی روایت موجود تھی۔ اور مشکل اس لئے کہ انہیں اپنی زبان میں موسیقی، آواز اور لہجے کی ایک بالکل نئی روایت کی بنا ڈالنی تھی۔ یہی نہیں اپنے پڑھنے والوں اور سننے والوں کی ایک نئی کھیپ بھی پیدا کرنی تھی۔ غرضکہ ان کی مصیبت دہری تھی، اظہار بھی اور رسائی بھی۔ مگر جدید غزل کا معاملہ جدا ہے کہ یہاں اظہار کی تخلیقی تبدیلی ضرور رونما ہوئی مگر رسائی مسئلہ نہیں بنی شاید اس لئے کہ فارسی کی بڑی اور اردو کی کڑی کلاسیکی روایت وہ عظیم مقناطیسی قوت ہے جو جدید سے جدید غزل لکھنے والے کو اپنی طرف کھینچی رہتی ہے۔ (ایک بار پھر یہاں خوش قسمتی یا بدقسمتی کی بات نہیں ہو رہی ہے) یعنی ہماری جدید نظم تو عہد کا پس منظر ڈھونڈتی ہے مگر ہماری جدید غزل عہد کے علاوہ روایت کا پس منظر بھی مانگتی ہے۔ اس لئے فراقؔ اور یگانہؔ کو سمجھنے سمجھانے کے آداب، میراجیؔ اور راشدؔ کو جانتے پہچانتے کے آداب سے جدا ہوں گے کہ اسپ تازی کے مزاج سے آگاہی اور رولس رائس

کے کلوں سے آشنائی دو مختلف چیزیں ہیں حالانکہ دونوں سواری کے کام آتے ہیں۔



آیئے زبان، ذات اور زمانے کے اس مثلث کی رہنمائی میں اس جدید غزل کی تلاش کی جائے جس کی ابتدا میرزا یاس یگانہ چنگیزی اور پنڈت رگھوپتی سہائے فراق سے ہوئی۔ اور جیسا کہ تمام ہم عصروں کا مقدر ہے ان کی مشترک قدریں بھی دو ہیں یعنی زبان اور زمانہ۔ میں سمجھتا ہوں فراق کے لہجے کی خواب کاری میر کے لہجے کا فروغ ہے۔

ع ۔۔۔ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام (میر)

ع ۔۔۔ پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے (فراق)

اور یگانہ کی آواز کی بیداری میں غالب کی آواز کا ارتقا نظر آتا ہے۔

ع ۔۔۔ اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا (غالب)

ع ۔۔۔ خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا (یگانہ)

پتہ چلا کہ اپنے زمانے میں سانس لینے کے لئے دونوں شاعروں نے روایت سے رخصت نہیں مانگی، اجازت چاہی ہے۔ اور اس اجازت کے بعد اس تثلیث کے تیسرے عنصر "ذات" کی شمولیت ہوئی جس کے باعث یہ دونوں شاعر اپنے اپنے طور پر زبان کو دریافت کریں گے کہ شاعر کے لہجے کا دوسرا نام شاعر کی ذات ہے۔ اسی ذات کی کارفرمائی یگانہ کے یہاں شعلگی اور فراق کے یہاں ٹھنڈی آگ بنی۔

ع ۔۔۔ الٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی\
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا (یگانہ)

ع ۔۔۔ تو مخاطب بھی ہے قریب بھی ہے\
تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں (فراق)

عہد کے احساس کا ردِ عمل بھی دونوں کے مختلف ہے۔

ع صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
دادرا نمی زیبد بال و پر بر من تنہا (یگانہ)

ع زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محو خواب نہیں (فراق)

ایک کے یہاں شکست سے الجھن بڑھتی جاتی ہے مگر دوسرے کے یہاں آنے والے اچھے دن سے مایوسی نہیں ہے۔

ے پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمیں میں دریا سمائے ہیں کیا کیا (یگانہ)

ے دیکھ رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز (فراق)

حسن و عشق کے بارے میں بھی اگلوں کے مقابلے میں ان کا زاویہ نظر بدلا اور کیسا۔

ے کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا (یگانہ)

مقصد یہ ہے کہ ہم کسی ایک کے نہیں۔ اور لہجہ بتا رہا ہے کہ ہم اس بات پر شرمندہ بھی نہیں ... دمی کسی ایک کا ہوئے بغیر بھی عشق کر سکتا ہے۔ یہ میر کے رویئے سے عشق ... ب نہیں آتا۔ یا غالب ... دیئے سے وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے، سے یکسر ... ب۔ ... دیکھئے سے

وہ ہم سے نہیں ملتے ہم ان سے نہیں ملتے
اک ناز دل آویز ادھر بھی ہے ادھر بھی (یگانہ)

یعنی عشق و شق اپنی جگہ پر ٹھیک ہے مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہم دونوں دو مختلف شخصیتیں ہیں اور اگر رسم و راہ بڑھے گی تو دونوں کا عزت پاش پاش ہو گا۔ اور دونوں بدل لیں گے۔ (یہی رویہ سلیم احمد نے فراق کے یہاں بھی دریافت کیا ہے) اور آگے چلئے۔

ے مجال تھی تمہیں دیکھے کوئی نظر بھر کے
یہ کیا ہے آج، پڑے ہو ملے دلے کیونکر (یگانہ)

دیکھا صاحب۔ ہم ہی گرفتار نہیں ہوئے ہم نے آپ کو بھی بدل ڈالا۔ فراق کے یہاں اس کا اظہار یوں ہوا ہے

زرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی

(عوام نے "شباب" کو "جمال" سے بدل کر شعر بہتر کر دیا ہے اسی لئے عوام کی اصلاح سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور شعر کہتے وقت لفظ کے سلسلے میں کسی طرح کی غفلت نہیں برتنی چاہیئے۔)

فراق کے عشق کے سلسلے میں سلیم احمد کا تخلیقی مطالعہ بہت دلچسپ اور بہت اہم ہے۔ یعنی "عشق ان کے یہاں بہت کچھ ہونے کے باوجود بہت کچھ نہیں ہے"۔ یا "عشق اپنے آپ کو جھٹلائے بغیر ایک سے زیادہ مرتبہ کیا جا سکتا ہے"۔ اور یہ کہ "محبوبہ معمولی عورت بھی ہو سکتی ہے اور راتب بیوی بنا کر بھی چاہا جا سکتا ہے"۔ اس نئے زاویئے کی نیرنگیاں دیکھئے۔

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بھی کچھ امیدیں تھیں (فراق)

یا

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (فراق)

یا

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم (فراق)

یہ خط خاصا طویل ہو گیا ہے یا شاید مجھے طویل لگنے لگا ہے مگر ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور کہتا چلوں پتہ نہیں ہمارے غزل گویوں پر کیا لعنت ہے۔ یگانہ ہوں کہ فراق، ان کے ایک اچھے شعر سے ملاقات کرنے کے لئے پچاسوں لغو شعروں کی بھیڑ میں گھسنا پڑتا ہے۔ طبیعت جھک ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے شاعروں کے تنقیدی ذہن سے سخت شکایت ہے۔ بڑے بڑے شعرائی کتابوں میں بھر کے مجھ جیسے خوش گمانوں کو خوب خوب ذلیل کرتے ہیں۔ ہو سکے تو اپنی ذات کی کہانی بھی لکھیئے گا کہ ان غزل گویوں نے آخر آپ کو بھی تو زک پہنچائی ہو گی؟

بی بی سی والے "س" "ش" کی ماں کا ۔۔۔۔۔۔۔۔ فقط

آپ کا۔ ساقی

۳۰ مونٹ پلیزینٹ پریس، چیلٹنہم، انگلستان

۹ جون ۱۹۷۵ء

عزیز ساقی۔ تمہارا ۱۵ مئی کا خط ملا۔ تمہاری اور میری عمر میں جو فاصلہ ہے وہ اپنی جگہ لیکن تمہاری اور میری سوچ پر تفاوت رہ نسبتاً کم ہے۔ اس میں میں گویا اپنی ہی جواں فکری کو داد دے رہا ہوں تمہیں کسی کہنہ اندیشی کا الزام ہرگز نہیں دے رہا۔ میں تمہارا خاص طور پر اس لئے قائل ہوں کہ تمہارا ذہن معاصر نوجوان شاعروں کے مقابلے میں اکثر نفسی موانع سے آزاد ہے اور تم بے دھڑک بات کہتے ہو جو ایک طرح سے نیازمند کا وطیرہ بھی رہا ہے۔ ادب و آداب اپنی جگہ لیکن ومتہ لائم کے خوف کو جگہ دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

"اپنی زبان، اپنے کلچر اور اپنی مٹی" کی بحث کو زیادہ طول دینا بے کار ہے۔ خاص طور پر جب ہم دونوں اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ یہ تینوں چیزیں کسی شاعر کی تعمیر کے لئے ضروری بھی ہیں اور ان سے لسے کوئی مفر بھی نہیں۔ لیکن کسی شاعر کا انہی میں پھنس کر رہ جانا اُسے زیادہ دور نہیں لے جا سکتا۔ یہودیوں اور مسلمانوں کا کسی سرحد کے احترام سے بے نیاز ہونا بھی اسی ضمن میں لکھا گیا تھا۔ ان دونوں قوموں نے، اور ہمارے زمانے میں یوروپی قوموں نے جو شاندار علمی اور ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تنہا ان کی زبان اور کلچر اور مٹی کے ممنونِ احسان نہیں تھے بلکہ نظر کی اُس وسعت کا نتیجہ بھی ہیں جو اپنی سرحدوں سے نکل کر دوسری قوموں کی زبان اور کلچر اور مٹی سے استفادہ کرنے سے اُن میں پیدا ہوئی۔ عربوں ہی کی مثال لو۔ انہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں یونانیوں، چینیوں، ہندوستانیوں اور اسپانیوں سے کیا کچھ نہیں سیکھا۔ (تمہیں شاید معلوم ہو کہ قرآنِ مجید کی بہت سی حکایتیں تک انجیل اور توریت ہی نہیں بلکہ یونانی اساطیر کی تکرار ہیں) اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے شاعر اور ادیب بلاشبہ اپنے کلچر اور اپنی زبان اور اپنی مٹی کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ کسی سرزمین کا شاعر بھی یہ نہیں کر سکتا۔ لیکن انہیں اُن تہذیبوں سے بھی اکتسابِ فیض کرنا چاہیئے جو ہماری اپنی تہذیب سے فروزاں تر ہیں۔ اس اکتساب سے جو کچھ حاصل ہو یا جو نئی نئی تخلیقات وجود میں آئیں ان کو جانچنے کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ ان میں سے کون سا حصہ اپنے کلچر کا۔ اور کون سا خارجی اثرات کا مرہونِ منت ہے۔ بلکہ یہ کہ اس امتزاج نے کس قسم کی بصیرت اور نیا ادراک بخشا۔

تم نے اپنے خط میں اُردو کے مشہور لکھنے والوں کو "ڈیم فول نقاد" کہہ کر انہیں بڑی داد دی ہے حالانکہ وہ محض بیدل ہیں اور ان کے پاس زادِ راہ بھی کم ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر جدید شاعری کو روشناس کرانے

ہیں خاصی محنت اور ہمت صرف کی ہے۔ اگر یہ تمہارے قول کے مطابق "ڈیم فول نقاد" بھی ہوں تو ان سے ڈیم ف
نقادوں کو صرفِ نظر کرنا درست نہیں۔ اگر کلیم الدین احمد کہیں زندہ ہوں تو انہیں لعن طعن کرنا یا انہ
کوئی نیک مشورہ دینا تو بے کار ہوگا۔ کیونکہ کوئی نصیحت یا علم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ البتہ اکثر جی چاہ
ہے عزیزی مجتبیٰ حسین کو لے پالک بناؤں یعنیہ جیسے سیماب اکبر آبادی نے یا دش بخیر ساغر نظامی کو لے پا
بنا رکھا تھا۔ اسے لکھنا پڑھنا سکھاؤں اور اس کی تربیت کروں۔ اور جب وہ کم از کم شعر سمجھنے کے قابل ہو
تو اسے واپس گھر بھجوا دوں! اس میں سیکھنے کی صلاحیت ہے لیکن اسے پیار سے سکھانے والا کوئی نہیں ملا
تم غزل کے بارے میں اس لئے شبہات کا شکار ہوئے تھے کہ اول الذکر دو "نقادوں" نے اس کی ت
کی تھی۔ اسی طرح جدید نظم کے بارے میں انہوں نے جس حسنِ ظن کا اظہار کیا تھا اس نے برسوں مجھے
جدید شاعری کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا رکھا۔ کوئی نقاد آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو اچھے شا
بُرا اور بڑے شعر کو اچھا بنا دے۔ یا بُرے شاعر کو زندہ جاوید کر دے اور اچھے شاعر کو موت کے گھاٹ
دے۔ اگرچہ سب "نقاد" دل میں سمجھتے یہی ہیں۔ تنقید بے شک نہایت مفید کام ہے لیکن اس میں سب
بڑی خرابی یہ ہے کہ اسے نقاد لکھتے ہیں! تنقید نقادوں کے بس کا روگ نہیں۔ شعر کو شاعر سے زیادہ اور اد
کو ادیب سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ ادراک اور شعور کے جن راستوں سے شاعر اور ادیب شعر و اد
کو سمجھتے ہیں وہ پیشہ ور نقادوں کو کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔

تم نے غزل کی بات چھیڑی یا غزل چھیڑ دی ـــــ مجھے ساز دینا ـــــ لیکن میں اپنے ساز پ
تک غزل نہیں گا سکا۔ اس کی طرف تم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ میں جوش ملیح آبادی نہیں ہوں کہ مجھے غ
سے (یا کسی صنفِ سخن سے) کوئی عناد ہو۔ جوش کے اس عناد کی بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ خود غزل
رہ چکے ہیں۔ کسی کا اپنی ہی غزل سے نفرت کے باعث غزل سے متنفر ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ ا
آپ سے نفرت اور محبت کا یہ آمیزہ بہت لوگوں میں ملتا ہے۔ میں فضل کریم فضلی بھی نہیں ہوں کہ غزل
والہانہ عشق کا ارتکاب کروں۔ میں غزل کو اظہار کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتا ہوں جو
موسیقی اور بت تراشی ہی کے مانند خود میری دسترس سے باہر رہا ہے۔ اور امیر خسرو جیسے لوگوں پر رشک آ
ہے جو شاعری موسیقی تصوف بلکہ اپنے زمانے کے "روابط عامہ" کے یکساں ماہر تھے۔ اور ہمارے زمانے
ٹیگور جو شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی، مصوری، موسیقی حتیٰ کہ ذاتی تبلیغ و اشاعت جیسے مختلف

کا شہسوار تھا۔ اور ہمارا یہ حال کہ غزل تک کی صناعی پر عبور نہ پا سکے۔ غزل اور نظم میں صرف صناعی ہی کا فرق ہے۔ ورنہ ان کے یہاں خانے یکساں ہیں۔ دونوں ایک ہی جیسے پھولوں سے رس لیتی ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کریں تو شعر نہیں کہلا سکتیں۔

ہم نے غزل یا کسی غزل گو کے بارے میں کم لکھا ہے۔ حتیٰ کہ جب حلقۂ ارباب ذوق کے جلسوں میں بھی "ارباب" یا "اہلِ ذوق" کسی غزل پر اظہارِ خیال" فرماتے ہوئے اس کے "بنیادی خیال" کی تلاش میں سرگرداں ہوتا تھا تو مجھے چپ سی لگ جاتی تھی۔ دل میں سوچتا رہ جاتا تھا آیا غزل کو سمجھنے سمجھانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اگر نہیں تو اور کیا طریقے ہونے چاہییں؟ غزل کی زبان سے بحث کی جائے؟ تشبیہوں اور استعاروں کا ذکر کیا جائے؟ الفاظ کی نشست و برخاست پر نظر ڈالی جائے؟ شاعر کے افکار و احساسات کا تجزیہ ہو یا دیکھا جائے کہ یہ غزل گائے جانے کے قابل ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے ہاں غزل کا سب سے اہم استعمال آج تک یہی رہا ہے۔ حتیٰ کہ بے چارے فیض صاحب سے بھی لوگ مشاعروں میں یہی تقاضا کرتے ہیں کہ حضرت وہ والی غزل سنائیے!)

کہتے ہیں شطرنج کی کوئی دو بازیاں یکساں نہیں کھیلی گئیں۔ اسی طرح غالباً کوئی دو غزلیں یکساں نہیں لکھی گئیں۔ لیکن غزل کے سب شاطر کیوں ایک ہی بساط پر ایک ہی جیسے (اور اکثر پٹے ہوئے) مہرے گنی چنی چالیں یاد کر لینے کے بعد کھیلتے چلے جاتے ہیں؟ اس کھیل کے سامنے شاعر نہیں ہارتا، تاہم مزید پڑھنے والے مات کھا جاتے ہیں۔ تم نے یگانہ اور فراق کی غزل کو "جدید غزل" کہا ہے۔ "جدید غزل" "جدید شاعری" کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ غزل کی تمام شاعری اب تک رسم و رواج کی شاعری چلی آتی ہے۔ یقیناً جستہ جستہ ایسے شعر ملتے ہیں جن میں رسم و رواج کم اور شاعر کی انفرادیت زیادہ ہو۔ مثلاً ایسے شعر۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم ۔۔۔ کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

یا

اس عشرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک ۔۔۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

میں یہ نہیں کہتا یہ شعر "عظیم" شعروں میں شمار ہونے چاہییں۔ یا یہی شعرا اردو میں رسم و رواج مقررہ فارمولوں سے بچ کر لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ شاید ایسے بیسیوں بلکہ سینکڑوں اور اشعار نکالے جا سکتے ہوں گے اور ایسے ہی اور شعر اس لئے "جدید" ہیں کہ ان میں شاعر کی انفرادی سوچ اور احساس ملتا ہے۔ درحالیکہ ہماری

شاعری ایک ہی نقشہ کی پیروی کرتی چلی جاتی ہے۔ اور کم ہی کوئی شاعر سوچتا ہے کہ اپنے اشعار میں ــــ وہ غزل کی صورت میں لکھے گئے ہوں یا نظم کی صورت میں ــــ وہ "خود" بھی کہیں موجود ہے یا نہیں۔ فراق اور یگانہ دونوں کی اہمیت میں شک نہیں لیکن تم نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ یہ دونوں "جدید غزل" کے بانی ہیں؟ کیا یہ دونوں بھی اسی تنگنائے میں پھنسے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ جس میں ہر پرانا غزل گو پھنسا ہوا ہے؟ ان دونوں نے فلسفے اور تصوف کی اصطلاحات کا جو لبادہ پہن رکھا ہے اس وجہ سے وہ ایک حد تک معتبر نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن تم نے نہیں دیکھا کہ دونوں اپنے اپنے طور پر کتنے کلیشوں کا بار اٹھائے پھرتے ہیں؟ اور یہی نہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا پورا فکر اور احساس ان کے رسمی اور مشینی یا اتفاقی الفاظ اور تراکیب بلکہ قافیوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس حد تک بھی ان کا اپنا ادراک اپنا شعور اور اپنی بصیرت تھی اسے انہوں نے دوسروں سے مستعار لئے ہوئے ادراک اور شعور اور بصیرت کی تہوں کے نیچے دبا رکھا ہے۔ یہ صرف کہیں کہیں اپنے قافیے ہی کی مدد سے ان تہوں کے نیچے سے سر نکال کر ہمیں دیکھ لیتے ہیں۔ یہ دراصل ہر زمانے میں ہر لکھنے والے کا مسئلہ رہا ہے کہ وہ اگلوں کے خیالات اور الفاظ سے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کو کیونکر محفوظ رکھ سکے۔ بعض اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں اکثر نہیں ہو پاتے۔ اور بعض صرف ایک حد تک۔

یگانہ کی "نشتر یاس" اور "آیات وجدانی" یہاں انگلستان میں میرے مختصر سرمائے میں مجھے نظر نہیں آئی۔ بعض پرانے مجموعوں اور رسالوں میں مجھے یگانہ کے کچھ انتخابات مل گئے ہیں۔ مجھے مرزا سے شرف ملاقات بھی حاصل رہا ہے۔ ان کا کلام بھی میں نے بہت سا ان کی زبانی سن رکھا ہے۔ انہوں نے ایک زمانے میں کسی رسالے میں (شاید "نیرنگ خیال" کے کسی شمارے میں) جدید شاعری کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ اس میں حسب عادت یہاں تک لکھ دیا تھا کہ "جس کاغذ پر یہ جدید شاعری چھپتی ہے میں اسے اپنے ساتھ پیخانے میں بھی لے جانا گوارا نہیں کرتا۔" اس کے بعد جب وہ دلی آئے اور ہم نے ان کے کلام کی آل انڈیا ریڈیو میں ریکارڈنگ کی تو ان سے جدید شاعری کے بارے میں خاصی گفتگو ہوئی جب نہیں مانے تو کسی نے کہا۔ "مرزا صاحب۔ راشد صاحب جدید شاعری کے "علمبرداروں" میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ان سے ان کا کلام کیوں نہیں سن لیتے؟" کہنے لگے: "بھئی میں بوڑھا آدمی۔ میں یہ کلام سن کر کیا کروں گا؟ اور پھر راشد صاحب تو ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہو نہ ہو اہل پنجاب نے رشوت دے رکھی ہے تاکہ اردو شاعری کو خراب کریں!" اس پر خاصا قہقہہ پڑا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مرزا کہنے لگے: "اچھا بھئی کچھ سناؤ۔" تو میں نے اپنی نظم "بے کراں

رات کے سنانے میں" انہیں سنادی۔ سن کر بولے: "ارے اس میں قافیہ نہیں تھا؟ ایک بار پھر پڑھو" میں نے دوبارہ پڑھی اور بولے" ہاں کوئی قافیہ تو نہیں تھا ایک بار اور سنا دو۔" جب تیسری مرتبہ سنی تو اٹھے اور مجھے گلے لگالیا" میاں اگر یہی جدید شاعری ہے تو سبحان اللہ۔ تمہیں حق پہنچتا ہے کہ شعر کہو۔!" یہ اور لوگوں کو بھی تجربہ ہوا ہے کہ وہ سنتے تو بلا کے تھے مگر اپنی "حق پرستی" کے لئے زیادہ بدنام ہوئے۔

سوال یہ ہے کہ وہ جدید غزل گو ہیں یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پہلے تو کسی غزل گو کو جدید کہنا اپنی آپ تردید کرنا ہے۔ دوسرے اگر غزل بھی شاعری ہی کی ایک صورت ہے تو غزل اور نظم دونوں کو جدید کہنے کے لئے ایک ہی قسم کے میزان پر تولنا ضروری ہے۔ سب سے ضروری بات میرے نزدیک یہ ہے کہ شاعری اس وقت تک جدید نہیں ہوسکتی جب تک وہ کلیشے سے آزاد نہ ہو جب تک شاعر فرسودہ اور پیش پا افتادہ الفاظ اور تراکیب کے جال سے باہر نہ نکلے وہ جدید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب تک وہ ان الفاظ اور تراکیب کا غلام ہے شعر اس کے قریب تک آنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کا جدید ہونا تو الگ بات ہے۔ مرزا کے قریب قریب سارے کلام میں گرداب ساحل اور موج، لیلیٰ مجنوں، محمل کارواں اور جرس، زنجیر اور دیوانہ اور چاک پیراہن، پروانہ اور آگ، چرخ ستمگار اور گردشِ لیل و نہار، وحشی اور فصلِ گل، ساقی اور مست اور خمار، نشیمن، قفس اور صیاد، محفل اور شمع سحر وغیرہ کی جانکاہ تکرار ہے اور اس وجہ سے وہ مجبور ہیں کہ نہ صرف اپنے محور کے گرد گھومتے چلے جائیں بلکہ اپنے سے پہلوں کا طواف کئے بغیر انہیں کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ان کے کلام کا سارا تانا بانا فارسی شاعری اور ایک حد تک بیدل اور غالب سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب یوں تو اپنے پیش رووں سے بدرجہا متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ قدما کے الفاظ اور تراکیب ہی پر ساری شاعری کا انحصار ہو۔ اور آدمی اپنے ذاتی تصورات کے اظہار کے لئے اپنے لئے نئی اور اچھوتی تشبیہیں اور استعا کنائے ایجاد نہ کرسکے۔ مرزا نے اپنے آخری برسوں میں بڑی حد تک متداول الفاظ اور تراکیب سے بچ کر "عامیانہ" زبان میں شعر کہنے کی کوشش کی لیکن جونہی انہوں نے اپنا اسلوب بدلا وہ فکر کی گہرائی اور صلابت ذہنی کا فریب بھی ساتھ ہی پارہ پارہ ہوگیا اور اس قسم کے شعر نمودار ہونے لگے۔

مری طرف سے بھی دو ہاتھ اے ترے صدقے دھگڑ کا ناؤ خصم پر اتارنے والے

(اور اس شعر میں بھی خصم عورت کا نہیں مرد ہی کا ہے۔ عجب!)

جہاں تک فراق کا تعلق ہے وہ کلیشے پرستی میں یگانہ سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ ان کے عجز بیان ؟

یہ عالم ہے کہ "ناز" کا لفظ ہزاروں مرتبہ استعمال کر گئے ہیں۔ اور اس کی مدد سے بے شمار ترکیبیں اپنی شاعری میں جمع کر دی ہیں۔ مثلاً نگاہِ ناز، بزمِ ناز، خرامِ ناز، جلوہ گاہِ ناز، حریمِ ناز، پائے ناز، سکوتِ ناز، کوئے ناز، دستِ ناز، لبِ ناز، خلوت گہِ ناز، جبینِ ناز۔ اور محبوب کے لئے، مست ناز، نو بہار ناز وغیرہ ان ناز کے کیا معنی ہیں؟ یہ ایک لفظ کیونکر ہر مرض کا نسخہ بن گیا ہے؟ اسی طرح فراق کو رعنا کا لفظ پسند ہے۔ نرگس رعنا، شاہد رعنا، قد رعنا، اور اسی طرح محبوب کے لئے "شوخ" کا پٹا ہوا لفظ بھی نہایت بے پروائی سے استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ دل گم گشتہ، دل ناکام، دل صد چاک، دل خانماں خراب، دلِ دیوانہ قلبِ تپاں۔ وغیرہ کی تکرار سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ شاعر نے ان ترکیبوں کے استعمال میں کس حد تک سوچ سے کام لیا ہے۔ ان سب کا استعمال اتنا ڈھیلا ڈھالا ہے کہ شاعر کا خلوص اس پر قربان ہو جاتا ہے مزید یہ کہ شیخ و واعظ، ہم نشین، ندیم۔ دوست وغیرہ قسم کے رسوا کردار بھی بار بار آتے ہیں۔ محبوب کے حسن کی توصیف میں فراق نے بے شک اکثر خاصی اپج سے کام لیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اس کا پیکر بھی "پیکر سیمیں" سے کم نہیں اور اس کی نگاہ بھی ہر معشوق کی نگاہ کی طرح "نگاہ ہوشربا" ہے اور اس کا حسن بھی "حسن بے نیاز" ہے۔ اس کی زلفیں بھی شکن در شکن اور شبگون ہیں۔ شاعر قدیم شاعروں ہی کی طرح بغیر سوچے سمجھے "شہید تیغ ادا" ہے۔ ترکِ تغافل، ترکِ تعلق، ترکِ رسوم، ترکِ محبت، ترکِ جفا، عرضِ تمنا، عرضِ الفت، عرضِ نیاز وغیرہ بھی وہی فرسودہ "اصطلاحات" ہیں جن سے پرانی غزل بھری پڑی ہے۔ تکرار کے اسی ہیجے کا نتیجہ ہے کہ فراق کے تمام تر یا بیشتر تصورات اردو شاعری کے معینہ اضداد کے ساتھ بندھ کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کا فکر تھوڑی بہت ذاتی جدت سے قطع نظر انہیں اضداد کے گرد گھومتا رہ جاتا ہے اور فراق کی ساری شاعری کو کچھ اپنی گونج اور کچھ پرانوں کی نقالی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ زندگی اور موت تو بہر حال ہر شاعر سے ذہنی درگیری کا تقاضہ کرتی ہیں۔ لیکن یقین و گمان، خیر و شر، یزداں و اہرمن، کفر و ایمان، یاس و امید ہجر و وصال، خشک و تر، بحر و بر، بہار و خزاں، غم و نشاط، بقا و فنا، زمان و مکان، غمِ جاناں اور غمِ دوراں، شام و سحر، گناہ و ثواب (صواب؟) حسن و عشق، زمین و آسمان، زیر و بم، صورت و سیرت، نور و ظلمت، داماں و گریباں، ذرہ و خورشید، ذات و صفات، چراغ و پروانہ، خار و گل، وجود و عدم نور و نار، قطرہ و دریا، بگاڑ اور بناؤ، ہوس و محبت، قرب و بعد، وغیرہ ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح پیوست رہتے ہیں جیسے حافظ اور سعدی کی شاعری سے لے کر اقبال کی شاعری تک پیوست رہے ہیں۔ اگر

فراق ان کے علاوہ کوئی نئے "جوڑے" تلاش کرتے یا ان کو الگ کر کے استعمال کرتے تو یہ احساس ہوتا کہ انہوں نے ان کے مفہوم پر غور کرنے میں کوئی وقت صرف کیا ہوگا۔ لیکن ان کو بطور شاعرانہ اصطلاحات کے استعمال کر کے انہوں نے ان لفظوں کی قوت کو خطرناک حد تک ضرر پہنچایا ہے۔ یہ تو بہر حال اضداد تھے لیکن بعض تلازمات کو بھی وہ بجنسہ قدما کے مانند یا اپنے سے پہلے شعراء کے مانند بے جان الفاظ اور تراکیب کی صورت میں برتتے چلے جاتے ہیں۔ خواب عدم (موت کے معنوں میں) دشت جنوں (جنون کے معنی میں) چراغ شام غریباں لطف و کرم، کشف و کرامات، مرگ ناگہانی، جور و ستم، شوق نارسا وغیرہ قسم کے حشو و زوائد شاید صحافی نثر میں تو کھپ جائیں شعر میں ان کا رسمی استعمال شعر کے حق میں مہلک سے کم نہیں۔ یوں تو ابھی ابھی ان کے اشعار کا وہ انتخاب جو تم نے مجھے پڑھنے کو دیا ہے دوبارہ کھول لیا۔ ہر صفحے پر ہوش و وحشت، حق و باطل، تدبیر و تقدیر، رنج و راحت، ناز و نیاز، سوز و ساز۔ حتیٰ کہ "محو نالہ" جرس کارواں تک نظر آرہے ہیں۔ بھئی ہم سب ایک حد تک کلیشے کے استعمال پر مجبور ہیں اس کے بغیر اکثر مطلب خبط ہوتا نظر آتا ہے۔ قاری تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے لیکن کلیشے کی یہ بھرمار کسی ادنیٰ شاعر ہی کے کلام میں گوارا کی جا سکتی ہے۔ فراق کے ہاں ایک فلسفے کا طنطنہ بھی ہے۔ ذوق جمال بھی ان کا دوسروں سے الگ اور جرات مندانہ ہے۔ فطرت کے حسن کی طرف بھی نہایت خوشگوار اشارے ہیں۔ مثلاً شبنم کی دمک، مناظر کی چشمک زنی، وغیرہ۔ اکثر تشبیہیں جو انہوں نے فطرت سے اخذ کی ہیں اچھوتی بھی ہیں اور شگفتہ بھی۔ پھر ان کے مختلف الجھاؤ میں سے اس ستارے پر انسان کی تقدیر اور انسانی رشتوں اور ہمارے عہد کی اداسیوں اور پریشانیوں کی طرف توجہ ان کو نہایت حساس شاعر ثابت کرتی ہے۔ جہاں وہ عشق کا ذکر کرتے ہیں وہاں عقل کے بغیر نہیں کرتے (مثلاً داغ کی شاعری عشق سے لبریز ہے لیکن اس میں وہ طرح طرح کی چالاکیاں دکھاتا ہے۔

تم کو ہے وصل غیر سے انکار اور اگر ہم نے آ کے دیکھ لیا!

وغیرہ) غالب کے ہاں عشق اس رفعت پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے کسی ایک ہستی کے جسم سے وابستہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں عشق ایک قوم سے لے کے پورے انسان کے دور میں تبدیل ہو گیا ہے۔ فراق کا عشق جسمانی بھی ہے اور روحانی پرستش تک بھی جا پہنچتا ہے۔ لیکن رہتا وہ ہے ایک انسانی ہستی (عورت) ہی کا عشق۔ وہ پرانے شاعر کی طرح اپنے آپ پر رحم کھانے والوں میں بھی نہیں ہیں۔ (اگرچہ محبوب کے جور و ستم کے تذکرے سے ان کی شاعری بھی خالی نہیں۔ اور تضاد قدر اور گنبد گردوں کا گلہ بھی بدستور موجود ہے)

ن کیا کیا جائے وہ اس مہلک زہر سے جسے کلیشے کہتے ہیں حذر نہیں کر پائے۔

ں جون ۱۹۷۵ء

میں مرزا یگانہ کی غزلیں دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ اور بعض اور باتوں کا خیال آیا۔ دیکھو یگانہ کا ذہن جمالیاتی ور سے تو پاک ہے۔ لیکن کہیں کہیں شعر میں ڈرامے کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خاص طور پر جب "ارے" سے مرع اٹھاتا ہے تو چونکا دیتا ہے۔ فراق کے یہاں بھی یہ "ارے" بہت جگہ آیا ہے۔ لیکن بھرتی معلوم ہوتا ہے۔ وہ جیسے ر الفاظ کی قوت سے بے خبر ہیں اسی طرح اس چھوٹے سے لفظ "ارے" کی قوت سے بھی آگاہ نہیں۔ اس ایک نظ میں یگانہ جو قوت پیدا کر دیتے ہیں وہ اس سیاق و سباق کی وجہ سے جس میں یہ استعمال ہوتا ہے اس میں رامائی اچانک پن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ "صفر" کے مانند قوی تر ہو جاتا ہے۔ یگانہ میں ایک خوبی اور ہے ان کو ی غزل کی "طبعی طوالت" کا بڑا شعور ہے۔ لیکن فراق کو قافیوں سے عشق ہے۔ اپنی گونج خود سننے کا چسکا ہے۔ وہ ہر غزل میں بیت پر بیت اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اکثر غزلیں نوح ناروی کی غزلیں بن جاتی ہیں۔ پھر انہوں نے کئی غزلوں میں سنگلاخ زمینوں میں بھی "اپنے آپ کو" آزمایا ہے۔ بج گئی، رچ گئی وغیرہ اور پر ہ ی اور رچ گئی۔ سوز وطن کی آنچ اور بہار چمن کی آنچ وغیرہ۔ اس قسم کی صناعی (یا ہمارے ایک دوست کے قول ے مطابق اس قسم کا فنتا پا) اس زمانے کے ذہن سے دور ہے۔ جسے اپنے اندر ڈوبنا آتا ہو۔ اسے اس قسم کی ناکہنیت کے لئے فرصت کہاں ملے؟ یہ نمائش کاری فراق سے کم درجے کی کوشش ہے۔ اور کچھ نہیں۔

تاہم یگانہ اور فراق دونوں بڑی ہوشمندی کے ساتھ فلسفے اور تصوف کی بلندیوں کی طرف نگاہ اٹھا اٹھا ر اپنی ذات کا تزکیہ اور پڑھنے والے کا تنقیہ کرنا خوب جانتے ہیں۔ ان کے ہاں روائتی شاعر کے مانند خدا کے ساتھ ساتھ عورت کا ذکر بھی ہے (تذکیر کے ساتھ) لیکن ان میں سے کسی پر عہد حاضر کے ان نفسی انکشافات کا اثر نہیں ملتا جو انسان کے خدا کے ساتھ یا عورت کے ساتھ رشتے کے ادراک میں مدد دیتے ہیں۔ یہ دونوں شاعر دراصل خدا اور عورت کے درمیان جھولتے رہ جاتے ہیں۔ دونوں ہی انہیں کام کی چیز نظر آتے ہیں لیکن دونوں میں انتخاب مشکل ہے۔ یگانہ عورت کو اکثر دھتکار دیتے ہیں خدا کو نہیں، فراق اس کے برعکس خدا اور اس کے لوازم سے چشمک رکھتے ہیں عورت سے نہیں۔

لیکن یہی مسئلہ ہر صوفی شاعر کو درپیش رہا ہے۔ غالب اور اقبال تک کو۔ خود میں اپنی تمامتر جدتوں کے

باوجود جن کے لئے بدنام رہا ہوں۔ اس روایتی مسئلہ سے دامن نہیں بچا سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کے انسان کا مسئلہ نہیں رہا۔ لہذا یگانہ اور فراق اسی حد تک جدید ہیں جس حد تک ان کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے جدید غزل کی بنیاد کیسے رکھی یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید غزل بھی جدید نظم کے مانند اس وقت شروع ہوئی جب شاعر قدیم شاعر کے رسم و رواج اور لوازم شعری سے آزاد ہو گیا۔ اسی لئے یگانہ اور فراق سے نئی غزل کو شروع کرنا مشکل ہے۔ کس سے جدید غزل شروع کی جائے، یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہے، لیکن کسی کو جدید غزل یا جدید نظم کا "بانی" قرار دینا ضروری کیوں ہو؟ ہم سب ایک ہی دریا کی لہریں ہیں۔ کبھی کوئی لہر اونچی اٹھتی ہے کبھی کوئی۔ اور پھر دریا کے ساتھ ساتھ یعنی دریا کے اندر سب مل جاتی ہیں اور دریا بن جاتا ہے۔ اور دریا سمندر بن جاتا ہے۔ (کیسی پیش پا افتادہ متصوفانہ باتیں کر رہا ہوں)

یگانہ اور فراق دونوں کے کلام میں مجھے تعلی کے وہ عناصر بھی نظر آئے جو محض "خودی" کے اظہار سے بالا یا پست تر ہیں۔ جدید ذہن اس قسم کی خود نمائی کا قائل نہیں۔ بلکہ جہاں کہیں دیکھو ایک نیا علم اور نیا انکسار نظر آئے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے جو دریافت کیا ہے وہ ضرور قابل قدر ہے۔ صرف کم درجے کے لوگ اپنی زندگی میں اپنے آپ کو عظیم کہلانے لگتے ہیں۔ جیسے بعض لوگ اپنی ہی زندگی میں اپنا مقبرہ یا بت تیار کرا رکھتے ہیں۔ دراصل انہیں یقین نہیں ہوتا کہ ان کی موت کے بعد کوئی ان کے حق میں کلمۂ خیر کہہ سکے گا۔ یگانہ اور فراق میں میناروں پر اپنا نام کھودنے والوں کا طفلانہ پن موجود ہے۔ لیکن یگانہ اور فراق کے عشق میں مجھے ایک فرق نے چونکا دیا۔ فراق شروع سے آخر تک ایک نیازمند عاشق رہتا ہے۔ لیکن یگانہ جلالی فقیر ہے جو دھڑلے سے مانگتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے منہ سے جھاگ نکالتا ہے۔ دھونس جماتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فراق یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کی حالت کو خود ہی پا جائے۔ اس کی تنہائی پر رحم نہ کھائے بلکہ اپنی ہی تنہائی پر رحم کھا کر اس سے آن ملے اور اس طرح اس کی نیازمندی کا بھرم بھی کھلنے سے رہ جائے۔

یگانہ اور فراق کی بحث ہو چکی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ بہت سی اردو شاعری کس کام کی چیز ہے؟ کیا اکثر شعر ضرب الامثال نہیں ہیں؟ کیا اکثر شعر شاعر کا رونا دھونا نہیں ہیں، یہ پپیہے کی پکار کے مانند؟ کیا ان کا بہترین استعمال عاشقانہ خط و کتابت ہے؟ کیا یہ بچوں کو نصیحت کرنے ہی کے کام آتے ہیں؟ ان میں کتنے ہیں جو عید کارڈوں یا دستر خوانوں پر لکھے جانے کے قابل نہیں؟ کتنے ہیں جو صرف پہلوانوں کے دنگل یا سینما کے اشتہاروں ہی کے کام کے نہیں؟ کتنے اشعار ایسے ہیں جو قاری کی ذات کا تنقیہ کر سکیں۔ اس کو فکر

اور احساس کی وہ رفعت بخشیں جس سے وہ بے بہرہ رہا ہے۔ اس کو ایک ایسی دنیا میں لے جائیں جہاں وہ خود کو نئے سرے سے پرکھ سکے؟ غزل ہی کا کیا گلہ ہماری نام نہاد جدید شاعری (جس کے بدنام مبلغوں میں میرا بھی شمار ہوتا ہے) ابھی تک وہ قوت فراہم نہیں کر سکی جو شعر کو آئندہ ہزار برس کا سرچشمہ بنا دیتی ہے لیکن ہم اپنی شاعری کو اپنی قوم سے بہتر کیونکر پا سکتے ہیں!

مخلص۔ ن۔ م۔ راشد

راشد نے لکھا:

میری نظم "دریچے کے قریب" کے بارے میں تمہاری تنقید خوب دلچسپ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس ابہام کو کیسے دور کروں جو روز بروز میری شاعری میں پیدا ہو رہا ہے۔ تم نے پچھلے دنوں ALDOUS HUXLEY کے حوالے سے ابہام کی سات نوعوں کا ذکر کر کے میری حوصلہ افزائی کر دی تھی لیکن میرے خیال میں اب اس بارے میں میری حوصلہ شکنی درکار ہے۔ میرے اکثر دوستوں نے جنہیں میں نے اس نظم کی نقلیں بھیجی تھیں خیالات کا تسلسل نہ پا کر مجھے مایوس کر دیا۔ "شمع شبستانِ وصال" بالکل ناگزیر تھا۔ اس لئے کہ اس سے میں نے یہ تاثر پیدا کرنا چاہا ہے کہ نظم کے "واحد متکلم" اور اس کی محبوبہ کی رات مل کر گزری ہے اس کے بعد کے دونوں مصرعے فوراً اس وصال کی لذت کو واضح کرتے ہیں گو یہ ترکیب لفظاً ایک حد تک عامیانہ ہے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ "سمیکوں ہاتھوں، بے رنگ درجنوں خیز" سے بھی ایک ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً اس نظم سے میرا عندیہ یہ ہے کہ میناروں کی رفعت ہماری گزری ہوئی عظمت کا نشان سہی فطرت انہیں ہر صبح چومتی سہی لیکن انہیں کے نیچے ایک نہاں خانوں کا باشندہ پڑا ہے جو ہماری گزشتہ تین سو سال کی ذلت کا جیتا جاگتا نشان ہے۔ شاید ایک حد تک اس کا باعث بھی۔

بازار میں لوگوں کے سیل کے سیل آتے جاتے ہیں۔ ان میں ہر شخص کے اندر خودی ہے لیکن ناتواں۔ اس میں وہ تیزی اور تندی نہیں جو انقلاب کی آگ بھڑکا سکے۔ کیوں کہ یہ سب (اور ان کی طرح میں بھی) پیٹ کے چکر میں مبتلا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ذلت کا ابھی تک کوئی مداوا نہیں۔ جب بے بسی سے صبح شروع ہوتی ہے اسی بے بسی کے ساتھ شام ہو جاتی ہے۔ دُنیا ایک گھومتا ہوا چکر ہے (چرخ گرداں ہے جہاں) اور ہم اس چکر میں مبتلا۔ شاید میری توضیح جو بہ ظاہر غیر ضروری تھی میری نظم کو اور زیادہ واضح کر سکے!

خط بنام آغا عبدالحمید

ن ۔ م ۔ راشد

ہیئت کی تلاش

ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ لوگ تجربوں سے ڈرتے ہیں اور یہ بات ہے بھی صحیح۔ لوگ ہر نئے تجربے سے یوں ڈرتے ہیں جیسے وہ کوئی بھوت ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ایک فرد کی ہستی اس کے اپنے تجربوں ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اور کسی نئے تجربے کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بھوت اس کے ان سب تجربوں کو نگل جائے گا جن پر اُن کی ہستی قائم ہے۔ اور یوں انسان نئے تجربوں سے ڈرتا ہے۔ نئے خیالات یا نئے روپ صرف اس صورت میں ایک عام انسان کو مرغوب ہو سکتے ہیں۔ جب اس کی نگاہوں میں نئے اُفق ہوں۔ اس کے دل میں نئی دنیاؤں کی جستجو ہو، اس کا دماغ اپنے مخصوص ماحول سے مطمئن نہ ہو۔ ہندوستان میں یہ اطمینان جو بڑھتی ہوئی زندگی کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے بہت پرانا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سمندر پار جانے سے یہاں جنم بھرشٹ ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ بدلتے زمانے کے نت نئے اثرات کے ماتحت یا نئی روشنی یا نئے انداز کی تعلیم کے باعث زندگی نئی صورت اختیار کرتی گئی، گو آج بھی ہم سے اکثر کے دل و دماغ پر وہی جمود طاری ہے جو ابلتی ہوئی زندگی اور بڑھتے ہوئے قدموں کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہے۔ عام زندگی ہی کو دیکھئے۔ ہندوستانی مرد نے سوٹ پہن لیا۔ سر پر ہیٹ رکھ لی۔ لیکن ہندوستانی عورت صرف ساڑی تک ہی ترقی کر سکی ہے۔ اگر ساڑی کے بجائے وہ سایہ پہن لے تو اس پر آج بھی انگلیاں اٹھ سکتی ہیں۔ اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ ہندوستانی عورت پڑھ لکھ کر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی عورتوں کے دوش بدوش سماجی اور سیاسی لحاظ سے ترقی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن اگر وہ سائیکل چلانے لگے، کلبوں میں جانے لگے، آزادانہ اپنے مرد دوستوں سے ملنے جلنے لگے تو اس کی اخلاقی حالت کے بارے میں اکثر زبانوں سے ناگوار کلمے ہی سنائی دیتے ہیں۔

شاعری میں نئی طرزِ نگارش کی تلاش بھی بہت سے لوگوں کی نظر میں بداخلاقی سے کم نہیں ہے اور پھر اس بداخلاقی کا درجہ تو اور بھی شدت اختیار کر گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے نئے شاعر تو صورت کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی پرانی روایات کو بھولتے جا رہے ہیں۔ نئے سیاسی اقتصادی اور سماجی نظریوں نے جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے کو ایک کہاوت سے ہٹا کر حقیقت کے راستے پر چلا دیا ہے۔ چنانچہ ادب میں نئی زندگی سے نئے موضوع پیدا ہوئے ہیں اور نئے موضوع اپنے ساتھ لازمًا نئی صورتیں، نئے ادبی روپ، نئی طرزِ نگارش لائے ہیں، نثر کا میدان وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور نظم بھی اب غزل، رباعی، مسدس، مخمس وغیرہ گنتی کی پرانی پٹریوں کو چھوڑ کر ایک ایسی شاہراہ پر چلنے لگی ہے جس سے قدم قدم پر کئی چھوٹے رستوں کی نمود کا امکان ہے۔ اُردو کی پُرانی شاعری یعنی غالب سے پہلے کی شاعری میں غزل ہی ایک ایسی صنفِ سخن تھی جسے شاعر اپنی ذات کا ترجمان سمجھتے تھے۔ لیکن آج غزل یہ ترجمانی کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ کیونکہ غزل جس نظام کی یادگار ہے وہ ختم ہو چکا ہے۔ غزل نے ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی جس میں زندگی صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چلی جاتی تھی۔ غزل اس شاعری کا نمونہ ہے جو سوسائٹی کے ان گنت قانونوں میں بندھی ہوئی تھی۔ آج ان قوانین میں سے بہت کم باقی ہیں، جو ہیں سو اُن میں بھی نئی حرکت، نئی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔

زندگی کے تنگنائے اب بڑھتے بڑھتے ایک طوفانی سمندر بنتی چلی جا رہی ہے۔ سمندر میں نئی لہریں اُٹھ رہی ہیں اور شاعر زندگی کے جوئے کم آب سے نکل کر آزادی کے بحرِ بیکراں کی لہروں کے سہارے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ آج کا شاعر اپنی شاعری کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ بلکہ اس کا آقا بن کر وہ اسے اپنے ڈھب پر چلانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جہاں پرانے زمانے میں شاعری ڈومڈھاریوں اور گانے بجانے والوں کی طرح مجلسوں کی رونق تھی وہاں بھی آج کے شاعر کے ہاتھ میں شاعری ایک قوت اور کارگر ہتھیار بنتی جا رہی ہے۔ اس قوت سے زیادہ کام لینے کی خواہش نے طرزِ نگارش کے نئے تجربات پر شاعروں کو ابھارا ہے۔ ان کے پاس شاعری کو ناپنے کے پرانے پیمانوں کے سوا کوئی پیمانہ نہیں۔ اور اسی کے لئے انہیں کوئی نئی چیز کو دیکھتے ہوئے درمیانی فاصلے کا احساس نہیں ہو سکتا۔ میراجی کی ایک نظم اسی قسم کے ایک کولمبس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے عروض کی کتابوں میں یہ پڑھ رکھا تھا کہ شعر وہ موزوں کلام ہے جس میں قافیہ تو ہو اور بحر کے ارکان برابر ہوں۔ میراجی کی یہ نظم دیکھ کر وہ جھلّا اُٹھا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو پیمانہ رکھ کر مصرعوں کے ارکان برابر کئے، پھر مصرعوں میں قافیے داخل کئے اور پھر ایک مضمون لکھ کر پڑھنے والوں سے پوچھا کہ ذرا خدا لگتی کہنا کہ یوں اس نظم میں چار چاند لگ گئے یا نہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس استدلال

سے وہ لوگ ضرور رقائق اور دقائق سے زیادہ مرعوب ہو جائیں گے جن کے دل میں ہر نئی طرزِ نگارش کے خلاف پہلے ہی سے تعصب موجود ہے۔ اکثر لوگ جدید شاعری پر اس انداز کی تنقید کرتے ہوئے اس ارتقائی عمل کو بھول جاتے ہیں جو کسی ادبی کارنامے کو وجود میں لاتا ہے۔ اسے اس کے لئے موزوں لباس بہم پہنچاتا ہے۔ بلکہ وہ اسے وہی لباس پہنانا چاہتے ہیں جو اُن کے اپنے ذہن میں تیشار شیا موجود ہوتا ہے اور اسے وہ لباس پہنا کر وہ خود ہی لوگوں سے اپنی تنقید کی داد لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر جدید شاعر کے خیالات لازمی طور پر اپنے لئے موزوں لباس کے ساتھ برآمد ہوتے ہیں کیونکہ شعر میں بعض دفعہ انفرادیت کی طرف زیادہ توجہ بھی بے جان الفاظ اور تراکیب کی افراط کی صورت میں ظاہر ہونے لگتی ہے جس سے اسلوب بیان ضرورت سے زیادہ بھی اور غیر متحرک ہو کر رہ جاتا ہے ہر ندرت اس قابل نہیں کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے، جب تک ندرت کے ساتھ جدت شامل نہ ہو وہ محض تکنیک کی بے جان نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ شاعری کی ترقی محض خلا میں قلابازیاں لگانے سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ پرانے اور نئے عناصر کو آپس میں سمو کر نئی تخلیق کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔ نئے تجربات کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس بات کا اعتراف ضرور کرے گا کہ ان تجربات نے تخلیقی ادب کے لئے نئے نئے راستے پیدا کر دیئے ہیں۔ اور یہ کام روایات کی زیادہ زنجیروں میں بندھی شاعری نہیں کر سکتی تھی۔ نئے اصناف سخن کی تلاش ایک نئی تحریک کی دلیل ہے یہ الگ بات ہے کہ اس تحریک کے باعث ہمیشہ متحرک اور شگفتہ چیزیں وجود میں نہ آئیں۔

نئے ادب کی تحریک (اپنے وسیع معنی میں) اور طرزِ نگارش کے تجربات کا ایک طرح سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں ادب کے چہرے سے تصنع کا پردہ ہٹانا چاہتی ہیں۔ ادب کو وضع داری کے دلدل سے نکالنا چاہتی ہیں، شاعری کو اپنی اعصابی بیماریوں سے نجات دلانا چاہتی ہیں، شعر کو شخصی ملکیت کے درجے سے بلند کر کے عالمگیر اور آفاقی بنانا چاہتی ہیں۔ شاعری کو افراد کے شخصی تجربات کے بجائے تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات کے اظہار کا ذریعہ بنانا چاہتی ہیں۔

اُردو میں طرزِ نو نگارش کا پہلا تجربہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی بلینک ورس ایک مکمل اور ناتمام کوشش سہی لیکن آج بھی ہماری شاعری میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ گو اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر کا نام بھی کم اہمیت نہیں رکھتا شرر نے شیکسپیر کے انداز میں ڈرامہ لکھنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آزاد نظم کی ابتدائی صورت پیدا کی۔ اور اپنے رسالہ "دلگداز" کے ذریعے اس کی ترجمانی کر کے کئی ماہ تک اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اور مختلف

حلقوں سے اس نئی چیز کے بارے میں رائیں بھی طلب کیں۔ لیکن ان رائیوں سے شرر کی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ شرر کا تجربہ ناکام رہا۔ لیکن آج کل کے نوجوان شاعر کو ہمت افزائی کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے میں بہت زیادہ جرأت اور ہمت پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئی صورتوں کی مخالفت کے باوجود ان کے لئے رفتہ رفتہ ایک مستقل جگہ بننے کے آثار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور شرر کے بعد فارم کے تجربے ایک محدود حد تک علامہ اقبال اور ان کے زمانے کے بعض اور شاعروں مثلاً نادر کاکوری۔ نظم طباطبائی اور پنڈت کیفی وغیرہ نے بھی کئے خود علامہ اقبال نے ان تجربوں کو زیادہ فروغ نہ دیا۔ غالباً اس لئے کہ انھیں محض فارم کا شاعر بن کر رہ جانا گوارہ نہ تھا۔ ورنہ انھوں نے بعض ایسی فارسی نظمیں لکھیں مثلاً "نغمۂ ساربان" جن میں قافیوں کی تکرار، مصرعوں کا اختصار اور مضمون کے مطابق بحر کا استعمال حفیظ کی شاعری کا پیش رو بن گیا۔ حفیظ سے پہلے عام طور پر طرزِ نگارش کے تجربات کی محرک صرف اپج کی خواہش تھی اپج نہ تھی۔ حفیظ ہی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے شعر کے اندر چھپی ہوئی موسیقی کو اجاگر کیا اور شعر کے مضمون کے ساتھ اس کا ربط نمایاں کیا۔ حفیظ نے بعض کم رائج بحریں بھی استعمال کی ہیں، لیکن وہ بھی محض جدت کے لئے نہیں بلکہ اس احساس کے ساتھ کہ ان نظموں کے لئے ان تجربوں کے سوا کوئی اور بحر مشکل ہی سے موزوں نظر آتی ہے۔ حفیظ کی شاعری ہی نے سب سے پہلے ہمارے شاعروں کو اس بات کا احساس دلایا کہ شعر میں شعر کا ٹیمپو (TEMPO) یا لَے بھی کوئی معنی رکھتی ہے۔ چنانچہ حفیظ نے سب سے پہلے مضمون کے لحاظ سے لَے کا تعین کیا۔

حفیظ کے ساتھ ساتھ دکن میں عظمت اللہ خاں ایک نئے قسم کے تجربات میں مصروف تھے۔ انھوں نے سنسکرت کے پنگل کا مطالعہ کیا تھا اور اسے اردو میں ترویج دینا چاہتے تھے۔ جہاں حفیظ نے ایسی بحریں استعمال کیں جو بنیادی طور پر اردو کی بحریں ہیں لیکن ہندی کی روح سے بھی ان کی مطابقت ہے۔ وہاں عظمت اللہ نے ایسی ہندی بحریں انتخاب کیں جو اردو میں کھپنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ عظمت اللہ ہی نے سب سے پہلے انگریزی انداز کی بیلڈز لکھیں اور چونکہ ان بیلڈز کا ماحول خالص ہندوستانی تھا اس لئے ہندی چھند ہی موزوں خیال کئے۔ لیکن عظمت اللہ خاں کے تجربات زیادہ نہ بڑھ سکے، البتہ حفیظ کی شاعری نے اردو میں گیتوں کی ایک نئی روایت قائم کر دی حفیظ سے کچھ کم عرصے بعد ہی اردو کا ایک کامیاب شاعر مقبول حسین احمد پوری سامنے آیا اس کے گیتوں میں جنتا کے سنگیت کا جو اثر دکھائی دیتا ہے وہ اس شدت سے کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ حفیظ کے گیتوں میں وہ جامعیت نہیں جو احمد پوری کے گیتوں کی خصوصیت ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں تراش کی خوبی زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن احمد پوری کے

گیتوں میں ایک ایسی گھلاوٹ ہے جو گیت کی جان ہوتی ہے۔

حفیظ کے دوش بدوش اختر شیرانی، بشیر احمد، حامد علی خاں، انسر میرٹھی، ساغر نظامی، ...ش صدیقی، اور محمد حسن لطیفی وغیرہ نے بندوں کی شاعری رائج کی، یہ لوگ کچھ فارسی کے مسمط سے متاثر ہیں کچھ سنسکرت کے چھندوں سے، اور کچھ اپنے ہی پیشرو اردو شاعروں سے، بندوں کی شاعری ہمارے ہاں مسمط کی شکل میں پہلے سے موجود تھی لیکن ان جدید شاعروں نے مسمط کی صورت میں ضمنی تبدیلیاں کر کے اس میں زیادہ ترنم پیدا کیا، ان کی نظموں میں بعض دفعہ پورے مصرعوں کے ساتھ آدھے آدھے مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں جیسے اختر کی نظم "لے عشق کہیں لے چل" میں۔ یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا، جو اس حد تک ضرور کامیاب ہوا کہ اس نے ہماری نظموں میں گیتوں کا سا ترنم پیدا کر دیا۔ پھر ان شاعروں نے بحروں کے ارکان کی مقررہ تعداد میں بھی کمی بیشی کا تجربہ کیا، مثلاً اختر شیرانی کی نظم "خدائے رقص" میں جس میں ۶ فاعلن کی مقررہ تعداد چار کے بجائے چھ ارکان استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ تجربہ جو ایک حد تک پرانے مستزاد کی ٹکنیک پر مبنی تھا زیادہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن ان دونوں قسم کے تجربوں نے موجودہ آزاد نظم کی پیشروی کی، جدید شاعروں میں جنھوں نے ان ابتدائی تجربوں سے حوصلہ پا کر آزاد نظم کی ترویج کی ہے، تصدق حسین، خالد اور میراجی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں نہ صرف مصرعوں کے ارکان کی مقررہ تعداد اور قافیے کی پروا نہیں کرتے بلکہ مصرعوں کو ایک دوسرے سے ملاتے چلے جاتے ہیں تاکہ ایک مصرعے کی معنوی تصویریں دوسرے مصرعے کی معنوی تصویروں سے مل کر گھلتی چلی جائیں اور آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک ہم آہنگی سی محسوس ہونے لگے، میراجی کی نظموں کی مثال ایک کپڑے کے تھان کی ہے جس سے ڈیزائن یا دھاریوں کی رنگا رنگی کے باوجود ایک ہی تاثر پیدا ہوتا ہے، اس کے خلاف اگر آپ نے میری نظموں کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ ان میں اس حد تک وحدت نہیں۔ میں بیشتر مصرعوں کو توڑ کر ان کو مترنم الفاظ سے مربوط اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے آزاد نظم سے شاعری میں خیالات کے آزاد تسلسل کے ساتھ جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اپنے بارے میں اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری شاعری پرانی روایات سے بالکل آزاد ہو چکی ہے کیونکہ ابھی تک نہ صرف غزل باقی ہے بلکہ جدید تجربات کے خلاف تعصب کا زور بھی کم نہیں ہوا۔ خود ان نئے تجربوں نے ابھی اپنی حیثیت پورے طور پر قائم نہیں کی لیکن ان تجربوں کا اثر یہ ضرور ہوا ہے کہ ہماری شاعری کا پرانا جمود ٹوٹ گیا ہے۔ شاعری میں ایک نئی لچک، ایک نئی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اس لچک اور اس حرکت نے ہماری شاعری میں نئے خیالات اور تاثرات کو ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے اور شاعری کے وہ زیورات جو اس کے زوال کی دلیل تھے کم ہو گئے ہیں۔

نئی نظموں میں تسلسل، جامعیت اور وحدت زیادہ نظر آتی ہے۔ جن پرانے استعاروں اور کنایوں کے ہم سالہا سال سے عادی تھے وہ اب اپنا روپ بدل رہے ہیں۔ نئے کنائے جو ابھی تک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں، آہستہ آہستہ اجتماعی بن رہے ہیں۔ شاعری کو دوسرے فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری، موسیقی، بت تراشی کا قرب حاصل ہو رہا ہے۔ گویا طرزِ نگارش کے ان تجربات نے ہماری شاعری کی رگوں کو ایک ایسا تیا خون بخشا ہے جو اس کے زوال کو دور کر کے اسے از سرِ نو جوان بنانے کی امید دلاتا ہے۔

راشد نے لکھا:

(۱) اس نظم میں میں نے قافیے کے استعمال کا ایک تجربہ کیا ہے، کچھ تو اندرونی قافیہ بندی ہے۔ اور کچھ قافیوں کی تکرار ہے پھر صفحہ ۲ اور ۳ پر بندوں کے آخری مصرع عمداً بحر سے ہٹ کر لکھے ہیں۔ عروضی انہیں غلط کہیں گے۔ لیکن مجھے موسیقی کے ذریعے مفہوم کے تاثر میں اضافہ کرنا مقصود تھا۔ دوسرے صفحے کے بندوں میں جن خوابوں کا ذکر ہے وہ گویا ایشیا، یورپ، امریکہ اور روس کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس صفحے کا آخری بند "سحر گم، شر گم" واضح طور پر اشتراکی "ہمہ غالب" معاشرت سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض الفاظ شاید تمہارے لیے اجنبی ہوں۔ کاہن: کہانت کرنے والا؛ بابل کے "اسمار" MYTHS "جادو" جھاڑ دو انہیں — (PACIFICATION) — "قاضی حاجات" اس شعر کی طرف اشارہ ہے "اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا؛ ستار عیوب و قاضی الحاجاتی!" "غم کی مساوات" گویا (EQUALITY IN MISERY)۔ حافظ کا "مجذوب تنگ جام" اس لیے کہا ہے کہ اس نے بہت کم پی لیکن نشہ زیادہ ہو گیا! معرفت کا نشہ!" جلاجل — گھنگرو یا گھنٹیاں وغیرہ، دریغ، کمزور فغاں اور اسد وقود

(۲) عطا تو انسان، جو خود ادبی خلاق نہ ہو تو دنیا بھر کے ادبی فنکاروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں نہ صرف یہ کہ انہیں منہ لگانا اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں بلکہ انہیں کچوکا مار کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ بڑے آدمی کی تعریف یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی میں بھی کہیں نہ کہیں بڑائی دیکھ لیتا ہے۔ ایسے آدمی سے مل کر ایک عجیب مسرت اور فیضان (INSPIRATION) کا احساس ہوتا ہے!"

بنام آغا عبدالحمید

ن ـ م ـ راشد

نظم اور غزل

چند سال ہوئے ایک نیک دل دوست نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ مشورہ دیا "راشد صاحب۔ آپ اتنے اچھے شاعر ہیں۔ مثنوی کیوں نہیں لکھتے؟" اِس موعظ حسنہ کی سادگی ظاہر ہے۔ میں نے کہا "حضور پہلی بات تو یہ ہے کہ مثنوی لکھنا ضروری ہے؟ دوسرے، اچھا شاعر ہونے سے اس کا کیا تعلق ہے؟ تیسرے، جو اتنی ساری مثنویاں پہلے لکھی جا چکی ہیں آپ انہیں دوبارہ کیوں نہیں پڑھتے کہ از سرِ نو حظ حاصل ہو؟ چوتھے، اگر آپ کو خود مثنوی لکھنے کا شوق ہے تو اس ناچیز کے کندھے پر بندوق رکھ کس لئے چلانا چاہتے ہیں؟ اور آخری بات یہ ہے کہ اگر میں مثنوی لکھ سکتا تو کیوں نہ لکھتا؟" میری اِس گفتگو سے میرے دوست مرعوب ہوئے یا نہیں۔ چُپ ضرور ہو گئے۔ اور اس کے بعد برسوں کی ملاقات میں کبھی اِس موضوع کی تکرار نہیں ہوئی۔

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ غزل لکھ سکتے ہوں وہ غزل کیوں نہ لکھیں۔؟ یا جب کوئی شاعر ہزاروں نظمیں لکھنے کے بعد بھی غزل کہنا چاہے تو کیوں نہ کہے؟ لکھنے کا تنہا جواز فرد کی ذات کا اظہار ہے۔ البتہ فرد کی ذات کے ریشے اس کے زمان و مکان میں گڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے زمان و مکان کی ترجمانی پر مجبور ہے اور اس لئے کوئی نیک دل سے نیک دل دوست بھی اُسے جائز طور پر یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اُسے کیا لکھنا چاہیئے اور کیونکر لکھنا چاہیئے۔ اُس کے سامنے ہزاروں تخلیقات کے نمونے موجود ہیں، بیسیوں زبانوں میں وہ چاہے تو اُن کی پیروی بھی کر سکتا ہے اور چاہے تو اُن سب کو اپنے راستے سے ہٹا کر اپنی الگ راہ بھی نکال سکتا ہے۔ وہ کوئی سا قالب کیوں نہ اختیار کرے اُس کے رہنما اُس کی اپنی ذات ہی کے رنگ و آہنگ ہیں۔ جدید یا قدیم نیاؤں کے رنگ و آہنگ اور رفتار اور لَے اس کے لئے رہبرِ کامل نہیں بن سکتے۔

اِس سے یہ واقعہ یاد آیا کہ برسوں پہلے جب ہم لوگ آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے تھے، ایک مرتبہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین دلّی ریڈیو اسٹیشن پر تشریف لائے۔ میں نے اپنے عزیز دوست تابش صدیقی کا

ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا:" ڈاکٹر صاحب۔ یہ تابش دہلوی ہیں، ہمارے بہت اچھے اناؤنسر، غالب بدایونی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں!(تابش کو اس بات پر بڑا ناز تھا) ڈاکٹر صاحب نے کہا:" لیکن کیا حرج ہے اگر اپنے رنگ میں شعر کہیں؟"___ چنانچہ شاعر کا اصل کام اپنے ہی رنگ میں شعر کہنا ہے۔ اور اُنہی قالبوں میں جو اُس کے رنگ کی بہترین ترجمانی کر سکتے ہوں۔ یعنی اس بات سے اس کا کوئی تعلق نہیں کہ وہ اپنے لئے غزل کا قالب اختیار کرتا ہے یا نظم کا۔ رباعی کا یا مسدس کا۔ اور نظم میں مقفّیٰ اور موزوں نظم کا یا غیر مقفّیٰ ___ اور غیر موزوں نظم کا۔

اس کے علاوہ اگر اس سے پہلے بھی رباعی اور مسدس، مثنوی اور قصیدہ وغیرہ غزل کے ہم رکاب رہے تو آج نظم کی جو نئی نئی صورتیں سامنے آ رہی ہیں وہ غزل کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چل سکتیں؟ اور اگر انگریزی میں بے قافیہ اور بے وزن شاعری کے ساتھ ساتھ سانیٹ یا اوڈ اب بھی لکھی جاتی ہے تو اردو میں غزل یا کوئی اور صنف کیوں متروک ہو؟

میرے نزدیک یہ تصور کہ "غزل کی طرف واپسی" جدید دنیا اور اُس کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے، درست نہیں۔ اس کے اندر کئی منطقی مغالطے شامل ہیں۔ مثلاً اوّل تو یہ بات محلِّ نظر ہے کہ غزل کی طرف بڑھا ہوا رجحان "غزل کی طرف واپسی" کی علامت ہے۔ جیسے روزمرہ زندگی میں فیشن بدلتے رہتے ہیں یا پوشاک کے بعض اجزا پر "تاکید" ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی کہ وہ بھی اس پیہم بدلتے ہوئے انسان ہی کی ذات کا جزو ہے ___ بعض "تاکیدیں" ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ دوسرے، اگر کسی زمانے میں غزل کا رواج زیادہ ہو جائے تو یہ غزل کی طرف ایسی "واپسی" نہیں کہ پھر اس کے بعد کوئی اور واپسی نہ ہو۔ تیسرے، غزل اور نظم ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں۔ اور اُن کے باہمی فرق کو آپ نے جو ریڈیو اور کتاب کے فرق کے مشابہ قرار دیا ہے تو میرے نزدیک یہ تشبیہ کسی طرح جامع و مانع نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں غزل اور نظم کا فرق مختصر افسانے اور ناول کا فرق ہے۔ دونوں کی پہنائی اور رسائی الگ الگ ہے۔ لیکن دونوں کا وجود ضروری ہے۔ ان معنوں میں ضروری ہے کہ جو لکھنے والا ناول کی وسعت کو "بقدرِ شوق" پاتا ہو اُسے ضرور لکھنا چاہیئے۔ اور جس لکھنے والے کے لئے مختصر افسانہ "ظرفِ تنگنا" ثابت نہ ہو اُسے مختصر افسانے پر قلم آزمائی کرنی چاہیئے۔ بلکہ یہ دونوں حضرات ہمارے آپ کے مشورے کے بغیر خود ہی ایسا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ آج تک کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ لو! اب مختصر افسانہ رائج ہو چکا ہے۔

اب ناول لکھنے سے کیا فائدہ؟ یا تم جو مختصر افسانے کے نزول کے بعد اب بھی ناول لکھتے چلے جا رہے ہو تو یقیناً جدید دنیا اور اس کے رنگ و آہنگ سے آنکھیں چرا رہے ہو۔ یا ناول کے باوجود تمہارا مختصر افسانہ لکھتے رہنا آسان کوشی اور سہل پسندی کی عادت کو تقویت دے کر رہے گا!

تاہم غزل ہی کا کیا ذکر؟ آج تو اکثر نظمیں اور ناول اور مختصر افسانے وغیرہ دیکھ کر بھی یہ خیال آنے لگتا ہے کہ ہمارے لکھنے والے "جدید دنیا اور اس کے رنگ و آہنگ" سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ شاید جدید دنیا کے اندر وہ رنگ و آہنگ باقی نہیں رہا جو اُن کو جھنجھوڑ سکے۔ یا شاید ان کی نگاہیں اُس جدید رنگ کو نہیں دیکھتیں اور اُن کے کان اُس جدید آہنگ کو نہیں سنتے جو ہر طرف بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ یا شاید اُس جدید رنگ و آہنگ کی یہی بہترین ترجمانی ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ یا شاید ہم آج جو چیز دیکھ رہے اور سن رہے ہیں وہ زندگی کے اُن قدموں کے نشان ہیں اور ان قدموں کی چاپ ہے جو تیزی سے "رجعت" پا رہے ہیں؟ شاعر غزل کہے یا نظم اُس کے حواس خمسہ انہیں چیزوں کا احاطہ کریں گے جو وہ اپنے آس پاس موجود پاتا ہے اور اُن کی اس حد تک عکاسی کرے گا جس حد تک اُس کی سرشت اور اُس کی تربیت کا تقاضا ہو۔ ایک شاعر پر کیا موقوف پیغمبروں تک نے جس دنیا کی پیش بینی کی وہ اُن کی اپنی سرشت اور ان کی اپنی تربیت ہی کا حاصل تھی۔

عورتوں سے باتیں کرنا" غزل کی محض لغتی تعریف ہے اور اس حد تک ابتدائی کہ غزل جن ادوار سے گزر چکی ہے اس کے بعد اس تعریف پر اعتماد کرنا بے کار ہے۔ ایسی بہت سی غزلیں لکھی گئی ہیں جن میں نہ صرف عورت کی ذات پورے طور پر غائب ہے، بلکہ عورت سے ایک قسم کا عناد پایا جاتا ہے۔ اور ایسی نظمیں بہت لکھی گئی ہیں جو عورت کی محبت میں سرشار ہیں۔ اس لئے یہ حکم لگانا کہ غزل کا "بنیادی مزاج" عورتوں سے باتیں کرنا رہا ہے، درست نہیں معلوم ہوتا، اور اگر یہ بات درست بھی ہو تو عورتوں سے باتیں کہنے کے ہزار رنگ ہیں۔ نہ تنہا فیض اور میراجی نے نظم میں عورتوں سے نئی قسم کی باتیں کی ہیں بلکہ ناصر کاظمی اور ظفر اقبال نے غزل میں بھی۔ اصل چیز جو اردو شاعری میں پہلے بھی کم تھی اور آج بھی کم ہے۔ ذاتی اور انفرادی سوچ ہے، شاید غالب اور اقبال کے سوا کوئی اردو شاعر اس کی کمی سے محفوظ نہیں۔!

غالب جس وسعت کی تلاش میں تھا وہ "بیان" کی وسعت تھی۔ اور بیان کی وسعت کی تلاش ابدی تلاش ہے۔ غالب جیسے عظیم شاعر کے لئے نہ تنہا ایک صنف سخن ہی "ظرف تنگنا" بلکہ ہر صنف سخن

ظرفِ تنگنا" ثابت ہوسکتی تھی۔ ہر لکھنے والے کو ہمیشہ سے یہ مسئلہ درپیش رہا ہے۔ نہ صرف معیّن قالب ہی اس کے لئے سدِّ راہ بن جاتے ہیں بلکہ خود الفاظ بھی اکثر اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ حالانکہ الفاظ ہم سب کے قیمتی اوزار ہیں۔ لیکن یہی الفاظ اکثر ہمارے دشمن بن کر ہمیں ڈرانے دھمکانے لگتے ہیں۔ غالب لفظ کا شہسوار تھا لیکن اس کی مشکل پسندی خود اس بات کی دلیل ہے کہ الفاظ اُسے بھی کسی حد تک بے دست و پا کر کے رکھ دیتے ہوں گے! کوئی لفظ کسی بڑے شاعر کے لئے "بقدرِ شوق" وسیع نہیں ہو سکتا۔

راشد نے لکھا:

(۱) "تمہاری رائے تینوں نظموں کے بارے میں وقیع ہے۔ مجھے ان نظموں میں اپنے انحطاط کا احساس خود بھی ہے۔ شاید یہ سہولت کا تقاضا ہے۔ یوں بھی میں ایک حد تک J.A.RISCHARDS کا قائل ہوں کہ IMAGES شعر کا لازمی جزو نہیں بلکہ اس کی زینت ہیں۔ ان کے سوا وہ مجھے سب سے زیادہ غرض اپنے بعض افکار کے اظہار سے ہمیشہ رہی ہے! ارسال رسالت۔ (COMMUNICATION) کو میں نے اہم جانا ہے۔ میرے نزدیک شاعری محض اصوات یا الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ دوسروں کے افکار میں ہیجان پیدا کرنے کا ترسے مؤثر تر ذریعہ ہے۔"

خط بنام آغا عبدالحمید

(۲) "..... تمہارا اندازہ صحیح ہے کہ شاعری ایک حد تک چھوڑ چکا ہوں۔ بیچاری مر چکی ہے۔ صرف تجہیز و تکفین باقی ہے۔ گزشتہ اگست میں آخری اور شاید "نہایت آخری" نظم لکھی تھی! اس سے پہلے کی نظم جنوری ۱۹۳۷ء کی پیدائش ہے۔ شادی کے بعد کے ان دو سالوں میں صرف یہ دو نظمیں وجود میں آئی ہیں۔

خط بنام عبدالحمید

ن۔م۔ راشد

دیباچہ "راداد"

تم نے مجھے اپنے دوسرے مجموعے "راداد" کا مسوّدہ پڑھنے کو دیا۔ تمہارا ممنون ہوں۔ تمہاری شاعری میں مجھے جو غیر معمولی اُپج نظر آتی ہے اس سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔ اس مجموعے میں جو نظمیں تم نے شامل کی ہیں وہ بیحد دلآویز ہیں لیکن اتنی بھرپور نہیں جتنی پہلے مجموعے کی بیشتر نظمیں تھیں: "پیاس کا صحرا" کی نظموں میں ایک خاص قسم کی کھنک اور چمک تھی، جو نئے مجموعے کی نظموں میں کم ہوتی چلی گئی ہے۔ شاید عمر کا تقاضا ہو۔ یعنی جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی بعض غیر ارادی اظہار ارادی اظہار کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ اور یہ کوئی نرالی بات نہیں۔ پھر "پیاس کا صحرا" میں بڑا تنوع ہے جو "راداد" میں کم ہو گیا ہے۔ تمہاری شاعری کلیشوں سے تو تقریباً پاک ہے لیکن بعض الفاظ (اپنے ہی) تم نے خاصے دہرائے ہیں، خاص طور پر "راداد" میں۔ مثلاً نیند اور خواب، درد، غم، الم، بدن، آنکھیں، آگ یا شعلہ، خوف، آواز، لہو (یا خون) وغیرہ۔ یہ بھی چنداں عیب کی بات نہیں۔ انہی الفاظ کی تکرار سے اسلوبِ بیان (انفرادی اسلوب بیان) متعین ہوتا ہے۔ لیکن ان الفاظ کا دہرانا خطرے سے خالی نہیں۔ انہی سے تمہارے بعض (سب نہیں) نفسی تقاضوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمہارے پہلے مجموعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تمہارا جذبہ غالب خوف ہے۔ اور اسی خوف کے باعث اپنے آپ سے عشق بھی۔ جیسے کوئی کلی کے ڈر سے اپنے آپ ہی سے اپٹ جائے! اس نئے مجموعے میں "خوف" ہے لیکن پہلے سے کم۔ زیادہ نیند اور خواب کی باتیں ہیں۔ کچھ روایتی طور پر درد، غم اور الم کے قصے ہیں۔ (معلوم نہیں ہمارے سب شاعر ولی سے لے کر تمہارے تک، کیوں غم اور الم سے دامن نہیں بچا سکے؟) مجھے محسوس ہوا کہ تم اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود محض رسماً ہی غم کا ذکر کرتے ہو۔ اور صرف ذکر کرتے ہو کوئی فلسفہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اگر فلسفے سے بحث ہو اور غم کو "فلسفیانے" کی کوشش ظاہر ہو تو پھر بھی شاعر کو معاف کرنا آسان ہے۔ ورنہ یہ ایک رسمی تکرار رہ جاتی ہے اور یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ غم و الم کے اظہار سے شعر میں ایک قسم کا جذباتی غلو پیدا ہو جائے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں

ہوتا۔ میں نے تمہاری گزشتہ شاعری میں جو "خوف" کا ذکر کیا اگر تمہیں اس پر اعتبار نہ آئے تو اپنی نظمیں "مردہ خانہ" "سحر زدہ شہر" "زندہ پانی سچا" "جنگ" "نوحہ" وغیرہ دوبارہ پڑھ کر دیکھو۔ غزلوں پر تو خاص طور پر کئی طرح کے اندیشے چھائے ہوئے ہیں۔ جدائی کا اندیشہ ایک حد تک روائتی ہے لیکن تنہائی کا خوف، موت کا خوف، ستاروں کا خوف، سایوں کا خوف، دیواروں کا خوف، رات کا خوف، شہر کا خوف، ویرانی یا صحرا کا خوف، لہو کا خوف، حتیٰ کہ اپنے آپ کا خوف، جگہ جگہ ڈراتا ہے۔ تمہاری شاعری میں پاگل ہو جانے کا خوف بھی ہے۔ پرانی شاعری بھی جنون یا دیوانگی کے خوف سے بھری ہوئی تھی۔ تم نے بھی یہ خوف ورثے میں پایا ہے۔ لیکن ایک حد تک دیوانہ پن کے نئے تصورات کے ساتھ۔ اور بعض جگہ محض محاورے کی خاطر بھی۔ جیسے میں نے اوپر کہا ہے "راداز" کی نظموں میں خوف کے عناصر کسی قدر کم ہو گئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی تم بیشتر اپنے آپ سے لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود جانتے ہو میں تمہاری شاعری میں کن چیزوں کا مداح ہوں؟ سب سے پہلے تمہاری حساسیت اور سوچ کا۔ جو انوکھی اور نرالی ہے۔ نئے شاعروں نے حساسیت اور سوچ کے نئے نئے پہلو دریافت کئے ہیں۔ تم ان سب سے زیادہ زندہ تر اور تازہ تر حساسیت اور سوچ کے مالک ہو۔ دوسرے ایمجری یا تشبیہ سازی میں تم بڑی جدت کے مالک ہو تمہیں قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ بے حد تیز نصیب ہوئی ہے۔ حسِ لامسہ بھی دوسروں کے مقابلے میں (اگرچہ مقابلہ کرنا کوئی تنقید نہیں لیکن اس کے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے) تیز ہے۔ نہ صرف تم اخیار کو لمس کرتے ہو بلکہ اشیا تمہیں لمس کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں وہ لذت نہیں پاتیں۔ کبھی حیرت زدہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور کبھی ڈر کر ہٹ جاتی ہیں۔

ن۔ م۔ راشد

راشد نے لکھا:

اپنی نظم "سومنات" بھیج رہا ہوں۔ ۹ر دسمبر کو لکھنی شروع کی تھی۔ جنوری میں تکمیل ہوئی معلوم نہیں پڑھنے والے اسے کہاں تک "فرقہ وارانہ تنگ نظری" پر محمول کریں گے، تم شائد نہیں؟ سمجھ سکو جو اس میں مضمر ہے۔

خط بنام آغا عبدالحمید

ن م راشد

کے وہ منتخب خطوط جن سے اُن کی شخصیت اور فن کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں

"لیکن میں خطوں کے بارے
میں اس حد تک جذباتی ضرور
واقع ہوا ہوں کہ اُسے دوستانہ
تعلقات کی پائندگی کا راز سمجھتا
ہوں" ـــــــ ن م راشد

خطوط

بنام آغا عبدالحمید
بنام ضیا جالندھری
بنام ڈاکٹر سید عبداللہ
بنام امین حزیں
بنام ڈاکٹر جمیل جالبی

آغا عبدالحمید کے نام

کمشنرز آفس۔ ملتان

۱۳ فروری ۱۹۳۸ء

پیارے حمید

بہت دن ہوئے خط ملا تھا۔ "شاعر درماندہ" تم نے پسند کی ہے نا؟ مجھے امید تھی کہ تم ضرور پسند کرو گے۔ میں ایک اور ایسی اچھی نظم لکھنے کے درپے ہوں۔ اگر لکھ سکا تو! نجانے کیوں دماغ کی "رفتارِ اندیشہ" پہلے سے بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔ کلرکی شادی اور کئی دوسری باتیں۔

میں نے ۲۳ جنوری کو رشید صاحب سے لاہور میں مل لیا تھا۔ تمہارا ذکر ہوتا رہا۔ میں نے شکایت کی کہ حمید ہمیں ملا نہیں۔ گو اُس سے یہ تو اُمید نہیں کہ آئی سی۔ ایس اور کلرکی کا بہت فرق کرے لیکن کم از کم یہ تو ہونا چاہیئے تھا کہ وہ جانتا کہ ایک آئی سی۔ ایس کا ایک کلرک کو جا کر ملنا مؤخر الذکر کے اوّل الذکر کو جا کر ملنے سے نسبتاً آسان ہے!

'یاما' کا ناشر کسی قدر ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ میرے اکثر احباب نے اس کی اشاعت کے التوا پہ مجھے ملامت کے خط لکھے ہیں۔ شاید اپریل مئی تک نکل آئے۔ اگر یہ ناشر رہاشمی بک ڈپو) مئی تک شائع نہ کر سکا تو ناشر بدل لوں گا۔

پھر کب تک ارادہ ہے ملتان آنے کا؟ میں فی الحال چار دن کے لئے سرگودھے جا رہا ہوں۔ والدہ صاحبہ

ان دنوں وہاں ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہیں۔ ۳۱ مارچ کو ایک مختصر افسانہ نشر کرتا ہے۔ میں نے اپنی عمر میں یہ دوسرا مختصر افسانہ لکھا ہے۔ "تکنیک" کے لحاظ سے تو شاید بلند چیز نہ ہو لیکن عوام اسے ضرور دلچسپ پائیں گے۔ معمولی سا گھریلو "رومان" ہے۔

پتہ نہیں تم اس بات کے متعلق کیا رائے ظاہر کرو میں نے بھی حبیب صاحب کے مانند خوش رہنے کا نسخہ دریافت کر لیا ہے۔ گو مجھے یقین ہے کہ ان کے نسخے سے مختلف ہوگا۔ میں اپنا تمام خالی وقت خاکسار تحریک کی تقویت اور فروغ میں صرف کر رہا ہوں۔ میں ملتان کا سالار ہوں۔ اور میرے ماتحت اس وقت پچیس آدمیوں کا ایک دستہ ہے۔ میں اس خط کے ساتھ ایک چھوٹا سا پمفلٹ بھیج رہا ہوں ہم نے حال ہی میں یہ تین معروضات وزیر اعظم پنجاب سے کی ہیں۔ تمہاری ان کے متعلق کیا رائے ہے۔ شاید تمہیں "خاکسار تحریک" کے بارے میں غور و فکر یا مطالعہ کرنے کی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔ ورنہ تمہارے جیسا شخص اسے ضرور پسند کرے (میں ایک دوست سے ولایت میں تمہارے خیالات کی "شدت" کا قصہ سن چکا ہوں) یہ تحریک خالص اور کسی قدر "شدید" اسلام کے سوا کچھ نہیں۔ بے پناہ اور بے ضرر خدمت خلق۔ بے حد اخوت اور محبت۔ عسکری تنظیم۔ اپنے امیر کی بے چون و چرا اطاعت۔ فی الحال اس تحریک کے پیش نظر کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ لیکن بعید نہیں کہ یہ کبھی ہندوستان کی تاریخ میں بے حد اہم حیثیت اختیار کرے۔

تمہارا راشد

کمشنرز آفس۔ ملتان

۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء

پیارے حمید

خط ملا۔ پچھلے دنوں اس قدر مصروفیتیں اور پریشانیاں رہیں کہ خط نہ لکھ سکا۔ حالانکہ تقریباً ہر روز دل میں یہ خیال آتا رہا کہ مجھے حمید کے خط کا جواب دینا ہے۔ ان دنوں ہمیں اپنے "آرمی ہیڈ کوارٹرز" کے اس قدر سخت اور زیادہ حکم آرہے ہیں کہ دم لینے کی فرصت نہیں اگر ذرا حکم عدولی ہو جائے تو سر عام سزا ۔۔۔ درّے!

جناب چغتائی کا ایک خط مجھے بھی ملا تھا۔ "سایہ" کے لئے نظم و نثر کا مطالبہ کیا تھا۔ عمر فاروق کی الگ خط میں "سفارش" بھی تھی۔ میں نے چغتائی صاحب کی خاطر کچھ لکھنے کا وعدہ تو کر لیا ہے۔ لیکن ایک تو

معصر نیتیں اور دوسرے نقطۂ نظر میں تبدیلی۔ بہت کم امکان ہے کہ محض لکھنے کی خاطر کچھ لکھ سکوں۔ اب تو بارہا اپنی گذشتہ نظموں کی یادہ گوئی کی تہہ کو پہنچ کر ان سے کراہت محسوس کرنے لگتا ہوں۔

پنڈی بھٹیاں کے جن صاحب کا نام تم نے پوچھا ہے وہ حکیم جے دیال ہیں سند یافتہ طبیہ کالج دہلی۔ پنڈی بہاؤالدین نہیں، بلکہ پنڈی بھٹیاں (ضلع گوجرانوالہ) ان کا قیام ہے۔ اگر کوئی صاحب وہاں بنفس نفیس جانا چاہیں تو سکھیکے کے اسٹیشن پر اتریں۔ سکھیکے وزیرآباد سانگلہ ریلوے اسٹیشن پر ہے۔ اگر وہ صاحب میرا نام حکیم صاحب کے سامنے لے دیں تو شاید وہ زیادہ توجہ سے علاج کریں گے۔ خط لکھنے کی نسبت خود جانا زیادہ مفید ہوگا۔ وہ شخص کسی قدر بے پرواسا ہے۔ اور لالچی نہیں۔

مجھے اسی سلسلے میں یہ پوچھنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے کہ تم نے ابھی تک کسی "رفیقہ" یا "شفیقۂ حیات" کو کیوں منتخب نہیں کیا؟ کیا انگلستان میں بھی کسی پر نظر نہیں جمی؟ میرا خیال ہے تم کبھی فرانسیسی یا شاید روسی بیوی کرنا چاہتے تھے؟ میں تو امید کرتا تھا کہ تم ضرور ایک عدد ضمیمہ ساتھ لاؤ گے۔

شاید تم خفا ہو جاؤ۔ اور شاید یہ آداب کے خلاف ہو لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان اور بالخصوص ہندی مسلمان کے "زندہ" ہونے کا نسخہ ایک ہی ہے۔ خاکسار تحریک! اگر اس نسخہ کو ہم نے استعمال نہ کیا تو ابدی ہلاکت میں بہت کم مدت باقی ہے۔ خدارا دفتر "الاصلاح" اچھرہ لاہور سے کچھ کتابیں منگوا کر پڑھو۔ یہ اسے "صرف مذہب" نہیں مانتے۔ تمہیں معلوم نہ ہوگا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ صرف آئندہ پانچ سال کے عرصے میں!

تمہارا راشد

کمشنرز آفس۔ ملتان

۲۸ فروری ۱۹۳۹ء

پیارے حمید

بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ ۱۹ فروری کو لاہور میں بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ بات اصل میں یوں ہوئی کہ میں اس تاریخ سے پیشتر اپنا مقالہ نہیں لکھ سکا تھا۔ اور کسی قدر رات گاڑی میں لکھنا پڑا اور باقی دوسرے دن لاہور اپنے ماموں جان کے مکان پر۔ کہیں ڈھائی بجے اسے صاف کر کے فارغ ہوا تو ایک اشد ضروری کام

کے سلسلے میں انہیں علامہ مشرقی سے ملنا تھا۔ وہاں سے واپسی پر جیل روڈ تمہیں ملنے کا خیال تھا لیکن مجھے راستے ہی میں پونے چھ بج گئے۔ اور مقالے کے لئے عین وقت پر بمشکل پہنچا۔ امید تھی کہ تم کم از کم ایک "عزیب شہر کے سخن ہائے گفتنی" سننے کے لئے ضرور آؤ گے لیکن میرا خیال ہے کہ شاید کوئی مغالطہ پیدا ہو گیا۔ اور تم نہ پہنچے در... کے سوا اور کسی دوست کو موجود پا سکا۔

مجھے ۸ مارچ کی صبح کو پھر لاہور آنا ہے اور اگر تم اس دن ہیڈ کوارٹر پر ہوئے تو تمہیں خوب تنگ کروں گا۔ مجھے ۱۰ مارچ کی صبح کو دلی پہنچنا ہے ریڈیو والوں نے ملاقات کے لئے یاد فرمایا ہے۔ کیا تم میرے لئے بخاری کو کچھ لکھ سکو گے؟ بخاری مجھے جانتے تو ہیں۔ لیکن مزید "تعارف" غالباً مفید ہو گا۔ جہاں مجھ سے بے شمار اور بے حد برے آدمی ریڈیو کے محکمے میں کھپ سکتے ہیں اور محض سفارش کے زور پر تو شاید میرے لئے بھی کوئی گوشہ کہیں ضرور ہو گا۔ اگر یہی چیز اس دفتر کے کیچڑ سے نکلنے میں مددگار ثابت ہو جائے تو غنیمت ہے۔

وہ کونسی کاپی ہے جو نظموں کے لئے تم مجھے بھیجنا چاہتے ہو؟ کیا وہ ایسی کاپی ہے کہ اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی؟ اچھا! ۸ مارچ کو تم سے لے لوں گا اور میرا خیال ہے ایسٹر تک تمہیں نظمیں نقل کر کے بھجوا بھی دوں گا۔ اگر اکٹھے امتیاز سے بھی مل لیں تو شاید کوئی بات چیت ہو سکے۔ "نیاز مندان لاہور" کے رسالے کی تجویز کس منزل تک پہنچی ہے؟

تم نے اپنی متوقع شادی کے متعلق مجھے کچھ لکھا تھا۔ مجھے شادی کا قریباً تین سال کا تجربہ ہو چکا ہے۔ شادی برے آدمیوں کے لئے یقیناً اچھی ہے لیکن اچھے آدمیوں کے لئے قطعاً اچھی نہیں۔ اور میں تمہیں اور اپنے آپ کو کسی قدر اچھے آدمیوں میں تصور کرتا ہوں۔ محض جنسی خواہشات کا اظہار تو کئی طریقوں سے ہو سکتا ہے ... بالخصوص لاہور میں ___ شادی کے ابتدائی دن تقیناً خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن بعد کی ROUTINE! توبہ! میں اپنے معاملے میں شادی اور کلرکی کو حکی کے دو پاٹ سے زیادہ نہیں سمجھتا۔

"بر رسولاں بلاغ باشد و بس" (!!!) حبیب بھائی اور رشید بھائی کو سلام۔

تمہارا راشد

معرفت نیوز اڈیٹر آل انڈیا ریڈیو

۱۸۔ علی پور روڈ۔ دہلی

۲ جون ۔ ۱۹۳۹ء

پیارے حمید

دس مارچ سے اس دفتر میں مترجم کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اسٹیشن ڈائرکٹروں کی کسی کانفرنس

پہ یہ فیصلہ ہوا کہ ایک پروگرام اسسٹنٹ کو مترجم بنا کر دیکھا جائے اور قرعۂ فال ہمارے نام پڑا۔ جب میری رائے پوچھی گئی تو میں نے کہا کہ میں ہر حالت میں لاہور کی اسامی کو اور خود لاہور کو دہلی سے بدرجہا اچھا سمجھتا ہوں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھے لاہور کے علاوہ کہیں اور کام کرنے سے احتراز ہے۔ اس لئے مجھے چند دن کے لئے دہلی بھیج کر آزمائش کرلی جائے کہ آیا (۱) مجھے وہ کام پسند آتا ہے یا نہیں اور (۲) محکمے والوں کو میرا کام پسند ہے یا نہیں۔ چنانچہ چند دن سے یہاں پڑا ہوں۔ محترم غلام عباس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہی جو پہلے "پھول" کے اڈیٹر تھے اور اب "آواز" کے ہیں۔ مجھے یہ کام پسند آگیا ہے اور AUTHORITIES کو جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں میرا کام اس وقت تک پورے طور پر مطمئن کر رہا ہے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ میں نے آن کر ترجمے کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب!)۔ اب تھوڑا سا سوال گریڈ کا باقی ہے یعنی پروگرام اسسٹنٹ کا گریڈ ۲۵۰-۱۰-۱۵۰ ہے اور مترجم کا ۲۵۰-۵-۱۵۰۔ میں نے کنٹرولر صاحب سے مل کر کہہ دیا ہے کہ اگر مجھے اپنے گریڈ میں رکھا جائے تو مجھے یہاں رہنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ میرے لئے یہ کام ویسا ہی دلچسپ ہے جیسا پروگرام اسسٹنٹ کا۔ چنانچہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کئی دن سے سر آپس میں جوڑ رہے ہیں لیکن ابھی ٹکرائے نہیں!

اچھا کہو۔ یہ کیسی جگہ ہے؟ یوں تو بڑا برا ہے کہ وہاں تمہیں ROBINSON CRUSOE کی قسم کا بطل HERO ہونے کا احساس ضرور ہوتا ہوگا! الگ تھلگ جزیرہ! دور بہت دور تہذیب اور مہذب لوگوں کی دنیا ہیں۔ جزیرے میں صرف ریت اور کہیں کہیں کھجوریں اور کہیں کہیں آدم ذات! عزیزی بشیر بھی چند دنوں تک دہلی تبدیل ہو کر آرہے ہیں۔ اگر مجھے بھی یہیں رہنے کا حکم ہو گیا تو پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور اب تو ذرا ایک دوسرے سے قریب تر رہنے کی کوشش کریں گے۔ بشیر کو میں نے اچھا خاصا ذہین پایا ہے۔ ابتدا میں اس کے چنداں ہونہار نکلنے کے آثار نہیں تھے لیکن اب تو ماشاءاللہ! اس بزرگانہ رائے زنی کے لئے معذرت! بشیر کو سنا دینا۔

تمہارا راشد

معرفت نیوز اڈیٹر آل انڈیا ریڈیو

۱۸- علی پور روڈ۔ دہلی

۲۱ جولائی ۱۹۳۹ء

پیارے حمید

پچھلے دنوں تمہارا تیز تر اور جذبات سے بھرا ہوا خط ملا۔ بس دفتری زندگی سے اتنی جلدی گھبرا گئے۔ اس

میں شک نہیں کہ تمہارے جیسے آدمی کو اس چکّی میں پسنا کبھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مصروفیتوں کے بغیر زندہ رہنا بھی انسان کے لئے ممکن نہیں۔ تم نے اپنے ملنے والوں کی فریب کاریوں کی شکایت کی ہے۔ میرے خیال میں تمہارے لئے انسانی زندگی کے اُن مظاہرات کے مطالعہ کا موقع ہے جو اپنی پستیوں اور آلائشوں سے اُٹھنے کے قابل نہیں۔ کاش تم لکھو کے افسانوں کو کسی ناول میں لا سکو۔ ہماری خود غرضی کا یہ تقاضہ ہے کہ تمہارے لکھنؤ میں ہونے کا افسوس نہ کریں۔ کیونکہ افسوس ہے تو اس بات کا کہ ہم سے بہت دُور ہو۔ افسوس لاہور میں بھی مفصل باتیں نہ ہو سکیں۔ مظفر گڑھ کے ضلع کے افسروں کو تو موسم گرما میں دو بار پندرہ پندرہ دن کی چھٹیاں ملا کرتی ہیں۔ کیا اس رخصت کے چند دن دہلی میں آ کر نہیں گزار سکتے؟

چہ خوش است از دو یک دل سرِ حرف باز کردن!

ایک نظم لکھی ہے "دریچے کے قریب" بھیج رہا ہوں اپنی رائے سے فی الفور مطلع کرو۔ میرے نزدیک ہمارا "مُلّا" ہماری UNDER WORLD کی شخصیت بن چکا ہے۔ اس نظم میں اس کا ذکر انہیں معنوں میں ہے۔

مخلص راشد

آل انڈیا ریڈیو دہلی

۱۲ اگست ۱۹۳۹ء

پیارے حمید

خط ملا۔ اب مجھے نیوز ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے ہٹا کر پروگرام کے شعبے میں لگا دیا گیا ہے۔ اور ہندوستانی اور انگریزی تقریریں سپرد کی گئی ہیں۔ شاید سنا ہو گا کہ عارف پشاور چلے گئے ہیں پشاور اسٹیشن کے OFFICER IN CHARGE بن کر۔ اُن کے جانے کی وجہ سے مجھے پروگرام سائڈ پر آنا پڑا۔ نیوز ڈیپارٹمنٹ کے دفتر میں زندگی نہایت با قاعدہ، مصروفیت شدت سے کم اور کام نہایت ہلکا پھلکا اور ROUTINE ہونے کے باوجود دلچسپ تھا۔ نئی ہندوستانی زبان کی تشکیل کے لئے نئے نئے الفاظ کی تلاش کافی دلچسپ چیز ہے۔ لیکن اب یہاں کافی دقت ہے۔ صبح سات بجے سے ایک بجے تک تو دفتر میں کام ہوتا ہے قریباً کلرکی۔ بلکہ بیشتر کلرکی ہی۔ کبھی کبھی اس دوران میں دفتر کے موٹر میں سوار ہو کر مقررین کی دریوزہ گری کے لئے بھی نکلنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو دن دوسری سبھا (یعنی دوپہر کی سبھا) پر ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اور دو دن تیسری یعنی رات کی سبھا پر جس میں

نئی دہلی میں رہتا ہوں۔ دفتر سے پانچ چھ میل دور۔ بھاگ دوڑ میں کافی وقت گزرتا ہے۔ نیوز اڈیٹر کے دفتر میں چند ہی دنوں میں چند بھولی بسری کتابیں جو عرصے سے میرے مطالعہ کی منتظر تھیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ اخبار تک بھی سرسری نظر سے دیکھتا ہوں۔ اور کتابوں کا مطالعہ قطعی طور پر ختم ہے۔ ہر پروگرام اسسٹنٹ اس بات کا شاکی نظر آتا ہے کہ اُسنے دو سال سے کوئی کتاب نہیں پڑھی یا تین سال سے۔ بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے روزِ ازل سے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی نہ روزِ ابد تک پڑھیں گے لیکن شاکی ضرور ہیں۔

بخاری سے ملاقات کو ہمیشہ جی چاہتا ہے۔ اور دہلی آنے میں خوشی اس بات کی تھی کہ بخاری سے وقتاً فوقتاً مل سکوں گا۔ اسی بنا پر میں نے یہاں آکر ایک حد تک گھاٹے کا سودا بھی قبول کیا تھا لیکن یہاں حالات نے عجیب صورت اختیار کر رکھی ہے۔ یہاں بخاری سے ملاقات بڑی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ بخاری کے لئے زیادہ ہمارے لئے کم۔ لوگ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ پہلے ہی سے یہ شکایت عام ہو رہی ہے (لیکن قطعاً غلط طور پر) کہ بخاری "اپنے آدمی" محکمے میں بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ میں بھی بدقسمتی سے ان کا شاگرد ہونے کے باعث اس الزام کی لپیٹ میں آ رہا ہوں۔ حالانکہ میری تقرری میں اگر میری کسی دماغی قابلیت کا دخل نہیں تھا تو کم از کم احمد شاہ بخاری بھی اس کا باعث نہ تھے۔ کچھ رشید اور کچھ ذوالفقار بخاری۔ رشید شاید تمہارے کہنے پر اور ذوالفقار میری صرف ادبی شناسائی کے باعث۔ بڑے بخاری نے کم از کم اس تقرری میں زیادہ مدد نہیں کی۔ یہاں تک مشکل درپیش ہے کہ بخاری سے گورنمنٹ کالج کی واقفیت کا تذکرہ کرنے سے بھی اکثر "دوستوں" نے مجھے روک دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بات از حد مضر ہوگی۔

اس کے علاوہ بھی سن لو۔ دہلی کے پروگرام اسسٹنٹ کی زندگی یوں بھی تلخ ہے۔ ایک تو یہاں جوہر کا نام و نشان نہیں۔ نہ موسیقی میں نہ ادب میں۔ میرے خیال میں اس کا بیشتر سبب یہ ہے کہ دہلی ریڈیو اسٹیشن کے منطقے میں ہندو آبادی ہے اور ہندوؤں میں فنونِ لطیفہ کا ذوق جو کچھ بھی تھا اب سیاسیات اور اقتصادیات میں نئی اور عالمگیر دلچسپی کے باعث مٹ رہا ہے۔ چنانچہ دہلی اسٹیشن کے لئے نہ اچھے مغنی ملتے ہیں نہ اچھے مقرر۔ اور ہمیں سب اسٹیشنوں سے زیادہ اپنی ساکھ قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ یو۔ پی اور دہلی کے مقابلے میں پنجاب ادبی اور فنی جوہر سے بھرا پڑا ہے۔ دہلی یونیورسٹی میں ایک پروفیسر ایسا نہیں جس کی بات دھیان دیا جا سکے۔ یہاں ہی آگرہ اور علی گڑھ کے مدارسِ عالیہ ہیں۔ وہاں بھی جمود کے سوا کچھ نہیں۔ سومناتھ پچھلے دنوں علی گڑھ کا ایک چکر لگا کر آئے ہیں۔ لیکن ان کا تاثر یہی ہے کہ وہاں باتونی لوگ بہت ہیں۔ کام کا ایک بھی نہیں۔ سب اپنی ذہنیت

خانے کے لئے ایک دوسرے کی ستائش پر مبتلا ہیں۔ اور ایک بھی ایسا نہیں جس پر درحقیقت کچھ بھروسہ کیا جا سکے۔ پروگرام اسسٹنٹ کی اسامی کے لئے اس علاقے سے ایک آدمی نہیں ملتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دہلی اسٹیشن پر چند کلرکوں اور ایک دو اناؤنسروں کو چھوڑ کر باقی سب پنجابی ہیں اور اس بات کو دیکھ کر دہلی کے لوگ انگاروں پر لوٹتے ہیں۔ بخاری اپنی انتہا درجے کی تیز فہمی اور ہوشیاری سے ان لوگوں پر چھایا ہوا ہے۔ دعا کرو خدا مجھے بھی اتنی سمجھ اور ہمت دے۔

میں ۲۴ اگست کو اپنی نظمیں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے پڑھ رہا ہوں۔ اس کے بعد اپنی نظمیں تمہیں بھیجوں گا۔ کیونکہ میری اصلی بیاض ایک صاحب مانگ لے گئے ہیں۔ اور میرے پاس اس وقت صرف وہی نقل موجود ہے جو تمہارے لئے کرنا شروع کی تھی۔ لہٰذا اس کے بعد ہی بھیج سکتا ہوں۔

میری نظم دریچے کے قریب کے بارے میں تمہاری تنقید خوب دلچسپ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس ابہام کو کیسے دور کروں جو روز بروز میری شاعری میں پیدا ہو رہا ہے۔ تم نے پچھلے دنوں ALDOUS HUXLEY کے حوالے سے ابہام کی سات قسموں کا ذکر کر کے میری اور حوصلہ افزائی کر دی تھی۔ لیکن میرے خیال میں اب اس بارے میں بڑی حوصلہ شکنی درکار ہے۔ میرے اکثر دوستوں نے جنہیں میں نے اس نظم کی نقلیں بھیجی تھیں خیالات کے تسلسل کو نہ پا کر مجھے مایوس کر دیا ہے۔ "شمع شبستانِ وصال" بالکل ناگزیر تھا۔ اس لئے کہ اس سے میں نے یہ تاثر پیدا کرنا چاہا ہے کہ نظم کے "واحد متکلم" اور اس کی محبوبہ کی رات مل کر گذری ہے۔ اس کے بعد کے دونوں مصرعے فوراً اس وصال کی لذت کو واضح کرتے ہیں۔ گو یہ ترکیبِ الفاظ ایک حد تک عامیانہ ہے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ سیمگوں ہاتھوں اور سرخ رنگ اور جنوں خیز سے بھی ایک ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً اس نظم سے میرا عندیہ یہ ہے کہ میناروں کی رفعت ہماری گذری ہوئی عظمت کا نشان سہی۔ فطرت انہیں ہر صبح چومتی سہی لیکن انہیں کے نیچے ایک مہمان خانوں کا باشندہ پڑا ہے جو ہماری گذشتہ تین سو سال کی ذلت کا جیتا جاگتا نشان ہے شاید ایک حد تک اس کا باعث بھی۔ بازار میں لوگوں کے جسم کے سیل آتے جاتے ہیں۔ ان میں ہر شخص کے اندر خودی ہے لیکن ناتواں۔ ان میں وہ تیزی اور تندی نہیں جو انقلاب کی آگ کو بھڑکا سکے۔ کیونکہ یہ سب (اور ان کی طرح میں بھی) پیٹ کے چکر میں مبتلا ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ذلت کا ابھی تک کوئی مداوا نہیں۔ جس بے بسی سے ہر صبح شروع ہوتی ہے اسی بے بسی کے ساتھ شام ہو جاتی ہے۔ دنیا ایک گھومتا ہوا چکر ہے (چرخ گرداں ہے جہاں) اور ہم اس چکر میں مبتلا۔ شاید میری یہ توضیح جو بظاہر غیر ضروری تھی۔ میری نظم کو اور

زیادہ واضح کر سکے۔ یہ سن کر افسوس ہوا کہ تم چھٹیوں میں دہلی نہیں آ سکو گے۔

تمہارا راشد

۵۔ منوہر لال لین۔ تیس ہزاری دہلی

یکم اپریل ۱۹۴۰ء

بھائی حمید

خط نہ لکھنے کی بہت بہت معذرت۔ خط نہ لکھنے کی بڑی وجہ یہ خیال تھا کہ جب میں خط لکھنے کا ارادہ کروں گا تو تم خود دہلی پہنچ جاؤ گے۔ اور میرا خط لکھا لکھایا ضائع جائیگا بلکہ یہ کہ خط میں کیا لکھوں۔ کیونکر شروع کروں۔ اور کیا باتیں بناؤں اور پھر وہ کہاں ختم ہوں۔ باتیں تو مثلاً لکھنے کی کئی ایک ہو سکتی ہیں۔ جو سب سے پہلے آپ ہی آپ سوجھتی ہیں وہ ہیں، دفتری پریشانیاں۔ نئی تقریروں کے لئے موضوعات، مقرروں کی فہرستیں۔ ناقابلِ توجہ مسودے، بیان کے لاگو مقرر۔ اعداد و شمار۔ اڈوانی وغیرہ۔ پھر اس کے بعد ادب؟ یعنی ادب کا زوال، زوال کی نوحہ خوانی، نوحہ خوانی کا لاحاصل ہونا، اور اس کے لاحاصل ہونے کے خیال سے مایوسی! لیکن اس خط کا جواز ان باتوں میں سے کوئی نہیں بلکہ ایک نظم ہے "رقص" جو کل ہی لکھی ہے۔ جس کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ PRIMITIVE MAN یعنی عہدِ پارینہ کے انسان کے مقابلے میں ہم مہذّب اور طبّاع شہری جن کے قوائے آج فطرت کے ساتھ جنگجوی کے قابل نہیں رہے کس انداز سے کس وجہ سے اور کیونکر فن میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم عورت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ جو تمام فنون کی تمثیل ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی تلخیوں، زندگی کی کراہتوں کو ہم برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ زندگی پر جھپٹ نہیں سکتے۔ فن اور فنون کے مجموعے عورت سے لپٹ سکتے ہیں۔ صرف لپٹ کر اپنی انتہائی آرزوؤں کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ ہاں تو یہ نظم تمہیں سنانے کی آرزو اور سُنا نہ سکنے کی حسرت میں بھیج رہا ہوں۔ اس نظم ہی نے مجھے یہ چند سطور بھی لکھنے پر مائل کیا ہے۔ لیکن ان غزلیات و ہزلیات کے علاوہ ایک اور کام کی بات بھی ہے جس میں تمہارا مشورہ چاہتا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ B.B.C میں مترجم کی حیثیت سے جانا چاہتا ہوں یا نہیں؟ تنخواہ غالباً پانچ سو پاؤنڈ سالانہ ہوگی۔ اوّلاً چھ ماہ کی اسامی ہے۔ لیکن بعد میں اس مدت کے بڑھائے جانے کے امکانات ہیں۔ مجھے یہ مشورہ دو کہ مجھے موجودہ حالات میں جانا چاہئے یا نہیں اور اگر جاؤں تو آیا پانچ سو پاؤنڈ سالانہ میں اتنا ہو سکتا ہے کہ وہاں قابلِ لحاظ زندگی

بسر کر سکوں اور کچھ "اہل و عیال" کے منہ میں ڈالنے کے لئے بھی بھیج سکوں۔ اپنی زندگی کے خطرات سے میں نہیں ڈرتا۔ بلکہ خطرات میں پڑنا "جزو ایمان" سمجھتا ہوں۔ اقبال کے "سچے مسلمان" کی مانند! روسی ہوٹل بیوی کی آنکھوں میں "در شہوار" دیکھ کر بھی شاید دل نہ پسیجے۔ لیکن کیا وہاں اب زندگی کا کوئی مفہوم بھی باقی ہے یا نہیں یعنی انگلستان میں؟ شاید باقی نہیں! تہذیب و تمدن کے وہ مظاہرات جو تم نے دیکھے ہوں گے شاید اب تو ان کا نام و نشان تک باقی نہ ہو۔ اور اگر کچھ نقش موجود ہے تو نہ جانے کب محو ہو جائے۔ تاہم میرا یہ اقدام تم ایک مخلص دوست کی حیثیت سے کن نظروں سے دیکھو گے۔ تمہارا مشورہ میرے تذبذب کو دور کرنے میں ممد ہوگا۔ لہٰذا میں جواب کی جلد امید رکھتا ہوں۔

تم تصور کر سکتے ہو میں اور بشیر اس وقت کس اہم فرض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اگر نہیں تو جان لو کہ ہم "سالانہ نقشے" تیار کر رہے ہیں اور تہ دل سے امید کرتے ہیں کہ آئندہ نسلیں ہمارے اس کام پر ہماری روحوں کو طوعاً و کرہاً ثواب پہنچائیں گی۔

مخلص راشد

کیپٹن، ن، م، راشد

انڈین آرمی پبلک ریلیشنز۔ تہران

۲۱ اکتوبر ۱۹۴۴ء

پیارے حمید

بہت دن ہوئے تمہارا خط ملا تھا۔ چند دن ہسپتال رہا اور پھر ایک مسافرت آن پڑی اس لئے جواب نہ دے سکا۔ تم نے اپنے گزشتہ خط میں اپنی ذہنی کیفیت کی جو جھلک دکھائی تھی اس سے بہت رنج ہوا۔ میرے معاملے میں تو میری ذہنی "اصلاح" کا ذمہ دار بہت حد تک ماحول کا تغیر ہے۔ ماحول کے تغیر کے ساتھ انسان کو اپنی عینک بدلنا آسان ہو جاتا ہے، لیکن تم زندگی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہو۔ حالانکہ زندگی حتماً بے مصرف اور بے کار چیز ہے اور اسے یہی سمجھ کر بسر کرنا ضروری ہے۔ میں اپنے محدود تجربے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خوشی کا راز یہ ہے کہ انسان اپنی اہمیت کے احساس کو ایک درجہ یا دو درجے یا حسبِ ضرورت زیادہ کم کر دے۔ غم وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں انسان اپنے وجود کو مبہم طور پر اہم اور قابلِ قدر سمجھنے لگے۔ میں یہی کیا کرتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مغموم رہتا

تھا۔ مثلاً انگریزوں اور امریکنوں کے ساتھ قریبی ربط پیدا ہونے سے احساس ہوا ہے کہ زندگی بہت حقیر اور ادنیٰ چیزوں کا مجموعہ ہے۔ آسمانوں اور ستاروں اور کہکشاؤں کا نہیں۔ میں نے اپنی عینک بدل ڈالی ہے۔ میری آنکھوں میں پہلے سے زیادہ نور آ گیا ہے!

تم نے خط لکھ کر بڑا کرم کیا ہے۔ امید ہے تم آئندہ بھی دو چار سطریں لکھا کرو گے۔ یہ شاید بے معنی جذبات پرستی کا اظہار ہو گا اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اپنی محدود کائنات میں جس قدر قرب تمہاری تمام ذہنی بلندیوں کے باوجود، تمہارے ساتھ محسوس کیا ہے کم لوگوں کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے تمہارے مشوروں کو ہمیشہ چراغِ ہدایت بنایا ہے، اور تمہاری نصیحتوں نے ہمیشہ مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت اور جرأت پیدا کی ہے۔ اور میں اسے اپنی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری دوستی حاصل ہوئی ہے۔

تم کسی طرح کسی سرکاری کام کے لئے ایران، عراق اور مصر کا ایک مختصر سا دورہ کرنے نہیں آ سکتے۔ یہ ملک دیکھنے کی چیز ہیں۔ جنگ کے بعد تو اس کا امکان اور زیادہ ہو جائے گا لیکن جنگ کے زمانے میں یہاں اور ہی قسم کی رونق ہے۔ خود میں کوشش کر رہا ہوں کہ اگر کرنل صاحب رضامند ہو جائیں تو ایک ماہ کی رخصت لے کر ہندوستان ہو آؤں۔ میری ایک بچی سخت بیمار ہے، اور وہاں اس بیماری کا باقاعدہ علاج کرنے والا بھی کوئی نہیں لیکن دقت یہ ہے کہ مجھے ابھی سمندر پار آئے ایک سال بھی پورا نہیں ہوا معلوم نہیں کہ رخصت ملے یا نہ ملے۔ بچوں والا ہونا بھی عجب مصیبت ہے۔ ریڈیو میں جو جگہ اسامیاں پیدا ہو رہی ہیں کیا ان میں میری کھپت ہو سکتی ہے۔ شاید میرے ہندوستان واپس آنے سے میری بچی کی جان بچ جائے۔ ابھی ابھی بیوی کا خط آیا ہے کہ ڈاکٹر نے اس کے پھیپھڑوں کی حالت خراب بتائی ہے۔ افسوس!

تمہارا راشد

۹۔ پرانا قلعہ روڈ۔ نئی دہلی

۳۰ر جولائی ۱۹۴۶ء

پیارے حمید

تمہارا خط ملا۔ انصاری کی کتاب پڑھ کر میں نے بالکل وہی رائے قائم کی تھی جو تم نے کی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب کم علمی، بے ذوقی اور بد دیانتی کی بہترین مثال ہے۔ تمہیں اس لئے نہیں بھیجی تھی کہ میرے کسی "درد" میں شریک

ہو سکو۔ بلکہ اس خیال سے کہ تمہیں کسی قدر ندامت کا احساس ہو کہ تم جو میری "حقیر" شاعری کو پسند کرتے ہو تم نے یہ توفیق کیوں پیدا نہیں کی کہ اس کے بارے میں "اعلائے کلمۃ الحق" کر سکو۔ ورنہ شاید ایسی بے معنی کتابیں یا مقالے وجود میں نہ آتے۔ میں نے یہ کتاب پڑھ کر انصاری کو ایک مختصر سا خط لکھا تھا۔ جس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ تجزیہ نفس کے اصولوں پر شاعری کی پرکھ کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ دوسرے اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کام کا بیڑا اٹھانے سے پہلے تجزیہ نفس کا زیادہ مطالعہ کر لیتا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اس قسم کے "نقاد" کو اس قدر توجہ نہ دینی چاہیے تھی کہ اسے خط لکھا جاتا لیکن میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی طریقہ اپنی رواداری کے اظہار کا نہ تھا۔

پچھلے دنوں مکتبہ اردو کا مدیر یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ غالباً تجارتی نقطہ نظر سے اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ تم سے کہوں کہ تم ماورا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرو۔ اگر تم اس کام کے لئے کچھ وقت نکال سکو تو خود میرے لئے زیادہ مفید ہوگا میری رہنمائی ہوگی۔ تمہاری رائے پر طبعاً بہت اعتماد رکھتا ہوں

ڈاکٹر کیرنز نے میری نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ پچھلے دنوں مسودہ کی شکل میں نظر سے گزرا۔ بعض اغلاط درست کرا دیں۔ بحیثیت مجموعی ترجمہ خاصا اچھا ہے لیکن بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ قبل از وقت ہے یا اس بیک گراؤنڈ کی تشریح ضروری ہے جس نے ان نظموں کی تخلیق کی ہے۔ اگر "زنجیر" "آواز" اور "طہران" آپ ہی کے مجموعے میں شامل ہوتیں تو بہتر تھا۔

ایران میں ہندوستانی فوجوں کی زندگی کے بارے میں ناول لکھ رہا ہوں۔ کوئی سات آٹھ باب ہو چکے ہیں۔ تم ہوتے تو اس کے بعض حصے تمہیں سناتا۔ ایران کے جس دور کی تصویر کشی مد نظر ہے وہ کئی پہلوؤں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، جب وہاں انگریزی، امریکن، روسی اور ہندوستانی فوجیں تھیں۔ جب ایران سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے ایک بے مثال بحران میں مبتلا تھا۔ اگر میں اس ناول میں اجتماعی اور انفرادی رد عمل کو واضح کر سکا تو کامیاب ہوں گا۔ کوشش اسی بات کی ہے۔

تم دلی کب آ رہے ہو؟ میں شاید اگست کے وسط میں دو ماہ کے لئے کولمبو چلا جاؤں۔ اگر تم اس سے پہلے دلی کا دورہ نکال سکو تو کیا ہی اچھا ہو۔ آؤ تو میرے پاس قیام کرو تاوقتیکہ کسی بڑے آدمی کے ہاں قیام میں زیادہ کشش نہ ہو۔ والسلام۔

مخلص راشد

رینڈیوونٹ۔ سی ای اے سی۔ کولمبو سیلون

۲۵ر اگست ۱۹۴۶ء

پیارے حمید

کل شام کو یہاں پہنچا ہوں۔ اس سرزمین میں جہاں، روایت کے مطابق حضرت آدم کو بہشت سے جلا وطنی کے بعد سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ اگر اس زمانے میں یہاں انسانوں کی صورتیں جراحتِ نظر کے لئے موجود نہ تھیں تو حضرت آدم جنت کو ہاتھ سے دے کر چنداں خسارے میں نہ رہے ہوں گے، پچھلے دنوں بڈھے برنرڈ شاء نے سیلون کی مخلوق کی تعریف میں کچھ رطب اللسانی فرمائی تھی۔ ان کے ارشاد نے سیلون کے لئے دل میں ایک کشش پیدا کر دی لیکن یہاں آکر محسوس ہوا کہ اس بارے میں برنرڈ شاء کے خیالات اس عام انگریز کے خیالات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، جو ہندوستان کو جوگیوں، سپیروں اور مہاراجوں کی سرزمین سمجھ کر اس میں اپنے رومانی تصورات کی تسکین کا سامان پاتا ہے۔ میں یہ الفاظ کسی SNOBBISH طریقے سے نہیں کہہ رہا۔ اور نہ یہ کہنے سے میں لوگوں کو ایسی نشاۃ ثانیہ پر مجبور کر سکتا ہوں۔ کی نشاۃ ثانیہ ہو بھی کہاں سکتی ہے اور اس بڑے پیمانے پر، تا آنکہ نئے سرے سے نسل کشی کا کام نہ کیا جائے۔

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ یہاں آکر کسی ہندوستانی کو احساسِ کمتری چھو تک نہیں سکتا۔ اس حد تک بھی نہیں جس حد تک مثلاً ایران اور مصر میں ہو سکتا ہے۔ یہاں مناظر کی فراوانی ہے۔ ایک یک آہنگی ضرور ہے، تنوع نہیں، بعینہٖ جیسے ہندوستان کے صوبوں میں ہے، ہندوستان میں پھر بھی لمبے سفروں میں نہایت آہستہ سے عجیب دزدانہ انداز سے مناظر کروٹ بدلتے چلے جاتے ہیں، یہاں چاروں طرف ناریل کے درخت ہیں جن سے ہرے بھرے ناریل تھیلوں کی طرح لٹک رہے ہیں۔ اس سے بہتر تشبیہ شاید نہ ہوگی، بازاری سہی! میرا جس ہوٹل میں قیام ہے وہ سمندر کے کنارے واقع ہے، کمرے کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہے، کل سے لہروں کا، متواتر شور سن رہا ہوں۔ گویا دیوار کے نیچے سینکڑوں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں، کل غروبِ آفتاب کے وقت گھنٹہ بھر اسی منظر کو دیکھتا رہا۔ آج صبح طلوعِ آفتاب کے وقت آنکھیں سیر ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ لہریں ضدی ہٹ کے پورے بچوں کی طرح ایک تواتر ایک تسلسل کے ساتھ ایک ہی عمل کو دہرائے جا رہی ہیں، آپ ہی آپ ایک پہاڑ کھڑا کر دیتی ہیں، پھر سفید شیر رنگ پانی سمندر کی طرف سے آتا ہوا اس پہاڑ کی پشت پر سوار ہو کر دوسری طرف آبشار بن کر گرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ہی پہاڑ بھی سمندر کی سطح کا جزو بن کر رہ جاتا ہے، میں اگر ناظر کش شاعر ہوتا تو دو چار نظمیں کسی کا عنوان سمندر، کسی کا ساحل، کسی کا زندگی رکھ کر لکھ ڈالتا۔ لیکن مجھے یہ منظر صرف اس حد تک ـــــ

INSPIRE کرتا ہے کہ داد واہ کہہ کر رہ جاؤں۔ اور پھر تنہائی کے احساس کو شدید تر پا کر کتاب پڑھنے لگوں، خط لکھنے لگوں، سگار سلگاؤں یا بستر پر لیٹ جاؤں۔ یہ ہوٹل کچھ غیر معمولی طور پر خاموش سا ہے۔ اتنا بڑا ہوٹل اور اتنا خاموش انگریزی کی تہذیب کا عکس، البتہ لاؤنج اور بار میں اس قوم کی قوت گویائی کے سب بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ وائن دال نکال کر یکجا ہوتی عورتوں کی رفاقت، محض گفتگو کے لئے گفتگو، ہوٹل کے بیروں اور ملازمین کے ساتھ مربیانہ رفتار انداز سلوک، ہندوستانی افسر کو قریب دیکھ کر الجھن، یہ سب چیزیں سیلون کے مستعمرانہ درجے پر مہر تصدیق ثبت کئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس جزیرے میں انگریز کا نفوذ غیر ضروری حد تک زیادہ ہے، لیکن سُنا ہے کہ سونے چاندی کے انبارات کے اور کسی بھی انگریز کے INITIATIVE سے کوئی فلاحی کام نہیں ہوا۔ یہاں کی سڑکیں کشادہ اور خوبصورت ہیں۔ لباس میں ہندوستانی دھوتی، ٹوپی اور ساری بھی ہے۔ اور نسلی عنصر بھی، ہوائی جہاز میں کچھ مقامی باشندوں سے ملاقات ہوئی تھی، اس سے زیادہ میں ابھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ میں انگریز کی طرح بیرنل سے حاکم کی تہذیب و انداز نہیں لگاؤں گا۔ خیال ہے کہ چند دنوں میں، عارف کی نصیحتوں کے باوجود (خود را فضیحت، دیگراں را نصیحت سے زیادہ نہیں ہوا کرتیں)، کچھ مقامی لوگوں سے رسم و راہ پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ سیلون کئی لحاظ سے ہندوستان ہی معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مدراس سے جنوب تر علاقے کو قدرتاً ایسا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ لوگ اپنی انفرادیت کو خط کشیدہ لفظ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں پہچاننا اور سمجھنا شاید مفید ثابت ہو، شاید کسی نئے ناول کی تخلیق کا باعث ہو، یا شاید کوئی نظم ہی لکھی جا سکے، یا اس سے بڑھ کر ممکن ہے ہندوستان کے لئے کسی "ہدایت نامے" کی کوئی نئی دفعہ معلوم ہو جائے۔

عارف نے مجھ سے بدترین سلوک کیا ہے۔ دلّی میں جو چند مہینے گزرے ہیں، سخت کوفت کے گزرے ہیں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پڑھے لکھوں میں شمار نہیں کرتا۔ لیکن محسوس ہوا کہ تعلیم و تربیت کی کمی انسان کی شخصیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ کبھی یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں ہی ان انسانوں میں ہوں جو مزمن طور پر ناخوش رہتے ہیں اور ناخوشی ہی میں جن کے لئے لذت کا سامان ہوتا ہے، لیکن بعض واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس شخص نے ایک اور فوجی محکمے میں جانے کے لئے میری عرضی بھجوانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے مجھے "آج کل" میں پیسے لے کر نظمیں چھپوانے سے روک دیا اور اس نے ریڈیو پر تقریر کرنے کی اجازت دلوانے کی سخت مخالفت کی۔ میں نے جونیئر کلرکی میں بھی اتنی توہین برداشت نہیں کی جتنی عارف کے ساتھ کام کر کے کرنی پڑی ہے۔ کبھی ملو گے تو باتیں ہوں گی، یونہی بیٹھا بیٹھا کچھ باتیں یاد آ گئیں حالانکہ تمہیں براہِ راست ان سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ لکھوا آنے سے

پہلے تم سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آتی، جی چاہتا ہے پوچھوں: "کیا تم کولمبو نہیں آ سکتے؟" لیکن اپنے اس سوال پر خود ہنس رہا ہوں۔ یہی بہت سے خطوں کا جواب تمہاری طرف واجب الادا ہے، بہت سے نہیں تو دو تو یقیناً ہیں اور یہ تیسرا! خط لکھو گے تو ممنون ہوں گا۔

تمہارا راشد

ریڈیو یونٹ سی ای اے سی۔ کولمبو، سیلون

۲۰ ستمبر ۱۹۴۶ء

پیارے حمید

تمہارا ۱ ستمبر کا خط آج صبح موصول ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان اور لنکا کے درمیان ڈاک اس قدر سست رفتار کیوں ہے۔

یہاں کے بہت خوبصورت ہوٹل میں دو دن قیام کے بعد ایک میس (MESS) میں منتقل ہو گیا ہوں۔ یہ میس بھی اتفاق سے سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اگرچہ ہمارے اور سمندر کے درمیان کانٹے دار تار حائل ہیں۔ سمندر تک پہنچنے کے لئے کسی قدر چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ لیکن میس کے لاؤنج اور سیلون میں بیٹھے ہوئے سمندر کا منظر لگا ہوا رہتا ہے۔

کل رات میس میں رقص کی محفل تھی۔ اس میں چند خوبصورت چہرے نظر آئے۔ بیشتر انگریز عورتیں تھیں۔ کچھ برگر یعنی ولندیزیوں اور پرتگیزوں کی اولاد۔ خالص سیلونی عورتیں، ان مشاغل میں کم حصہ لیتی ہیں۔ مسلمان یہاں کئی قسم کے ہیں ایک مور یعنی عربوں کی اولاد، دوسرے جاوی اور ملائی مسلمان، تیسرے خالص سیلونی چوتھے ہندوستانی جو یہاں آ کر بس گئے ہیں۔ عرب نسل کے مسلمانوں کے خدوخال کسی قدر دلکش ہوتے ہیں۔ لیکن رنگت کی سیاہی وہی جو یہاں ہر شخص کے حصے میں آتی ہے۔ کچھ ہندوستانی مسلمان تاجروں سے ملا ہوں بیشتر کچھ اور کاٹھیاواڑ کے رہنے والے ہیں۔ خاصے کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ ایک بہار کے رہنے والے ڈاکٹر اختر امام ہیں یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے ہیں۔ آغا اشرف جب یہاں تھے تو ان سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ آدمی نہایت ملنسار ہیں۔ کچھ اس درد میں ضرورت سے زیادہ مبتلا رہتے ہیں کہ سیلون کے لوگ اردو پڑھنے بولنے اور لکھنے لگیں۔ میرے نزدیک یہ پودا یہاں پھل پھول نہیں سکتا۔ سنہالی زبان کی ترقی کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری

بے پناہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ ویسے اب بھی انگریزی ہمارے ہاں سے زیادہ اونچی سمجھی جاتی ہے۔
لیکن یہاں ہندوستانی فلم خود چلتے ہیں، خود سنہالی میں گانے کی طرز پر سب کے سب ہندوستانی فلمی گانوں سے اڑائی گئی ہیں۔ کولمبو ریڈیو پروگرام کبھی ریڈیو پر لگاؤ تو میرے لئے یہاں ہر، جیسے ہے تا قرار ہے: ادر" تو کوئی بدلی ہیں مرے جاندے آیا۔ ونزدی طرز پر سنہالی زبان کے گیت سنا ہوں۔ کلاسیکل موسیقی یہاں نہیں ہے، لیکن تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ وہ بھی جنوبی ہندوستان کی موسیقی سے ملتی جلتی ہے۔ لوک گیتوں کی ترقی کے لئے سرکاری طور پر مہم جاری کی گئی ہے، کولمبو ریڈیو نے خاص ریکارڈنگ یونٹ ملک کے ہر حصے میں بھجوا دیے ہیں۔ اور موسیقی کو لوک گیتوں کی بنیاد پر از سر نو قائم کرنے کے لئے مسائل جاری ہیں۔

تمہاری پنجابی شاعری پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔ کیا کہتے کئی دنوں سے پنجابی دیہاتی گانوں کے ریکارڈ سن سن کر پنجابی شاعری کے لئے اس کی موسیقی سے بھی دلدادگی پیدا ہونے لگی ہے۔ خیالات کے اظہار میں جو شگفتگی پنجابی شاعروں میں ہے وہ اردو میں اب تک کم نظر آتی ہے۔ کچھ ہلکی پھلکی باتیں کرتے کرتے تصوف اور فلسفہ حیات بیان کر جاتے ہیں۔ تمہاری شاعری میں اچھی خاصی "سکھیت" کی جھلک ہے، برے معنوں میں نہیں۔ اچھے معنوں میں یعنی وہ سکھوں کی موجودہ شاعری کا ٹھیٹھ کتابی انداز! جس میں زبان پنجابی ہوتی ہے لیکن فلسفہ اکثر نیم ایرانی ہوتا ہے یہ نیم عمر خیامی! لیکن تم اگر اس قدر روانی سے پنجابی میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہو تو تمہیں محض دیہاتی کیفیتوں کی تصویر کشی پر مطمئن نہیں رہنا چاہیے یعنی بیشتر چیزیں لکھنی چاہئیں لیکن بحر بدل بدل کر، یہ بحر جو تم نے چنی ہے، پنجابی میں اتنی عام ہے کہ پڑھ پڑھ کر اور سن سن کر اکتا گئے۔ دلی سے پنجابی کا ایک کوئی دربار سنا تھا بمشکل کوئی شاعر ہو گا جو اسی یک آہنگ بحر میں نظم لکھ کر نہ لایا ہو۔

"نیستان" میں جو مضمون چھپا ہے وہ میری نظر سے گزرا تھا وہ چھپنے سے پہلے بھی مجھے مصنف نے لا کر دکھایا تھا۔ بعد میں اس نے اس میں اصلاح و ترمیم بھی کی۔ اس نے انصاری کو تجزیۂ نفس سے گزر کر منطق سکھانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش میں اظہار کی کوتاہی کی وجہ سے خود کہیں کہیں الجھ کر رہ گیا ہے اگر "کتاب" کا پرچہ اور الطاف گوہر کے مضمون کی کاپی کہیں سے بھجوانے کی زحمت گوارا کر سکو تو ممنون ہوں گا۔ خاص طور پر اس کے لئے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ واپس آ کر بھی دیکھ سکتا ہوں۔

عارف کے اور میرے تعلقات، ناگفتہ بہ حالت تک نہیں پہنچے تھے، میں نے قہر درویش سے کام لیا تھا۔ اسے اپنی خاص "طرح دے جانے" کی مہارت سے، کشیدگی سراسر نرم آگ کی طرح سلگ رہی

تھی۔ عارف کی دوستی میں چاند کی روشنی ضرور ہے۔ لیکن سورج کی گرمی نہیں! نہ دوستوں کے کام آسکتا ہے لیکن ماتحتوں کے نہیں، ان کے نے کسی قدر گرمی کی ضرورت ہے! پھر باتیں اگر زیادہ کی جائیں تو وہ پھیل کر شفاف ہو جاتی ہیں اور ان کے اندر سے اصل آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی باتوں کے علاوہ کوئی ٹھوس کام بھی کرنا ضروری ہے۔ بہرحال اب یہاں آکر اُسے تردل سے تحفہ دیا ہے اور فاصلے سے وہ سب رنجش ذرہ بن کر نظر آنے لگی ہے مدراس سے کولمبو آتے ہوئے کچھ اشعار کہے تھے۔ اُن کے خلا تم خود پُر کرلو۔

دہ کون ہے رقیب ہمارا جواب دو ۔۔۔ جس کے لئے ہے ـــــ کو سنوارا جواب دو
کھلنے نہ پاس جسم کے ـــــ کہاں وہ شرم ۔۔۔ اب کھا گئی ہو سارے کا سارا جواب دو
ـــ کے علاوہ ـــ بھی جب تھی تمہارے پاس ۔۔۔ کیوں ہم کو تم نے جلق سے مارا جواب دو
جس پر تمہیں تھا ناز جوانی میں وہ کہاں ۔۔۔ یہ ـــــ ہے کہ آلو بخارا جواب دو

تمہارا ارشد

ریڈیو پاکستان۔ پشاور ۲۹ر جولائی ۱۹۵۱ء

پیارے حمید پچھلے دنوں جب جی۔ احمد یہاں دورے پر آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ بعد میں بشیر کے ذریعے اس امر کی "تصدیق" بھی ہو گئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ مبارکباد کا خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جس "پُراسرار سکوت" کے ماتحت شادی ہوئی تھی، اس کا جواب سکوت ہی ہو سکتا تھا۔ ارادہ تھا کہ اگست میں ایک ماہ کی رخصت لے کر زیارت آؤں گا۔ زیارت میں قیام کا انتظام بھی کر لیا تھا لیکن رخصت نامنظور ہو گئی۔ خیال تھا کہ زیارت پہنچ کر تمہارے پاس بھی چند دن گذار سکوں گا۔

یاد نہیں کہ کبھی تم سے اس امر کا ذکر ہوا یا نہیں کہ میں نے U.N کے ریڈیو ڈویژن میں ایک اسامی کے لئے درخواست دے رکھی ہے۔ گزشتہ سال U.N کے دفتر کے کوئی صاحب پاکستان تشریف لائے تھے۔ اور انہوں نے اور حضرات کے علاوہ مجھے بھی انٹرویو کیا۔ اور کچھ تفصیلات ساتھ لے گئے، اور کچھ بعد میں منگوا بھیجیں۔ وہ قصہ سال بھر سے چل رہا ہے۔ اس دوران میں، جب مجھے اس ملازمت کے حصول کا قریب قریب یقین ہو چکا تھا۔ ہمارے سکریٹری صاحب نے یہ حکم جاری فرما دیا کہ کسی کو ریڈیو پاکستان سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ کراچی میں اُن سے پچھلے دنوں ملاقات بھی ہوئی اور ان سے میں عرض معروض بھی کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ تمہارے اُن سے اچھے خاصے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ممکن ہے جو بات میں زبانی واضح نہیں کر سکا۔ تم (اگر مناسب سمجھو) تو خط میں کر دو۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک تو اس اسامی کیلئے

ریڈیو پاکستان ہی سے کوئی شخص جانا چاہیئے باہر سے نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد U.N کے اُردو پروگرام کی نگرانی نگارش اور نشر ہے۔ اور ریڈیو پاکستان سے جو بھی جائے گا، وہ چند سال کے قیام کے بعد محکمے کے لئے مفید تر ہو کر آسکے گا۔ اسے پاکستان کی حکومت پر بار ڈالے بغیر اعلیٰ تربیت مل جائے گی۔ مجھے اس لئے جانا چاہیئے ایک تو میں پہلے، دوسرے ملکوں کے اسٹیشنوں سے اسی قسم کے پروگرام براڈ کاسٹ کر چکا ہوں۔ مثلاً تہران، بغداد، یوروشلم بصرہ، قاہرہ اور کولمبو سے۔ دوسرے اب اس محکمے میں مزید ترقی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ ریٹائر ہونے تک اسٹیشن ڈائرکٹر رہوں گا۔ U.N کو میں نے اپنے بارے میں جو کاغذات بھیجے تھے، اس میں تمہارا نام ریفری کے طور پر درج کیا تھا۔ ممکن ہے تمہیں وہاں سے کوئی خط بھی آیا ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری رائے میری معاون ثابت ہوگی۔ اب اگر تمہارے ذرائع سے احمد صاحب کسی طرح رضامند ہو جائیں تو یہ موقع مل جائے گا۔ ورنہ شاید پھر کبھی ہاتھ نہ آسکے۔ احمد شاہ بخاری نے وہاں میری پُر زور سفارش کی ہے۔ لیکن اگر سکریٹری صاحب کی اجازت نہ مل سکی تو باقی سب کچھ بیکار رہے۔

امید ہے، تم میری مدد میں دریغ نہیں کروگے اور اگر ممکن ہو تو اس خط کا جواب بھی بھیجنے کے لئے وقت نکال سکوگے۔ امید ہے تم تلات میں ہر طرح خوش ہو۔

تمہارا راشد

ریڈیو پاکستان۔ پشاور

۲۹ر ستمبر ۱۹۵۱ء

محبِ گرامی، سلام و نیاز

پچھلے دنوں آپ کو خط لکھا تھا۔ اس کا جواب تو درکنار رسید تک نہیں مل سکی۔ اس دوران میں U.N کی طرف سے، ملازمت کی پیش کش وصول ہو چکی ہے۔ ۳۰، ڈالر سالانہ تنخواہ کی اسامی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ الاؤنس وغیرہ بھی ہوں گے۔ U.N والے چاہتے ہیں کہ ۲ر نومبر کو پیرس پہنچ کر اپنا کام سنبھال لوں۔ لیکن یہاں اس محکمے سے نجات ملنی دشوار ہو رہی ہے۔ اپنے خط میں آپ سے کہا تھا کہ احمد صاحب سے کہہ سن کر U.N میں جانے کی اجازت دلوا دیجئے۔ شاید اب آپ اس کے لئے وقت سنبھال سکیں۔ میں نے تنگ آکر بخاری کے نام ذاتی خط کے ساتھ ملازمت سے استعفیٰ بھجوا دیا ہے۔ سولہ سال کی ملازمت کر کے یوں چھوڑ کر جانا کیسے گوارا ہو گا۔ لیکن اس

کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ بخاری کی طینت سے آپ واقف ہیں۔ ممکن ہے استعفیٰ منظور نہ ہونے دے۔ مگر منظور ہو چکنے کے بعد، UN کی ملازمت کے راستے میں یوں اپنے طور پر روڑے اٹکانے کی کوشش کرے۔ موخرالذکر صورت میں، شاید ملازمت کے لئے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس ہو یا صحافت کی طرف رجوع کرنا پڑے، یا چھوٹا موٹا بزنس کرنے کی کوشش! معلوم نہیں میں ان حالات میں آپ کی مدد کی کس قدر توقع کر سکتا ہوں۔ پہلے خط کا جواب نہ پا کر بے حد مایوس ہوا۔ لیکن اس تعلق نے جو آپ کو میری شاعری سے، اور مجھے آپ کی ذات سے رہا ہے، مجبور کیا ہے کہ پھر خط لکھوں۔ شاید یہی کوئی بازگشت پا سکے۔ والسلام

مخلص راشد

پشاور

۸ر اکتوبر ۱۹۵۱ء

پیارے عبید

خط ملا۔ بے حد ممنون ہوں۔ میں نے UN کی اسامی کے لئے تمہارا نام ریفری کے طور پر اسی یقین کے ساتھ دیا تھا کہ تم جو بات لکھو گے وہ میرے حق میں مفید ہو گی۔ احمد صاحب کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ UN اپنے ریڈیو کے لئے اگر ریڈیو پاکستان سے آدمی نہ مانگے اور کہاں سے مانگے؟ اور پھر آیا وہاں ریڈیو پاکستان کے تربیت یافتہ آدمی کا جانا مفید ہے یا کسی باہر کے آدمی کا۔ ریڈیو پاکستان سے جو آدمی جائے گا وہ اپنے ہی محکمے کی خاطر بہتر تجربہ لے کر واپس بھی آئے گا۔ گزشتہ سال بخاری نے خود میرے نام کی سفارش کی۔ اس سال جولائی میں میرے استفسار پر اس نے مجھے یقین دلایا: "میں تمہارے راستے میں حائل نہیں ہوں گا۔" اور اس یقین کی بنا پر میں نے UN کو حتمی وعدہ دے دیا کہ میں ان کے بلاوے پر ان کی ملازمت قبول کروں گا۔ کرنل چھتاری اور پروفیسر بخاری اپنے طور پر میرے لئے کوشاں رہے۔ اس کے باوجود اب حالت یہ ہے کہ UN کو بھجوانے پر احمد صاحب رضامند نہیں اور استعفیٰ واپس لینے کے لئے مختلف لوگوں کی طرف سے اصرار جاری ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ سینئر افسروں کی کمی ہے۔ اس لئے ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ریڈیو پاکستان سے میری بیزاری گزشتہ چار سال سے ہے۔ اس محکمے میں، ذہانت، طباعی یا شوقِ علم کی ضرورت نہیں۔ "نیلگوں چشم" ہونا ضروری ہے۔ اس خوبی کے مقابلے میں باقی سب کچھ ہیچ! استعفے کے فوری محرک، ڈھاکے کی تبدیلی کی خبر، اور UN

کی پیش کش تھے۔ جسے منظور کرنے کا کوئی اور ذریعہ باقی نہیں رہا تھا۔ اگر احمد صاحب کو ایک خط اب بھی لکھ سکو تو بڑا ہی کرم ہو گا۔ لیکن اگر اس میں ضرورت سے زیادہ زحمت برداشت کرنا پڑے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ کیا سخت مجبوری کی حالت میں قلات میں کہیں سر چھپانے کی جگہ مل سکتی ہے جو آخری سہارا بن جائے؟

تمہیں اپنی پریشانیوں میں ناحق مبتلا کر رہا ہوں۔ تاہم جواب کا منتظر رہوں گا

مخلص راشد

۱۶۔ ایسٹ ۹۰ویں اسٹریٹ۔ نیویارک

۱۱؍جون ۱۹۶۲ء

پیارے حمید

تمہارا خط ملا۔ اس دوران میں ایک اور نظم تمہیں بھیج چکا ہوں۔ خدا کرے کہ تم اب بالکل خیریت سے ہو۔ اکثر یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ تم چند دن کے لئے نیویارک آ نکلو۔ اسمبلی کے دوران میں اگر اس کا کوئی امکان ہو تو کیا کہنے۔

نظموں کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھو کیونکہ تمہارے خیالات اکثر رہنما ثابت ہوتے ہیں یعنی مزید "بے راہ روی" کے لئے مشعلِ ہدایت بنے ہیں! اب تک جو شعر لکھتا چلا جاتا ہوں تو اس میں تمہارا اور بعض مرحوم دوستوں کا بڑا ہاتھ بلکہ بڑا تصور ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں اور ہماری زبان میں شعر کہنا اور یہ سوچ کر کہنا کہ "کام کا شعر" قلم سے نکلے دل گردے کا کام ہے۔

فیض پر جو فیضان ہوا ہے۔ اس کے مدنظر یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ رخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز! صحیح بات یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ کا حقدار ہے۔ تاہم جن لوگوں کو اعتراض ہے انہیں فیضان کے اس سرچشمے پر اعتراض ہے۔ اس سرچشمے کی وجہ سے، اور انعام کی نوعیت کی وجہ سے میرے خیال میں بھی اس "بارشِ انوار" کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ یعنی ادبی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اور یہ خالص سیاسی انعام بن کر رہ جاتا ہے جس میں غالباً مصلحت زیادہ شامل ہے اور ادب پروری کم! فیض کا ادبی مرتبہ اس سے بہت بلند ہے۔

میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو تو ممنون ہوں گا۔ لاہور سمن آباد میں میرا ایک مکان ہے، جو بیوی نے خریدا تھا۔ اس کو اپنے اور بچوں کے نام منتقل کرانے کے لئے وثیقۂ وراثت کی ضرورت ہے۔ میں نے ایک

عزیز دوست عطاء اللہ صاحب سجاد کو بھجوایا تھا تاکہ وہ کراچی میونسپل کارپوریشن سے حاصل کرکے اپنے DEATH CERTIFICATE حاصل کرنے میں میری مدد کریں۔ انہیں متواتر کئی خط SUCCESSION CERTIFICATE لکھ چکا ہوں۔ جواب تک نہیں دیتے۔ پھر اعجاز بٹالوی کو دو تین خط لکھے ہیں کہ سجاد سے مل کر یہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے کا انتظام کردے۔ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ کرم ہو گا اگر تم فرصت کے کسی وقت ان دونوں میں سے کسی صاحب کو ٹیلی فون کردو۔ یا دونوں کو۔ اور ان سے کہو کہ بچارہ کالے کوسوں بیٹھا ہے۔ اور تم نہ صرف اس کا یہ کام نہیں کررہے، بلکہ اسے جواب تک نہیں دیتے۔ جب تک یہ سرٹیفکٹ نہیں ملتا لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کو مکان کی قیمتِ خرید کی بقایا قسطیں تک ادا کرنا مشکل ہے۔ وہ کئی مرتبہ یہ سرٹیفکٹ طلب کرچکے ہیں۔

میں زحمت دینے کے لئے تم سے نادم ہوں، خدا کرے یہ زیادہ دردِ سر کا باعث نہ ہو۔

بھائی کو آداب، بچوں کو دعائیں۔

مخلص راشد

تہران

۲۸ رنومبر ۱۹۶۸ء

عزیز حمید

دو چار دن ہوئے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط لکھنے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو تازہ نظم تمہیں بھجوانا چاہتا ہوں۔ "یہ دروازہ کیسے کھلا؟" دوسرے خبر گرم ہے کہ تہران کے ریزیڈنٹ ریپریزینٹیو RESIDENT REPRESENTATIVE مسٹر EDOURD COLLIN تین سال ختم ہونے پر اگلے سال کے شروع میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اگر پال ہاف مین سے علیک سلیک ہو، یا کوئی اور وسیلہ موجود ہو تو تھوڑی سی زحمت اٹھا کر COLLIN کے جانشین کی حیثیت سے میرے نام کی سفارش کردو۔ ممنون ہوں گا۔ میرا گریڈ کم ہے۔ لیکن شاید اس بہانے اپ گریڈ بھی مل جائے۔ سولہ برس یو۔ این میں اور اکنامکس کی تھوڑی بہت تعلیم شاید مناسب استعداد سمجھی جاسکے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سولہ برس ایک ہی گریڈ میں مارک ٹائم ختم کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرو۔

مخلص راشد

تہران

۱۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء

پیارے حمید

خدا تمہیں خوش رکھے۔ تمہارا ۱۴ر دسمبر کا خط ملا۔ تمہیں اپنی نظموں میں اس لئے شریک کرتا رہتا ہوں کہ اس شرکت میں خود میرے لئے حظ کا پہلو ہے۔ اگر تم ان پر اپنی رائے لکھ سکو تو یہ حظ دوبالا ہو سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس رائے میں نکتہ چینی شامل ہو یا نہ ہو۔ خود میری اکثر نظموں میں زندگی کے بعض پہلوؤں پر نکتہ چینی موجود ہے، کبھی واضح کبھی پنہاں۔ اور جو لوگ زندگی کی تخلیق اور تکمیل میں شریک ہیں۔ ان کی پسندیدگی کبھی مدنظر نہیں رہی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میری اس نکتہ چینی کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اور میں نے کسی اپنی نکتہ چینی پر کسی طرح کی ترمیم وقت کے ساتھ کی ہے۔ تاہم ایک شخصی تحریک اس نکتہ چینی پر ہمیشہ آمادہ رکھتی ہے۔ اور اس سے باز آنا ممکن نہیں۔ تمہاری رائے میں میں نے ہمیشہ وہ اصابت پائی ہے، جس سے براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ استفادہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر بخاری مرحوم جب زندہ تھے، تو نظم لکھتے وقت اُن کا سایہ مجھ پر پڑتا رہتا تھا۔ یعنی ان کے ردعمل کے احساس سے کوئی مفر نظر نہ آتا تھا۔ اُن کے علاوہ میں نے ہمیشہ تمہاری پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو ذہن میں موجود پایا ہے۔ اور اس کا اثر بھی میری شاعری کی رفتار پر بڑی حد تک پڑا ہے۔ اگر تم اپنی رائے لکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہو، تو تمہارے خیالات کا ایک عام اندازہ جو میرے ذہن میں ہے، میری رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ تاہم میں پیرِ شو بیاموز کا قائل ہوں۔ اور اب بھی جہاں کہیں اور جیسے ممکن ہو سیکھنے سے دریغ نہیں کرتا۔

تم نے میرے لئے جو زحمت اٹھائی، اس پر تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ اگر آج نہیں تو پھر کبھی سہی، اگر اس کوشش کی بار آوری ہو تو غنیمت جانوں گا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ "ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست" انگلستان یا اٹلی کو اپنا ہدف بنا رکھا ہے شاید ان ملکوں کی کھلی فضائیں دروں بینی کے زیادہ موقعے فراہم ہو سکیں۔ ممکن ہے یہ محض خود فریبی ہو تاہم پاکستان کی فضا میں آدمی جو ضیقِ تنفس محسوس کرتا ہے وہ شاید ہی کہیں اور محسوس ہوتا ہو۔ زیادہ عملی نقطۂ نظر بہرحال یہ ہے کہ بیوی کو ان دو ملکوں میں زیادہ ذہنی آسائش مہیا ہو سکتی ہے اور میں اپنی ذاتی آسائش کو اس کی آسائش پر فوقیت دینے کے قابل نہیں ہوں۔

مخلص راشد

تہران

۴ر دسمبر ۱۹۶۹ء

پیارے حمید

تمہارے تہران سے جانے کے بعد تمہاری طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ امید ہے تم سب خیریت سے ہوگے۔ اور اس سفر کے دوران میں جو شکایات پیدا ہوئی تھیں۔ سب رفع ہو چکی ہوں گی۔

میں لندن میں بیک وقت تین آپریشن کرانے کے بعد اب تندرست ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ یکم دسمبر سے دفتر آنے جانے لگا ہوں۔ زیادہ باقاعدگی کے ساتھ۔ ورنہ کام میں نے ۱۵ر نومبر سے شروع کر دیا تھا۔ ان آپریشنوں نے خاصا ہلادیا۔ لیکن اگر تہران میں آپریشن کراتا تو کئی اور بیماریاں پیدا ہو جاتیں۔ یا شاید اب تک خدا حافظ کہہ چکا ہوتا۔ لندن کلینک کے ڈاکٹروں نے زیادہ وقت مجھے یہ یقین دلانے پر صرف کیا کہ میں نہایت تندرست آدمی ہوں۔ اور یہاں کے ڈاکٹروں نے "دل کی خرابی" کا جو اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ آپریشن کے دوران میں حرکت، قلب اور خون کا دباؤ وغیرہ سب اپنے معمول کے مطابق رہے۔

میں نے پرسنیل سے خط آنے کے بعد (جس میں مجھے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۰ء کو سبکدوشی کی اطلاع دی گئی ہے) ایک خط پاول چگو کے نام لکھا ہے۔ جس میں کچھ سرکاری اور کچھ ذاتی وجوہ بتائی ہیں اور ان کی بنا پر جون ۱۹۷۲ء تک توسیع ملازمت کی درخواست کی ہے۔ اگر زیادہ دردِ سر نہ ہو تو اس میں جو مدد تم کر سکتے ہو، میں اس کے لئے ممنون ہوں گا۔ اپنے خط کی ایک نقل ملفوف ہے۔

اگر یہ نہ ہو تو، تو دو اور صورتیں ہیں۔ ان میں بھی کامیابی تمہاری مدد کے بغیر مشکل ہے۔ (۱) UNDP میں MEYFR COHEN سے کہا جائے۔ اس کے ہاتھ میں ROS REP کا تقرر ہے۔ اُسے پاکستان ڈیلیگیشن میں آغا شاہی اور یونس بخوبی جانتے ہیں اور ان کی بات کا زیادہ اثر بھی ہو سکتا ہے۔ (۲) ورلڈ بینک میں ریٹائر ہونے کی عمر ۶۵ سال ہے۔ وہاں ولیم کلارک اطلاعات کے سربراہ ہیں اور گبسن پارکر انہیں جانتے ہیں۔ اگر کوئی صورت وہاں پیدا ہو جائے تو اور بھی بہتر ہوگی۔

میں FAO کے لئے بھی درخواست بھیج رہا ہوں۔ وہاں ملازمت کی عمر ۶۲ سال تک ہے۔ اور چونکہ اٹلی اور اس کے آس پاس منتقل ہونے کا ارادہ ہے۔ شاید دو سال روم میں گزارنا اس لحاظ سے مفید ہوں۔ ایران میں اصفہان یونیورسٹی کی طرف سے ملازمت کی دعوت موجود ہے، اور اب دانشگاہ ملی تہران

کی طرف سے بھی پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ لیکن میں اس ایرانِ نو سے ایک حد تک مایوس ہوں۔ جیسے تم نے کہا تھا صرف "کاری شاعری اچھی ہے"۔ جھوٹ اور فریب اور اجنبی کی گرہ کاٹنا ان کی زندگی کے تین ضروری (DIMENSIONS) ہیں۔ اس میں یہ لوگ پاکستانیوں سے بازی لے گئے ہیں۔ گھر میں بھابی کو سلام، بچوں کو دعائیں۔ شیلا اور نزیل سلام کہہ رہے ہیں۔

مخلص راشد

تہران

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

پیارے حمید

خدا تمہیں خوش رکھے۔ تمہارا ۲ اکتوبر کا خط ملا۔ تمہارے حالات پڑھ کر دلی رنج بلکہ صدمہ ہوا۔ جب تم نئے نئے یو۔این سے منسلک ہوئے تھے تو میں نے اس بات کی طرف ایک خط میں اشارہ کیا تھا کہ یو۔ این سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا اڈہ ہے۔ بیچارہ بخاری۔ جو اپنے علمی کمالات اور ذہانت کے علاوہ، سخت دنیا شناس لوگوں میں تھا۔ وہ بھی بآسانی ان سازشوں کا شکار ہو گیا تھا۔ جہاں تک پاکستانیوں کا تعلق ہے، ان کی صورتِ حالات یو۔این میں ہمیشہ دردناک رہی ہے۔ ایک تو ہمارے ملک کے ساتھ کسی کو زیادہ ہمدردی نہیں۔ ہمارے دوستوں میں لے دے کر ایران ہے۔ اور ایران یا ایرانی کی دوستی بھی زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔ دوسرے ہندوستانی یو۔این پر چھائے ہوئے ہیں۔ بخاری کے لئے ایک موقع تھا کہ وہ مزید پاکستانیوں کے لئے کوشش کرتا۔ لیکن اس بارے میں اس نے سخت "دیانتداری" سے کام لیا۔ ہندوستانی جہاں بھی ہوں، پاکستانی کو نالائق اور ناکارہ ثابت کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مجھے کراچی سے بنکاک بھجوا رہے تھے، تو ایک ہندوستانی ہی کی وجہ سے ہیڈکوارٹرز تک یہ بات پہنچائی گئی کہ میں ECAFE کے دو ملکوں میں "PIRSONA NON GRATA" ہوں۔ بعد کو اس سلسلے میں انڈونیشیا اور ملیشیا کا نام لیا گیا۔ انڈونیشیا میں تو میں نے ڈیڑھ سال سختی کے گزارے تھے، لیکن ملیشیا میں میں نے قدم تک نہ رکھا تھا۔ اصل میں شاید یہ صاحب ہندوستان کہنا چاہتے تھے لیکن اپنے ملک کو صاف بچا گئے۔ میں بھی گزشتہ اٹھارہ برس میں اپنی معمولی سطح پر انہی لوگوں کی سازشوں کا شکار رہا۔ اور ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ یہی حال بےچارے فرید کا تھا۔ تم نے میری جو مدد کی ہے، اس کے لئے یقین کرو تمہارا بےحد ممنون ہوں اور

ں گا۔ ورنہ گول ہو جائے۔ نے پوری کوشش کی کہ مجھے وہ کام نہ دیا جائے جس میں میں کوئی اپنا "جوہر" دکھا سکوں۔ وہ کام دیا جائے جس میں نالائقی ثابت کرنے کے امکانات باقی رہیں۔ اس نے میرے ایران کے تبادلے کی شدید مخالفت کی تھی۔ اور اس کا بھری محفل میں اعتراف بھی کیا تھا۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ اپنی بعض "کمزوریوں" باعث شاید ایران کے لئے میں سب سے زیادہ موزوں آدمی تھا۔

میں نے تمہیں ہمیشہ دانا اور ذہین لوگوں میں شمار کیا ہے۔ لیکن یو۔ این میں بات یہ ہے کہ دانا ؤں اور ہین لوگوں کی جگہ نہیں۔ بلکہ ان کی جگہ ہے جو جوڑ توڑ کے ماہر ہوں۔ جو گپ شپ ہانک کر لوگوں کو اپنی کارکردگی سے متاثر کرتے رہتے ہوں۔ معلوم نہیں آیا اس کے کوئی امکانات ہیں یا نہیں کہ تم حسبِ معمول صاف گوئی سے م لے کر سکریٹری جنرل اور انڈر سکریٹریوں کے ساتھ معاملہ صاف کرو۔ یہ صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ندیشہ ہے کہ اس کے بغیر تمہارا اطمینان قلب واپس نہیں آسکے گا۔

متین دفتری کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ اس لئے کہ اس کی مدد کے بغیر ہم لوگ یہاں کم ہی وئی کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس کا اثر رسوخ شاہی محل تک ہے۔ وہ اپنے گزشتہ دورے میں سکریٹری جنرل سے بد دل ہو کر آیا تھا۔ اب بھی اگر اس سے بے اعتنائی کا سلوک کیا گیا تو وہ ہمارے ساتھ تعاون سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ جہاں تک سکریٹری جنرل کا پیغام پڑھنے کا تعلق ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر ذریعہ عزت نہیں سمجھتا۔ صرف ادارے کی حیثیت برقرار رکھنے کا سوال سامنے تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کا محافظ میں ہی نہیں ہوں۔ اس لئے تمہارا مشورہ بسر و چشم قبول ہے۔

خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تمہارے معاملات جلد درست ہو جائیں اور تمہیں پورا پورا اطمینانِ قلب حاصل ہو۔

آپریشن کے بعد سال بھر میری صحت نہایت اچھی رہی ہے لیکن گزشتہ دو ماہ سے وقتاً فوقتاً جسم کے بعض حصوں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ شاید ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے پرہیز پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہو۔ ڈاکٹروں نے تمباکو اور شراب کی سخت ممانعت کی تھی۔ دونوں چیزیں کم کر دی ہیں لیکن ترک نہیں کر سکا۔ اب شاید مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے۔ عابدہ بہن کی خدمت میں شیلا کی اور میری طرف سے سلام۔ بچوں کو پیار۔

کچھ ہفتوں سے تم مجھے SATURDAY REVIEW بھجوا رہے ہو۔ اس کے لئے بھی بے حد شکرگزار ہوں۔

مخلص راشد

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵۔ تہران

۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

پیارے مسعود

ابھی پرسوں ایک حادثے سے بچ کر تہران آیا ہوں۔ کرمان شاہ دورے پر گیا تھا۔ بیوی اور چھوٹا بچہ تنزیل ساتھ تھے۔ دفتری گاڑی تھی اور ڈرائیور چلا رہا تھا۔ واپسی پر ہمدان سے پچاس کیلومیٹر دور، ایک دیہاتی نے سڑک پار کرنے کے لئے عین وہ وقت چنا جب ہماری گاڑی وہاں پہنچ رہی تھی۔ ڈرائیور نے دیہاتی کی جان بچانے کے لئے گاڑی سڑک کے بائیں طرف چلا دی تاکہ اس کے پہنچنے سے پہلے پہلے نکل جائے۔ اس تیز رفتاری اور جھٹکے کے باعث گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا اور گاڑی الٹ کر سڑک کے کنارے ایک خشک نالے میں جا گری۔ اور ہم اس کے اندر قید ہو گئے۔ مشکل سے شیشے وغیرہ توڑ کر اپنے آپ کو باہر نکالا۔ گاڑی بالکل پچک گئی ہے۔ اور ہم کیسے بچ گئے ہیں، اس پر انتہا درجے کی حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ یقین نہیں آتا کہ ہم زندہ سلامت ہیں۔ ڈرائیور بیچارے کو پسلیوں میں چوٹیں آئی ہیں اور دانت ہل گئے ہیں۔ شیلا اور تنزیل کو ٹانگوں پر خراشیں اور زخم آئے ہیں۔ میری گردن اور کمر کے پٹھے درد کر رہے ہیں۔ اور گردن موڑنا مشکل ہو رہا ہے۔ آواز بھی بھرا سی گئی ہے۔ بہرحال زندہ ہیں۔ خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اس نے ہاتھ دے کر بچا لیا۔

اس دوران میں دوبارہ تمہارے گزشتہ خط پر غور کرتا رہا ہوں، تم تو جس حال میں وہاں گذر بسر کر رہے ہو، وہ تمہارے لئے بہت دردناک ہے۔ لیکن یہ خط پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں یکایک "ضعف" کا شکار ہو گیا ہوں۔ تمہارا یوان میں ہونا ایک طرح کام کا زبردست محرک بن گیا تھا لیکن اب کام لاحاصل معلوم ہونے لگا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں تمہیں ایرانی حکومت سے جو شکایت ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ دعوتوں پر ملکی وفود کو مہمانوں کی فہرستیں سکریٹریٹ مہیا کرتا ہے اور وہی کھانے کی میز پر ان کا مقام متعین کرتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایرانی حکومت یا وزیر خارجہ زاہدی کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ایران کے گزشتہ دورہ پر انہوں نے تمہارا خیر مقدم کیا تھا اور تمہارے قیام کا خرچ ادا کر دیا تھا۔ اگر تم ہلٹن میں بھی ٹھہرتے تو وہ یہ خرچ ادا کر دیتے۔ لیکن تم نے خود کسی اور ہوٹل میں ٹھہرنے کو ترجیح دی تھی۔ یہاں خدا کے فضل سے ہماری بڑی ساکھ ہے۔ کچھ پاکستانی ہونے کی وجہ سے اور کچھ تھوڑی بہت کاری دانی کے باعث۔ دوسرے شاہنشاہ سے لے کر ادنیٰ آدمی تک کے دل میں یو۔ این کی خاصی قدر ہے۔

اور مجھے اپنے کام میں ہر طرح کی حمایت اور مدد اور سہولت حاصل ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ زاہدی کا کوئی امتیازی سلوک روا رکھنا قابلِ یقین نہیں۔ میں تمہیں نصیحت نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے تمہاری ذہانت اور فراست اور تجربے سے کر اکثر بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاہم دوبارہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم ان سکریٹریٹ کے موذیوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا کوئی راستہ نکال سکو۔ اور اس میں تمہارا صوفیانہ استغنا حائل نہ ہو تو شاید تمہارے اطمینانِ قلب کے لئے بہتر ہو۔ معلوم نہیں تم نے ایران سے جانے کے بعد اردشیر زاہدی یا دوسرے وزراء کے نام شکریے کے خط لکھے تھے یا نہیں۔ اگر نہ لکھے ہوں، تو شاید نوروز پر کارڈ بھیجنا مناسب ہو۔ نوروز ۲۱ مارچ کو ہوتا ہے۔ اگر تم مجھے اس وقت تک کارڈ بھجوا دو تو میں تمہاری طرف سے ان لوگوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اسی طرح نے تمہیں دعوت پر بلایا تھا شاید اس کو بھی کبھی کبھار خط لکھنا اچھا ہو۔ مثلاً کرسمس پر۔

بھابی کو آداب۔ بچوں کو دعائیں۔

سید ہاشم حسن صاحب پچھلے دنوں پاکستان گئے ہوئے تھے۔ کوئی دو مہینے سے وہاں ہیں۔ یا شاید واپس پنڈی آ گئے ہوں۔ میں فروری میں چھٹی پر جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

تمہارا راشد

تہران

۲ مئی ۱۹۷۱ء

پیارے حمید

کوئی چار ہفتے پاکستان میں گزار کر ۹ اپریل کو واپس تہران آ گیا ہوں۔ پاکستان میں بشیر اور مختار صدیقی سے لاہور میں ملاقاتیں ہوئیں۔ اور شاہ صاحب سے راولپنڈی میں۔ شاہ صاحب جو مسجد بنوا رہے تھے۔ وہ مکمل ہو گئی جس دن ہم راولپنڈی پہنچے اس پر چھت ڈالی جا رہی تھی۔ شاہ صاحب خاصے دُبلے لیکن صحت مند نظر آئے۔ وزن کم ہو جانے سے اُن کے جوڑوں کے درد وغیرہ میں بھی افاقہ ہو رہا ہے۔ دو سال پہلے جب پاکستان گیا تھا تو صدر ایوب کے خلاف مظاہرات ہو رہے تھے، اب کے گیا ہوں تو مشرقی پاکستان کی صورت حال پر بعض لوگوں کو افسردہ پایا اور بعض کو "ضرورت سے زیادہ" "جرأت مند"! اس صورتِ حال کا نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ بات بات واضح ہے کہ ہمارے ہاں اب سیاستداں نہیں ملتا۔ فضل حسین اور سکندر حیات جیسا بھی نہیں۔ جو کسی

مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے قدم اٹھا سکے۔ ہماری ساری سیاست موچی دروازے کی جذباتی
سیاست و بلاغت بن کر رہ گئی ہے۔

مجھے اب نومبر میں ریٹائر ہو جانا ہے۔ یعنی موجودہ اجازت نامے کی رو سے۔ تاہم میں نے اپنے خط میں جون
۱۹۷۲ء تک کی اجازت مانگی تھی۔ اگر اس خط کی بنا پر مزید سات مہینے کی توسیع مل سکتی ہو۔ تو اس طرف تمہاری
توجہ کی ضرورت ہو گی۔ اگر دوبارہ کیس بنا کر بھیجنا ضروری ہو، تو یہ بھی کر سکتا ہوں۔ اگرچہ اس میں پرانے خط کی تکرار
کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ مجھے سال بھر اور تہران میں رہنا چاہیے۔ مگر نومبر ۱۹۷۱ء تک توسیع
مل جائے تو مزید کئی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ میری بچی ثمرین کو جون ۱۹۷۲ء میں ہائی اسکول پاس کرنا ہے۔ اس
صورت میں اب اسے کہیں منتقل نہیں کر سکتا۔ میرا بیٹا ستمبر ۱۹۷۲ء میں انگلستان بھیج کر کسی ہنر کی تعلیم دلانا چاہتا
ہوں۔ مثلاً نرسنگ یا معلمی یا سکریٹری کا کام۔ وغیرہ۔ تینوں کے لئے وہ خط و کتابت کر رہی ہے۔ جو بھی دستیاب ہو جائے۔
جون ہو یا نومبر ۱۹۷۲ء مجھے اس سے آگے کام کرنے کی کوئی تمنا نہیں۔

اسلام آباد میں زمین کا ایک پلاٹ ملا ہے جس کا رقبہ ۷۷۷ مربع گز ہے۔ یعنی (۷۰ × ۱۰۰) اس پر
اس سال کے آخر تک مکان کی تعمیر شروع کرنے کا ارادہ ہے تاکہ اگر اور کہیں ٹھکانہ نہ پہنچے تو وہیں آباد ہو جاؤں۔
یا اس مکان کو کرائے پر دے کر لاہور میں بس جائیں۔ لیکن اس قسم کا سکون چاہتا ہوں۔ جس میں بھولا ہوا سبق
دوبارہ پڑھ سکوں۔ اردو کے قاعدے سے لے کر شیکسپیئر تک! اور کچھ اور لکھ بھی سکوں۔ جب تک ہاتھ
پاؤں، آنکھ اور دل کام کرتے رہیں۔

حیدرآباد دکن سے ایک رسالہ "شعر و حکمت" نکلتا ہے۔ اس نے اپنا تیسرا شمارہ نیاز مند کے لئے مخصوص
کیا ہے۔ چار سو صفحے کا پرچہ ہے جو دو دن ہوئے موصول ہوا تھا۔ میں نے اس کے ایڈیٹر مغنی تبسم صاحب
کو لکھا ہے (میں ذاتی طور پر انہیں نہیں جانتا) کہ اس کا ایک نسخہ تمہارے نام بھجوا دیں۔ ملنے پر اطلاع دو۔
سب مضامین اچھے نہیں ہیں۔ لیکن میری نظم و نثر کا انتخاب برا نہیں۔

بھابی کو آداب۔ بچوں کو دعائیں۔

مخلص راشد

تہران

۲۹ مئی ۱۹۷۱ء

پیارے حمید

ابھی ابھی تمہارا ۲۵ مئی کا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ "شعر و حکمت" کے خاص نمبر کے مطالعے کے بعد تم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میرے لئے بے حد حوصلہ انگیز ہے۔ مجھے ان حضرات کی آراء کے بارے میں ایک حد تک آگاہی ہے جن کا نام تم نے اپنے خط میں لیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے ہمیشہ سخن فہمی کے علاوہ میری طرفداری سے بھی کام لیا ہے۔ تمہاری یہ رائے درست ہے کہ ان لوگوں کے ذہنوں پر رسمی شاعری کے لوازمات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثر خدا کو پیارے ہوئے۔ بخاری اور مجید ملک جو زندہ ہیں وہ اب کسی رائے کے اظہار کے قابل نہیں رہے۔ نہ ان کی رائے کی کوئی قیمت ہی باقی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ فیض کی شاعری کا مداح رہا ہوں۔ میں اسے ہمیشہ لطف اندوز بھی ہوا ہوں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ فیض نے اپنی شاعری میں اپنے علم اور اپنی ذہانت کا چنداں ثبوت نہیں دیا۔ حالانکہ ان دونوں میدانوں میں وہ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ فیض لذیذ شاعروں میں ہے۔ اور شاعری میں محض لذت دیرپا نہیں ہوتی۔ محض احساسات کے بل بوتے پر شعر کہنا میرے نزدیک، اپنی ذات کی نفی ہے۔ شاعر جب تک اپنے ذہن کی تمام قوتوں سے کام نہ لے (اور یہ قوتیں حواس خمسہ کے علاوہ، اور ان سے آگے ہیں) اور اپنا فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ جہاں تک اس نیازمند کی شخصیت کا سوال ہے۔ ہر شخص کو میرے بارے میں وہی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے جس کا وہ اہل ہو۔ تاہم یہ درست ہے کہ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی زبان سے بد دیانتی اور اپنے اعمال سے ناانصافی کا مرتکب نہ ہوں۔ جب کسی کی زندگی کا ڈھانچہ دیانتداری یا انصاف دوستی پر قائم ہو تو اس سے اور لوگوں کا ناراض ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ سالک اور مجید ملک کو چھوڑ کر، باقی سب حضرات بلا وجہ حسد کے بھی شکار رہے ہیں۔ اس کا علاج میری فروتنی اور انکسار نہیں کر سکتے۔ "شعر و حکمت" کے ارباب حل و عقد نے یہ شمارہ شائع کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ مضامین میں ناہمواری تو ناگزیر ہوتی ہے۔ تاہم اس قسم کا مواد یکجا کر لینا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اور میری طرف سے یا میرے دوستوں کی طرف سے کسی تحریک کے بغیر یہ کام انجام دینا، اُن کی ادبی صداقت اور بے ریائی کا ثبوت ہے۔ ورنہ شاعروں میں ایک صاحب عبدالعزیز خالد بھی ہیں، جو اسسٹنٹ ڈائریکٹر انکم ٹیکس (؟) کی حیثیت سے۔ اپنی کتابیں چھپوانے کے لئے اور اپنے بارے میں نہایت ضخیم خاص نمبر نکلوانے کے لئے انکم ٹیکس معاف کرا دیتے ہیں۔

یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم اگست میں ایران آ رہے ہو۔ ہو سکے تو جلد از جلد اپنی تاریخ اور وقت سے اطلاع دو۔ میں کوئی سرکاری پروگرام نہیں رکھوں گا۔ لیکن اصفہان اور شیراز کے دورے کے لئے دونوں جگہ کے گورنر جنرل کو اطلاع دینا مناسب ہوگا۔ اس طرح کئی طرح کی سہولتیں مل جائیں گی۔ دونوں مقامات کے گورنر جنرل۔ جو حال ہی میں تبدیل ہو کر وہاں گئے ہیں، مجھے جانتے ہیں۔ ذاتی طور پر بھی انہیں لکھ سکتا ہوں۔ اور وزارتِ خارجہ کی معرفت بھی۔ بلکہ دونوں ذرائع سے لکھنا بہتر ہوگا۔ گھر میں سلام۔ دعا۔

تم نے اکثر میرے بارے میں مضمون لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ شاید اس سے بہتر یہ ہو کہ ہم دونوں مل کر نظموں کا انتخاب کریں۔ اور تم انگریزی ترجمہ کر سکو اور پھر وہ ترجمہ کسی امریکی شاعر کی نظرِ ثانی سے امریکہ میں چھپ جائے تو مفید کام سر انجام پائے۔ آؤ گے تو مزید بات کریں گے۔

مخلص راشد

پوسٹ بکس ۱۵۵۵۔ تہران

۷ر دسمبر ۱۹۷۲ء

پیارے حمید

خدا تمہیں خوش رکھے۔ مختار مرحوم کے بڑے بیٹے ہارون کا خط آیا ہے۔ اور اس نے اپنا بنک اکاؤنٹ نمبر لکھ بھیجا ہے۔ جو درج ذیل ہے تاکہ اگر تم کوئی رقم منتقل کرنا چاہو تو کار آمد ثابت ہو۔

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ، لینڈ اینڈ واٹر پور ڈ برانچ، فیروز پور روڈ۔ لاہور۔ اکاؤنٹ نمبر ۲۷۷۴

اس کا پتہ حسبِ ذیل ہے۔

ہارون صدیقی۔ ۲۱۔سی، برڈ وڈ روڈ۔ لاہور

اگر پاکستان کے کسی بنک میں تمہارا حساب ہو تو تم مندرجہ بالا پتے پر چیک بھی بھجوا سکتے ہو۔

امید ہے تمہاری ملازمت کی توسیع کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہوگا یا ہونے والا ہوگا۔ اگر تم اگلے سال نیویارک میں ہوتے تو شاید گرمیوں ہی میں وہاں چند دن کے لئے آ نکلوں۔ اور تم سے ملاقات کی صورت پیدا ہو۔ اکثر جی چاہتا ہے کہ بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں۔ کچھ ادبی، کچھ سیاسی۔ ادب اور سیاست دونوں کا رونا روئیں۔

پچھلے دنوں فیض یہاں آنکلا۔ پہلی مرتبہ ایران آیا۔ سوویت یونین میں کسی جلسے میں شرکت کے بعد اُسے یہاں بھیجا گیا۔ اس کا ارادہ ہے (یعنی حکومت کا ارادہ ہے) کہ دنیا کے مختلف شہروں میں پاکستان کے کلچرل سنٹر کھولے جائیں۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ جہاں آباد ہونے کا ارادہ کرو (تہران یا روم) وہاں ہم سنٹر کھول دیں گے اور تم اس کا چارج لے لو۔ میں نے کہا کہ اعزازی کام کرنے پر مائل ہوں۔ حکومت سے تنخواہ لے کر حکومت کا دوبارہ ملازم بننا نہیں چاہتا۔ پنشن میں گزارہ کر سکتا ہوں۔ مجھے امید نہیں کہ تنگدستی کے اس زمانے میں حکومت کبھی ایسے سنٹر چلا سکے گی۔ اس وقت یوں بھی کلچر کا کیا ذکر ہے، جب ہمارے گلے میں گئی اور پھندے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر کلچرل سنٹر پر سالانہ لاکھوں ڈالروں کا خرچ اُٹھ جائے گا۔ زرمبادلہ اس زمانے میں بہتر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اسلحہ پر نہ سہی، مشینوں پر سہی۔ تاکہ ہمارے لوگوں کو روزی مل سکے۔ کپڑا اور مکان مہیا ہو سکیں۔ دوائیں مل سکیں وغیرہ وغیرہ۔ تاہم اس وقت کی حکومت ایک عجیب قسم کی جنت الحمقا میں سانس لے رہی ہے۔ وہ کام جو ملک کو (رہے سہے ملک کو) متحد رکھنے کے لئے اور اس کی آزادی کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں۔ ان کی طرف نظر نہیں۔ پھر کسان، مزدور، صنعت کار، سرکاری ملازم، قبائل سب بپھرے ہوئے ہیں۔ ان کے مسائل کا کوئی حل کسی کے پاس نہیں۔ طرح طرح کے اعلانات کے ذریعے لوگوں کو سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مسائل بدتر ہونے والے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا سیلاب آنے والا ہے۔ خدا نہ کرے۔

تمہیں اور تمہارے بیوی بچوں کو نیا سال مبارک ہو۔ ہاں یاد آیا میں نے لکھا تھا اگر ہو سکے تو PHEZYME کی چند شیشیاں بھجوا دو۔ ممنون ہوں گا۔

مخلص راشد

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵۔ تہران

۱۰ مارچ ۱۹۷۲ء

پیارے حمید

خدا تمہیں تندرست اور خوش رکھے۔ تمہارا خط پاکر بے حد مسرت ہوئی۔ تم نے میری نظموں کو جس توجہ سے پڑھا ہے اور ان پر جس تفصیل کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ اس کے لئے ممنون ہوں۔ تمہاری رائے تینوں نظموں کے بارے میں درست ہے۔ مجھے ان نظموں میں اپنے انحطاط کا احساس خود بھی ہے۔ شاید یہ سنِ کہولت

نیادہ۔

ہے۔ یوں بھی میں ایک حد تک J. A. RICHARD کا قائل ہوں کہ IMAGES شعر کا
نہیں۔ بلکہ اس کی زینت ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے سب سے زیادہ غرض اپنے بعض فنکار کے اظہار سے
ہی ہے۔ اور ان کی رسالت (COMMUNICATION) کو میں نے اہم جانا ہے۔ میرے نزدیک شاعری
سوات یا الفاظ کا کھیل نہیں۔ بلکہ دوسروں کے افکار میں ہیجان پیدا کرنے کا نثر سے موثر تر ذریعہ ہے۔ البتہ
مشتبہ۔ اور اس میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ اور تم سے زیادہ اس موضوع کے حسن و قبح کو کون
ہے۔

جہاں تک ان نظموں کے معانی کا تعلق ہے، کسی ایک قسم کے مطلب تک انہیں محدود کرنا خود میرے لئے
عل ہے۔ تاہم "شہر میں صبح" میں ایک ایسے شخص کی روداد ہے (اور ساتھ ہی ایک شہر یا ملک کی روداد بھی)
میں بڑی مسافت طے کرکے وارد ہوتا ہے، لیکن شہر کو سنسان پاتا ہے۔ سب لوگ کسی غنیم کا شکار ہو گئے ہیں۔
نیم جیسے کہ تم نے خود اشارہ کیا ہے، کئی شکلیں اختیار کرکے چھاپہ مار سکتا ہے۔ مثلاً قحط، بیماری، وبا،
، وغیرہ۔

تاہم اس نظم میں امید کی جھلک بھی ہے، جو اس نودارد کے اپنے یقین پر مبنی ہے کہ یہ سب غنیم شکست
یں۔ اور شہر والوں کا اپنی اصلی حالت میں لوٹنا ممکن ہے۔ "زمین کا گناہ" میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان کو ہمیشہ
تباہیوں کے لئے الزام دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن انسان کو قضا و قدر سے کچھ نہیں ملا۔ وہ محبت یا عشق نہیں
رکے بغیر انسان کی محرومیاں دور نہیں ہو سکتیں۔ صرف جبر و قہر ملا ہے۔ اس میں ذہن کی کیفیت اس
ت کی سی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر کرکے اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اور وہ ایک حرف محبت کو ترستی
تا ہو۔

جہاں تک "چودنا" کے لفظ کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اس کا فارسی کے تلنے بلنے کے اندر واقع ہونا ایک
حیرت (SURPRISE) کا عنصر پیدا کرتا ہے۔ پھر عربی فارسی میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کی سی شدت
مل ہو۔ اس میں جو "گالی" کا سا اثر ہے وہ میں کسی اور لفظ سے پیدا نہ کر سکتا تھا۔ جماع، مباشرت، ہم بستری
لن یا گایانا وغیرہ کمزور الفاظ ہیں۔ بلکہ بڑی حد تک بیکار بھی۔ انگریزی FUCK سے قریب ترین چودنا
وغیرہ COHABITATION ہیں۔ یوں بھی آج کل کے زمانے میں، زبانوں کی آمیزش
ری میں عام ہو گئی ہے۔ چودنا محض ہندی کا لفظ نہیں۔ بلکہ عوام کا لفظ ہے اور ذہن پر یہ کیفیت گزرتی

ہے اس کا اظہار اس سے بہتر کسی لفظ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ یہ لفظ چھپ نہ سکے گا۔ کوئی "چالاکی" کرنی پڑے گی!

"اندھا کباڑی" ایک ایسا فنکار ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس کی تخلیقات REHASHED ہیں لیکن سمجھتا ہے کہ ان کی اب بھی لوگوں کو ضرورت ہے۔ لوگ اس قدر اندھے ہیں کہ اس کے خوابوں کی اہمیت کو نہیں پا سکتے۔ حتیٰ کہ وہ انہیں صرف مفت ہی نہیں۔ بلکہ اپنے پلے سے پیسے دے کر یہ خواب دینا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں لیتے۔ یہ المیہ تنہا فنکار کا نہیں بلکہ ہر فلسفی اور ہر پیغمبر کا بھی ہے۔ لوگ ان شخصیتوں کو ہمیشہ "اندھا" اور "دیوانہ" سمجھتے رہے ہیں۔ حالانکہ خود اندھے اور دیوانے ہیں۔

اردو کے مستقبل سے میں بھی مایوس ہوں۔ بہت جلد یہ زبان پاکستان کی کلاسیکل زبانوں میں شمار ہونے لگے گی۔ جو کچھ ہم آج کل لکھ رہے ہیں۔ اس کے ترجمے شائع ہوا کریں گے۔ لوگ ان پر "تحقیق" کریں گے، ڈاکٹریٹ لیں گے اور عالم شمار ہوں گے۔ اگر میں پنجابی میں لکھ سکتا تو ضرور لکھتا۔ لیکن پنجابی گھر میں سیکھی ہے، مزاج میں اس حد تک داخل نہیں ہوئی۔ تم نے جو مشورہ دیا ہے سر آنکھوں پر لیکن تم کیونکر کالیداس سے کہہ سکتے تھے، ہندی آنے والی ہے سنسکرت میں مت لکھو یا ورجل اور ہومر سے، یہ کہ اطالیائی زبان رائج ہو جائے گی لاطینی میں مت لکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یوں بھی اس عمر میں اپنی محدود تخلیقی قوتوں کو یہ نیا موڑ دینا مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔

پاکستان کے بارے میں تمہارے دوست کے "تاثرات" کئی اور لوگوں کے تاثرات سے ملتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر پاکستان پر "مادہ پرستوں" کے غلبے یا اثر کا امکان دنیا بھر کے حادثات سے الگ نظر نہیں آتا۔ اس وقت میری نظر میں ایک عالمگیر انقلاب کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ یہ تمام گولہ باری، بمب پھینکنے کے واردات، پناہ گزینوں اور جنگی قیدیوں کی افراط، ویت نام کے لوگوں کا محض تیر کمان سے ایک بہت بڑی قوم کو شکست دینا، نظام زر کی تباہی، ہڑتالیں اس بڑے پیمانے پر، کشت و خون وغیرہ اس انقلاب کے ابتدائی آثار ہیں۔ اور فرانس اور روس کے انقلاب کے ابتدائی واقعات سے مشابہ۔ ۱۹۷۳ء تک یہ انقلاب زور پکڑ جائے گا۔ اور شاید ۱۹۷۵ء تک روئے زمین پر ایسی قوتوں کا قبضہ ہو جائے گا، جو نئی بربریت کے مرحلے سے چل کر نئی تہذیب کی بنیاد، عالمگیر پیمانے پر رکھیں گی۔ پیشگوئی نہیں کر رہا۔ بلکہ موجودہ آثار سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔

پاکستان سے بعض جانے پہچانے لوگوں کی موت کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ شیخ اکرام، حفیظ ہوشیارپوری، ممتاز شیریں وغیرہ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ ہم سب ناپائدار ہیں۔ ہم سب ٹوٹنے والے گھروندے ہیں۔

تمہارا مئی میں شدید انتظار ہے۔ تمہیں کتابوں کی ان دکانوں پر لے جاؤں گا جن میں تصوف کی کتابوں کی
فراط ہے۔ تاکہ تم خود انتخاب کر سکو۔ تم نے جو کتابیں بھجوائیں ان میں سے صرف ایک ملی ہے
DIONYOUS & THE CITY اب تک مفقود ہے۔ (اگر یہ ساتھ لا سکو تو ممنون ہوں گا۔)
۲۱ مارچ کو ترکی رخصت پر جا رہا ہوں۔ ۵ اپریل کو واپس آجاؤں گا۔ بیوی اور بچہ نزین ساتھ ہونگے۔
مخلص راشد

۳۱۔ مونٹ پلیئر ٹریس۔ چیلٹنہم۔ انگلینڈ
۱۰ اگست ۱۹۷۵ء

پیارے حمید

چند دن ہوئے تمہیں خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ تم نومبر میں کہاں ہوگے؟ میں شروع یا وسط نومبر میں پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ البلاغ والوں کا میراجی نما مجموعہ اس وقت زیر طباعت ہوگا۔ اس کی نگرانی مقصود ہے۔ کراچی میں تو شاید نہ رک سکوں۔ اگر رکوں گا تو اس لئے کہ تم سے مفصل باتیں ہوں اور تم میری زندگی کے حالات اگر چاہو تو مجھ سے پوچھ سکو۔ ذاتی گفتگو میں بعض ذاتی واقعات اور مشاہدات اور تجربات بیان ہو سکتے ہیں۔ جو اکثر لکھنے میں مشکل نظر آتے ہیں۔ اگر اس دوران میں تم "نیا دور" کے جمیل جالبی سے سوالی وجواب کا وہ مسودہ جس کا ذکر میں نے کیا تھا۔ منگوا کر اس کی فوٹو کاپی بنوالو۔ تو ہماری گفتگو کو ایک سمت مل سکے گی۔ میں دو چار دن کراچی میں گزار کر لاہور چلا جاؤں گا۔ وہاں آئینہ ادب "جس نے میری کتاب" ایران میں اجنبی" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تھا نیا مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نام ابھی تک متعین نہیں ہوا۔ شاید "گمان کا ممکن" رکھوں گا۔ ایک نظم میں "گمان کا ممکن" کی تکرار بھی ہے اور اس کا تعلق بھی اس نظریئے سے ہے کہ ہم انسان اور ہم انسانوں کے رشتے گمان پر قائم ہیں اور اس میں جو ممکن ہوتا ہے وہ لے لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ نہ ہم لے سکتے ہیں نہ ہمیں ملتا ہے۔

کیا کراچی کے رسالے "افکار" کا "ندیم نمبر" تمہاری نظر سے گزرا؟ ندیم کی تیز گوئی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس کی تیز گوئی تو پہلے ہی مشہور یا بدنام تھی۔ اب یہ محسوس کر کے کہ اس کا انتخاب بھی افکار نے شامل کیا ہے، میرے جیسے شاعروں کے سارے کلام پر مقدار میں بھاری ہے، ندامت ہوتی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی

لغت (VOCABULARY) کس قدر وسیع ہے۔ پھر اس "ابلیسی" دور میں ایسی معصوم اور پاک و منزہ شاعری بہت کم لوگ کر رہے ہیں۔ قاسمی کے سوا۔ اُس کی شاعری پر انسانی فطرت کے اُن نئے انکشافات کا پرتو نہیں پڑا جو فرائڈ کے ہاتھوں ہوا۔ اور مارکس کے اثرات بھی محض اس کی شاعری کے حاشیوں تک محدود ہیں۔ وہ ٹیڑھاپن (OBLIQUENESS) بھی اس کی شاعری میں نہیں جو بعض دفعہ حسن اور بعض دفعہ بدصورتی بن جاتا ہے۔ یعنی کہیں ڈرامہ نہیں، کہیں شوخی نہیں، نہایت شفاف قسم کی شاعری ہے۔ اُس کا فکر اس ڈگر پر چلتا ہے جس پر صدیوں سے اُردو اور فارسی شاعری چل رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو زمانے کی ہوا صرف اسی حد تک لگنے دی ہے جس حد تک اشتراکیت یا "ترقی پسندی" کے نظریات اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ان نظریات کو اسلامی تصورات کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی شاعری کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کروں۔ اگر فرصت ہو تو خط لکھو اور جلد۔

امید ہے بچی کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی ہو گی اور تمہارے سر سے یہ بار بخوشی اور با فراغت اتر چکا ہو گا۔ عابدہ بہن کو سلام۔ بچوں کو پیار۔

مخلص راشد

۱۔ منوہر لال لین
تیس ہزاری
دہلی
۱۰ اگست ۱۹۴۱ء

پیارے حمید۔ تمہارا تیرہ تاریخ کا خط ملا۔ میری نظم پر تمہاری تنقید بڑی بصیرت افروز ہے۔ مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ میری نظم "شب گیر" تم کو پسند نہیں آئی۔ اور تم "حیلہ ساز" کو اس پر فوقیت دیتے ہو۔ غالباً تمہارے ذہن پر دنیا کے حالاتِ حاضرہ کا جو تاثر مرتسم تھا اُس سے یہ نظم کچھ گھُٹ کر رہ گئی ہے! اور اسی وجہ سے اس کی شعریت پر تمہاری نگاہ نہیں پڑی۔

بہرکیف بخاری اور تاثیر نے اسے بہت پسند کیا۔ اور اسے بہت زوردار نظم سمجھتے ہیں اگرچہ اس کے تیور تیکھے اور کرخت ہیں۔

جب میں "حیلہ ساز" لکھ رہا تھا تو بنیادی طور پر میرے ذہن میں "دلدوز" تھی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ یہ ہمارے بیشتر شعرا کا پٹا ہوا مضمون ہے لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس میں ایک ابہام ہے جو ایک خلوص معنویت اور دلکشی کی حامل ہے۔ تم محسوس کرو گے کہ لفظ "ناتواں" اس موقع پر معروضی طرز اظہار ہے۔ وہ جسمانی کمزوری کی علامت ہے اور ذہنی "بیاد" کا حال ہے۔ لیکن "دلدوز" میں کسی قدر داخلیت کا پہلو ہے اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں داخلی اور خارجی دونوں "پہلو" موجود ہے۔

بہرحال مجھے بڑی خوشی ہوئی وہ نظم تمہیں پسند آئی۔ آج کل میں ایک اور نظم لکھ رہا ہوں اور جوں ہی مکمل ہوئی اس کی ایک نقل تم کو بھیج دوں گا۔

فیض نے فرمائش کی ہے کہ میں ان کے "نقش فریادی" پر ایک مختصر سا مقدمہ لکھ دوں۔ میں نے اس کے لئے وقت نکال لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے کہ فیض کو متعارف کرانا میں اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری ذاتی رائے فیض کی شاعری کے متعلق کیا ہے اور یہ کہ اس پر کس رخ سے روشنی ڈالی جائے۔ اس سے مجھے بڑی مدد ملے گی کیونکہ مجھے آل انڈیا ریڈیو نے ذہنی طور پر بیکار شخص بنا دیا ہے۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

تمہارا مخلص

راشد

مکرر۔ میں ستمبر میں تمہارے دلی آنے اور اپنے ساتھ ٹھہرنے کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ نظیری کا شعر یاد آگیا۔

ہ چہ خوش ہست از دو یک دل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن گلہ ۔ راز کردن

ضیا جالندھری کے نام

۳۱۔ مونٹ پلیر

۷ اپریل ۱۹۷۵ء

عزیزی ضیا

حال ہی میں کراچی سے کسی دوست نے اپنے ایک خط میں تمہارے کسی تازہ مضمون کا ذکر کیا ہے۔ جس میں اور باتوں کے علاوہ اس خاکسار کا بھی ذکرِ خیر ہے۔ اُس نے تمہارے مضمون سے صرف دو جملے نقل کیے ہیں۔

۱۔ "گورنمنٹ کالج لاہور کی فضا کے زیرِ اثر راشد بھی نظمِ آزاد کہنے والوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔"

۲۔ "راشد آخری عمر میں نثری نظم کہنے لگے ہیں۔ ان کو یہ ڈر ہے کہ وہ کہیں پرانوں میں شمار نہ ہونے لگیں۔"

صحیح بات یہ ہے کہ میں یہ جملے تمہارے ساتھ منسوب کرنے میں متامل ہوں۔ کیونکہ ان میں لاعلمی کے علاوہ ایک حد تک نیک نیتی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر مجتبیٰ حسین یہی الفاظ لکھتے تو "بریں عقل و دانش بباید گریست" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ لیکن جب تم ایسے بیانات شائع کرو تو چپ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ تم سے ہمیشہ ایک ربط، ایک قرب رہا ہے ذاتی طور پر بھی اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی۔ ان جملوں کو تمہارے ساتھ منسوب کرنے میں اس لئے بھی تامل ہے کہ تم سوچنے والے لوگوں میں ہو اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی عناد موجود ہو۔ تم اگر مجھ پر تنقید کرو جیسے چند بار تم نے کی بھی ہے بلکہ اگر تم میری شاعری کے بخیے تک ادھیڑ ڈالو تو مجھے رنج نہ ہو کیونکہ جب آدمی شعر کہتا ہے یا کوئی اور تخلیقی سرگرمی اختیار کرتا ہے تو وہ تنقید پر اپنی حرف زنی کا حق کھو دیتا ہے۔ لیکن یہ جملے جو تم نے لکھے ہیں یہ نہ صرف غلط اطلاع پر مبنی ہیں بلکہ صریح جھوٹ پر بھی۔

پہلے جملے سے پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ پوری فضا "نظمِ آزاد" سے معمور تھی۔ ایسا کوئی زمانہ اُس کالج میں میری طالب علمی کے زمانے تک نہیں آیا اور نہ شاید بعد میں! اور ایسا بھی ہرگز نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں یہ عام حکم جاری کر دیا گیا ہو، اس کے بعد ہر شخص کو آزاد نظم کہنا

ہوگی ورنہ کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔ پھر تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ حفیظ ہوشیارپوری اسی گورنمنٹ کالج کے طالب علم ہونے کے باوجود آزاد نظم سے بچ نکلے۔ حتیٰ کہ فیض بھی اپنی آزاد نظم نگاری کے لئے (جو ایک مختصر کوشش سے زیادہ نہیں، اُن کے پورے کلام کے مقابلے میں) محض گورنمنٹ کالج کی فضا کے ممنون نہیں۔ وہ میراجی جو آزاد نظم کے شاہنشاہ نکلے انہوں نے کبھی اس کالج کی ہوا تک نہیں دیکھی۔ دوسرا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خاکسار نے جب یہ دیکھا کہ آزاد نظم لکھنے والوں کا ایک "گروہ" موجود ہے تو اس میں (گویا چندہ دے کر) شریک ہو گیا تاکہ کسی سے پیچھے نہ رہ جائے! تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت کوئی ایسا "گروہ" موجود نہ تھا۔ وہ آزاد نظم نگاری کوئی ترقی پسندی کی تحریک بھی نہ تھی کہ اپنے ساتھ گروہ پیدا کرے۔ بلکہ آزاد نظم نگاروں کی آزادی اور انفرادیت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے اپنے طور پر جو چاہیں اور جیسے چاہیں لکھتے رہیں۔ اس وقت تک کچھ تو چند لوگوں کی کوششوں کے نمونے ملتے تھے کچھ ایک آدھ نظم تصدق حسین خالد کی شائع ہوئی تھی۔ غالباً میراجی اُس وقت گیت یا مقفی نظمیں لکھ رہے تھے۔ جانِ من میں نے کبھی کسی اولیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ جن لوگوں نے مجھ کو آزاد نظم کا پیش رو جانا انہوں نے ایک حد تک زیادتی کی یعنی پڑھنے والوں کی توجہ میری شاعری کے دوسرے محاسن یا خصائص سے ہٹا دی۔ تاہم اتنا تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ "ماورا" سے پہلے کوئی مجموعہ ایسا شائع نہیں ہوا تھا جس میں متعدد نظمیں آزاد ہوں۔ اور تم اس کتاب کے دوررس اثر سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہارا یہ بیان پڑھ کر رنج اس بات کا ہے کہ تم اتنا بھی اعتراف نہیں کرنا چاہتے کہ خود راشد میں دیوانگی کا وہ شائبہ موجود تھا جو دوسروں سے الگ راہ پر چلنے کے لئے اکساتا ہے۔ یا کوئی ایسی انفرادیت یا اپج موجود تھی جس نے وہ تمام نظمیں لکھوائیں جو اور شاعروں سے فکر اور اسلوب میں مختلف تھیں۔

دوسرا جملہ عجیب بھی ہے اور غریب بھی! — "آخری عمر" میں نثری نظم لکھنے کے بارے میں۔ کچھ اسی قسم کا جملہ آج سے بارہ برس پہلے میرے بعض نہایت ہمدرد عزیزوں نے کہا تھا: "دیکھو یہ آخری عمر میں دوبارہ نکاح رچانا چاہتا ہے!" — یہ کس کو معلوم ہے کہ "آخری عمر" کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے؟ جوش ملیح آبادی گزشتہ بیس پچیس برس سے "آخری عمر" گزار رہے ہیں۔ اور عبدالعزیز خالد کی پیدائش سے چند سال بعد ہی "آخری عمر" شروع ہو گئی تھی۔ آخری عمر آپ کو کوئی نیا کام کرنے سے، کوئی نئی بات کہنے سے یا نئے طریقے سے کہنے سے کیوں روکے؟ میں تو ہمیشہ پرانوں کو نئے لوگوں میں شامل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ خود کو پرانوں میں کیوں شامل ہونے دوں؟ اور پرانا ہو جانے سے کیوں نہ ڈروں؟ عزیز من۔ تمہارے دو فقرے

وعوں میں غزلوں اور گیتوں کی فراوانی ہے۔ تم نے جو آزاد نظمیں لکھیں (اپنی آخری عمر میں!) اور اُن مجموعوں ں شامل کیں تو کیا پرانوں میں شامل کئے جانے کے ڈر کے باعث نہ تھا؟ سب جاندار اپنی ذات اور اپنے جسم مختلف طریقوں سے بقا اور توسیع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ تم نے اگر آزاد نظمیں لکھیں اور میرے نہ سہی، میراجی کے زیر اثر لکھیں تو میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ پرانی مثل کے مصداق دیئے سے دیا جلتا ہے۔ کسی دیئے کی لاٹ بجھی رہتی ہے کسی کی ہوا سے دبی اور بجھی رہتی ہے!

اگر فرصت ملے تو یہ کتاب پڑھ لو۔ ممکن ہے تم نے پڑھ رکھی ہو۔ کیونکہ خاصی پرانی کتاب ہے۔ اس سے وہ منطقی مغالطے رفع کرنے میں مدد ملے گی جن سے ہم اپنی روزانہ گفتگو اور تحریروں میں گاہے دانستہ گاہے ادانستہ کام لیتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان مغالطوں میں گفتگو کرنے کی عادت پڑ جائے تو یہ آدمی کی شخصیت ور ذات کی پختگی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ "CLOUDED THINKING", BY SUSAN STEBBING.

یہاں اکثر احباب تمہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔ ساقی اور سحاب خاص طور پر۔ گو وہ ہر دو اچھے پاکستانیوں کی مانند ایک دوسرے کے بارے میں کوئی حسنِ ظن نہیں رکھتے۔ اور میری تالیف قلوب کی کوششیں بھی چنداں کامیاب ہوتی نظر نہیں آتیں، لیکن تم ان دونوں میں بلکہ ہم تینوں کے درمیان مشترک ہو۔

مخلص راشد

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے نام

تہران

۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء

جناب ڈاکٹر صاحب

خدا آپ کو زندہ اور بخیریت رکھے۔ چند دن ہوئے کسی عزیز نے آپ کے مضمون "ادب سے ادب تک" کا تراشہ میرے نام بھجوایا۔ آپ ان اربابِ قلم میں سے ہیں جن کی محنت اور کاوش کی میرے دل میں ہمیشہ سے قدر چلی آتی ہے۔ اس سے پہلے آپ کا وہ مضمون بھی نظر سے گزرا ہے جو آپ نے "نیا دور" میں میرے

ایک خط کے بارے میں لکھا تھا جس میں پاکستان کے کلچر سے بحث کی گئی تھی۔

درآنحالیکہ میں اب بھی اپنے آپ کو آپ کے مداحوں میں شمار کرتا ہوں۔ ان دونوں مضامین میں بعض ایسے اشتباہات کا احساس ہوا جنہیں آپ کی ذات گرامی سے وابستہ کرنا مشکل ہے۔ خاص طور پر یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوئی کہ آپ نے ان مضامین میں اپنے نتائج مرتب کرنے کے لئے "قابلِ اعتراض" تحریروں سے وہ جملے انتخاب کئے ہیں جو ان میں کہیں موجود نہیں۔ یا بعض جملوں کو عمداً یا اتفاقاً اس طرح مسخ کیا گیا ہے کہ وہ قابلِ اعتراض بن جائیں۔ دوسرے کئی مقامات پر آپ نے اپنی تردید آپ کی ہے۔ تیسرے آپ نے قابلِ اعتراض مصنفین کے "لاشعور" کی طرف اشارات کئے ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں اگر آدمی کسی مصنف کے شعور کی سطح تک ہی پہنچ جائے تو اسے غنیمت جاننا چاہیئے۔

اسی مضمون میں جو "ندائے ملت" میں چھپا ہے کئی طرح کے "تناقض پائے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اصل عبارت کو مسخ کرنے کا سوال ہے ایک مثال اس کی یہی ہے کہ آپ نے "لا = انسان" کے دیباچے کے حوالے سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "میری ذہنی زندگی میں ماضی کی کوئی حیثیت نہیں"۔ یہ الفاظ میرے نہیں ہیں۔ میں نے اس دیباچے میں صرف یہ بات کہی ہے کہ "مجھے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نمودار نہ ہو۔" دونوں بیانات میں فرق واضح ہے۔ یعنی میری زندگی میں یقیناً ماضی کی بڑی حیثیت ہے لیکن مجھے اس سے دلچسپی نہیں۔ اور اس کی وجہ بھی میں نے بیان کی ہے کہ میرے نزدیک ماضی کے تجربات ہمارے آئندہ یا موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ (شاید چند تجربات کر سکتے ہوں لیکن سب نہیں) اور میرے نزدیک ہماری قوم کا مسئلہ گزشتہ ہزار سال کا نہیں آئندہ ہزار سال کا ہے۔" میں یقین رکھتا ہوں کہ ہمیں قوم کی حیثیت سے ماضی پر کم اور آئندہ پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ یعنی اپنے اندر اس آئندہ کو محسوس کر کے اس کے لئے خود کو مسلح رکھنا چاہیئے تاکہ ہم زندہ تر قوم بن سکیں۔ جو قومیں ماضی کی طرف زیادہ دیکھتی ہیں وہ بوڑھی قومیں ہیں۔ وہ اپنی یادوں کی رونق میں دن بسر کرنا چاہتی ہیں۔ جوان اور توانا قومیں جوان اور توانا افراد کے مانند صرف آئندہ کو دیکھتی ہیں۔ یہ بات میں نے بڑے درد دل کے ساتھ کہی ہے اور اسے محض تمسخر سمجھ لینا بڑی زیادتی ہوگی۔

اسی ضمن میں آپ نے اپنی طرف سے "ذہنی زندگی" کی طرف اشارہ کرنے کے بعد "لاشعور" کا ذکر کیا ہے اور یہ الزام لگایا ہے کہ میرے لاشعور میں ہڑپا اور موہنجوڈارو کی (کا؟) ماضی ابھی تک محفوظ ہے۔ صرف اسلامی دور کی ماضی کو فراموش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ تحلیلِ نفسی کے ماہر ہوتے تو میں لاشعور کے بارے میں آپ کی

اس دریافت کو بصد شکریہ قبول کر لیتا۔ لیکن جہاں میں آپ کی تحقیق اور تنقید سے اکثر مستفید ہوا ہوں۔ آپ نے کبھی تحلیل نفسی کے بارے میں اپنے علم کا راز کسی پر افشا نہیں ہونے دیا۔ آج تک میں نے اپنی کسی نظم یا نثر میں ہڑپا یا موہنجو ڈارو کی تعریف تو کیا اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ نہ کبھی ہندو تہذیب کی ثنا خوانی کی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں وہ خط ہو جو میں نے "نیا دور" کو لکھا تھا تو اس میں بھی نہ ہڑپا اور موہنجو ڈارو کا ذکر ہے نہ ہندو تہذیب کی کوئی تعریف ہے۔ میں نے صرف اس "مٹی" کا ذکر کیا ہے جس سے ہم آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور وہ پاکستان ہی کی مٹی ہے۔ اسی کے رسم و رواج، اسی کے گانے بجانے، اسی کی کہاوتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن سے ہماری اسی فیصدی آبادی حظ حاصل کرتی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے نہ صرف میرے بیان کو حسب ضرورت مسخ کیا ہے بلکہ اجازت دیں تو عرض کردوں کہ "مقدمے بازوں" اور مناظرہ بازوں کے مانند ایک غیر ضروری بہتان بھی باندھا ہے۔ درآنحالیکہ آپ اپنے اس مضمون میں "ادب میں جھوٹ" کے سخت شاکی نظر آتے ہیں۔ آپ کا اپنا بیان جھوٹ بن کر رہ گیا ہے۔ جو آپ کے قول کے مطابق "مقدمے باز" بولتے ہیں۔ یہاں اس مضمون سے مفصل بحث کرنے کی گنجائش نہیں جو آپ نے "نیا دور" کے لئے لکھا تھا۔ لیکن اس میں بھی اس قسم کے ادبی یا غیر ادبی جھوٹ کم نہیں تھے۔ پھر آپ یہ غلط فہمی پھیلانا چاہتے ہیں کہ مجھے اسلامی تہذیب یا بقول آپ کے اسلامی ماضی کو فراموش کرنا منظور ہے۔ حالانکہ میری تمام شاعری کے یا قریب قریب تمام شاعری کے مقاصد وہی ہیں جو اقبال کی شاعری میں آپ کو عزیز رہے ہیں۔ اور جو اسلام سے کسی طرح الگ نہیں۔ حیرت ہے کہ آپ کو میرے کلام میں انسان دوستی کی کوئی مثال کیوں نہیں ملی یا استعمار اور غلامی سے نفرت کا احساس کیوں نہیں ہوا۔ رنگ و بو کی تمیز کے خلاف نظمیں پہلے دو مجموعوں میں بھی موجود ہیں اور تیسرے میں بھی۔ آپ کو میری شاعری میں مقصد کے وجود ہی سے انکار ہے۔ اور ساتھ ہی آپ پھر "مقدمے بازوں" کی طرح یہ کہہ رہے ہیں کہ راشد کو "خود بھی اعتراف ہے" کہ اس کی شاعری میں کوئی مقصد نہیں۔" لا = انسان" کے دیباچے میں میں نے نہ صرف اس قسم کا کوئی "اعتراف" نہیں کیا بلکہ لکھا ہے کہ "میری شاعری نصب العین سے خالی نہیں لیکن وہ نصب العین ذاتی ہے۔" "ایران میں اجنبی" کے نئے دیباچے میں میں نے شاعری میں مقصد پر مزید اصرار کیا ہے جہاں تک اسلامی ماضی کا ذکر ہے میں نے اس خط میں بھی جو "نیا دور" میں چھپا تھا اس کا دوگانہ ذکر کیا ہے۔ ایک ان اخلاقی اقدار کی صورت میں جو عربوں کی وساطت سے ہم تک پہنچیں یعنی وہ اخلاقی اقدار جو اصل اسلام ہیں۔ دوسرے ان جمالیاتی اقدار کی صورت میں جو ہم نے ایران سے حاصل کیں۔ میں نے پاکستانی قوم کی ساخت میں چار اجزا کا ذکر کیا

ہے جن میں یہ دو جزو خالص اسلامی ہیں۔ اور جن کا حصہ اس لحاظ سے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ ہے۔ میں نے صرف اس بات پر زور دیا ہے کہ مقامی رنگ و روغن کو فراموش کرنا یا نئے تکنیکی علوم کو صرفِ نظر کرنا کسی طرح ہمارے حق میں مفید نہیں۔ یہ چاروں اجزا ہماری زندگی پر حاوی نظر آتے ہیں۔ غذا، لباس، مکانوں کی ساخت، نشست و برخاست کے طریقوں میں۔ اور سب سے بڑھ کر ہماری زبان اُردو میں۔ جس کا ایک چوتھائی حصہ مقامی ہے۔ دو چوتھائی یا آدھا حصہ اسلامی ہے اور ایک چوتھائی کے لگ بھگ "فرنگی" بھی۔ میں نے صرف ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میرا اب بھی خیال ہے کہ ہمیں اپنی پاکستانی شخصیت کی تخلیق میں ان اجزا سے فائدہ اٹھا کر ان کے امتزاج کے ذریعے یہ نئی شخصیت پیدا کرنی چاہیئے۔ اپنی قومی زندگی کے اس مرحلے پر ان میں سے کسی جزو کو حذف کرنا ہمارے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔ آپ نے میرے اس خیال کو بھی مسخ کر کے یہ تاثر پیدا کیا تھا کہ میں ہندو تہذیب کو قائم کرنا یا اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں! تاہم آپ جانتے ہیں خود اسلام نے بھی ایام جاہلیت کی بعض رسموں پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ انہیں (نئے رنگ میں ہی) زندہ رہنے دیا تھا اور ان میں اخلاقی اور روحانی اثرات داخل کر دیئے تھے تاکہ وہ توہمات اور خرافات سے آزاد ہو جائیں۔ یہی کام ہم اپنے دیہاتی رسم و رواج اور شعر و آہنگ وغیرہ کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اپنے دیہات کی ان خوبصورت چیزوں کو ختم کرنا جو ہماری اسی فیصد آبادی کے لئے حظ کا باعث ہیں کسی طرح دانشمندی نہیں۔ یہ رسوم و رواج اور یہ میلے ٹھیلے ہندو مذہب کی پیداوار نہیں ہیں اور انہیں قائم رکھنے سے ہندو مذہب کے احیا کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ یہ ہماری اپنی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ اور اپنی سرزمین سے عشق کرنا کسی طرح اسلام کی نفی نہیں۔

اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اسلام مادی خوشحالی کی نفی بھی نہیں کرتا مادی خوشحالی کے جو ذرائع مغرب نے تلاش کئے ہیں وہ ہمارے کام آ سکتے ہیں اور آ رہے ہیں۔ اور یہی ہماری زندگی کا چوتھا ضروری جزو ہے۔ ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ ہم بھی خوشحالی کے نئے نئے وسائل دریافت کرنے کے قابل ہوں۔ اسلام مادی خوشحالی میں سب کی شرکت کا جویا ہے۔ صرف اس خود غرضانہ مادی خوشحالی کا مخالف ہے جو انسان کو انسان کا غلام یا دشمن بنا دیتی ہے۔ اور جس کا نتیجہ بے اطمینانی اور بالآخر باہمی آویزشوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

ایک اور بات جس پر حیرت ہوئی یہ تھی کہ آپ مجھ سے اس لئے خوفزدہ رہے کہ میری شاعری میں

"جھنجھلاہٹ، انتقامی برہمی اور شدت اشتعال" تھی۔ لیکن آج کل کے جوان شاعر آپ کو اس لئے "بُرے نہیں لگتے" کہ آپ ان کی آشفتگی کے اسباب جانتے ہیں!۔ آپ کو میری جھنجھلاہٹ وغیرہ کے اسباب سمجھنے میں کیوں دقت پیش آئی۔ جب کہ آپ کا ہمارا دور مشترک تھا جب ہم غیر کی غلامی کے نیچے پس رہے تھے؟ اور اب جبکہ آپ اور نوجوان شعرا میں ایک عمر کا بُعد ہے اور آپ ان کے مسائل کو محض دوری سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کیسے اتنی آسانی سے "آشفتگی کے اسباب" جان گئے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان جوانوں سے اور بھی خوفزدہ ہیں۔ اور ان کی مزید "آشفتگی" سے بچنے کے لئے اپنے اندر "ایک سچے آدمی کی آواز" کو دبا رہے ہیں۔ پھر آپ نقاد بھی ہیں۔ آپ کو میری شاعری پڑھ کر یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ میں جھنجھلاہٹ کے اظہار کا شاعر نہیں بلکہ اس جھنجھلاہٹ کا محض عکاس ہوں (ادبی لحاظ سے یہ عکاسی درست ہو یا غلط) جو میرے اور آپ کے اردگرد اس وقت پائی جاتی تھی؟

آخر میں اتنا عرض کر دوں کہ "لا = انسان" میں "لا" نفی کا نہیں۔ اس لئے اس کا "الا" تک پہنچنا ممکن ہے نہ ضروری۔ یہ الجبرے کا "لا" ہے جس سے ہم کوئی نامعلوم قیمت بیان کرنے کے لئے کام لیتے ہیں۔ "لا مساوی انسان" کہہ کر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان ایک نامعلوم قیمت ہے زندگی کی مساوات میں۔ اور شعر ہو کہ نغمہ نقاشی ہو یا کوئی اور فن۔ سب اس نامعلوم قیمت کو دریافت کرنے کی کوششیں ہیں۔ اور ہر قدر کی قیمت آخر انسان ہے۔ گویا اس میں بھی آپ نے میرے "لا" کو عمداً یا عدم واقفیت کی بنا پر مسخ کر دیا ہے۔ میں کسے کس سچے آدمی کی آواز کیوں کر کہوں؟ اسی قسم کا اشتباہ آپ نے اس مضمون میں بھی کیا تھا جو "نیا دور" میں چھپا۔ آپ نے لاطینی رسم الخط کو اس لئے مردود قرار دیا کہ اس میں انگریزی کا حرف "سی" سین کی آواز بھی دیتا ہے اور ک کی بھی۔ شاید آپ نے حرف اور صوت کے رشتے پر کم غور کیا ہے۔ لاطینی رسم الخط کو رواج دینے سے پہلے ہمیں انگریزی کے مروجہ تلفظ کو فراموش کرنا ہوگا۔ حروف تصویریں ہیں اور یہ انہیں اصوات کے لئے استعمال ہو سکتی ہیں جو ہم خود چاہیں۔ چنانچہ اگر ہم لاطینی رسم الخط اختیار کریں گے تو ظاہر ہے کہ ہر نشان ایک مقررہ صوت کے لئے استعمال کریں گے اور وہ افراتفری نہیں پیدا ہونے دیں گے جو انگریزی لکھنے میں پائی جاتی ہے یا اردو میں ایک ہی صوت کے لئے عربی کی تین تین چار چار علامتیں بحال رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ بہرحال یہ بحث طویل ہے اور اس وقت اس کا کوئی عملی موقع بھی نہیں۔ اس امر کی طرف اشارہ کر کے مکرر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علمی مباحث کے لئے ایک تو ہمیں سب سے

پہلے وہ ناواقفیت کم کرنی چاہیئے۔ جو ہمیں بغیر ضروری اعتماد کے ساتھ اپنی آرا بیان کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دوسرے آپ ہی کی تلقین کے مطابق "ادب میں جھوٹ" سے بچنا چاہیئے۔

دعا ہے کہ آپ خیریت سے رہیں۔ خدا ہر کام میں آپ کا حامی و ناصر ہو۔

مخلص راشد

امین حزیں کے نام

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵۔ تہران۔ ایران

۱۰ مارچ ۱۹۷۳ء

پیارے امین

زندہ رہو اور خوش رہو۔ تمہارا ۱۰ فروری کا لکھا ہوا خط ابھی تک جواب طلب رہا ہے۔ آج فرصت ملی تو یہ چند سطور لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

شہری آج کل پیرس میں ہے۔ پاکستان کے سفارت خانے میں تھرڈ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہا اور ساتھ ساتھ اسے فرانسیسی زبان کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس کی بیوی ابھی تک کراچی میں ہے۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہو گئی۔ اور اس لئے ابھی تک پیرس نہیں جا سکی۔ وہ اپنے اس رشتے سے خوش معلوم ہوتا ہے۔ اور میں نے بھی اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کہ کیوں مجھے شادی میں شریک نہ کیا گیا یا اجازت نہ لی گئی یا اطلاع نہ دی گئی۔ کچھ تو زمانہ بدل گیا ہے اور کچھ ماں باپ کی خیریت آج کل اسی میں ہے کہ وہ اولاد کے ان معاملات میں زیادہ دخل نہ دیں۔ اس کی بیوی عفت یونیورسٹی میں اس کی ہم جماعت تھی اور وہیں دونوں کو ایک دوسرے سے رغبت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ خدا کرے کہ دونوں باہم خوش رہیں اور ان کی شادی دونوں کے لئے مبارک ثابت ہو۔

باقی بچے بھی اپنے اپنے حال میں خوش ہیں۔ نسرین یہاں کام کر رہی ہے اور جیسے میں لکھ چکا ہوں ایک ایرانی گھر میں رہتی ہے اپنی مختصری آمدنی میں گزارہ کر لیتی ہے۔ یاسمین کے ہاں گزشتہ ستمبر میں لڑکا پیدا ہوا تھا یعنی اب چھ ماہ سے زیادہ کا ہو گیا ہے۔ ماہین کے دو بچے ہیں، ایک لڑکا ایک لڑکی۔

ارادہ ہے کہ ہم (میں شیلا اور تریل) پندرہ دن کی رخصت پر ۲۱ مارچ کو قبرص جائیں۔ تمہیں اپنے

یورپ کے سفر میں یہ جزیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا یا نہیں؟ سنا ہے، یہ آثارِ قدیمہ سے اٹا پڑا ہے۔ ان میں اسلامی زمانے کے آثار بھی بہت سے اب تک موجود ہیں۔ جون میں شیلا اور نزیل تو یورپ جائیں گے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ پاکستان آؤں۔ اسلام آباد جاؤں گا یا دہاں کی زمین پر مکان تعمیر کرنے کا انتظام کر دوں گا یا اسی پچ کر لاہور میں بنا بنایا مکان خریدوں گا۔ تمہارا مشورہ کیا ہے۔ یوں ہندوستان کے رویّے کو دیکھ دیکھ کر دل ڈرتا ہے یقین نہیں ہوتا کہ ہم جو اس وقت بے یار و مددگار رہ گئے ہیں (سوائے چین اور ایران کے ہمارا کون ہے اور یہ بھی یہ کیسے خوفزدہ نہ ہوں تو کیا کریں؟) آزاد رہ سکیں گے۔ پھر اندرونِ ملک لوگ اندھے بہرے اور جاہل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے اتحاد سے اس ملک کو اور مضبوط کریں۔ پانی گندہ کر کے اس میں اپنے اپنے لئے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی ایسا نقشہ بنانے کی ہمت نہیں پڑتی جو پائیدار ہو۔ پھر گورنمنٹ نے طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ یعنی ذاتی سامان میں بھی کار یا دوسری چیزیں کوئی درآمد نہیں کر سکتا۔ یوں تو طبعاً درویش ہوں لیکن پچھلے بیس برس سے زندگی کا ایک معیار بن چکا ہے۔ اسے بدلنا مشکل ہے۔ خاص طور پر فرنگی بیوی کے ہوتے ہوئے۔ یہ جانتا ہوں کہ آئندہ زندگی کے لئے سب سے بڑا سہارا پاکستان ہی ہے۔ وہیں عزیز اور دوست بھی ہیں اور وہیں میری تمام ادبی شہرت بھی ہے۔ لیکن اپنی پیرانہ سری سے ڈرتا ہوں۔ ایک تو ہمارے ایشیائی ملکوں میں جہاں آبادی کی کثرت اور کام کی قلت ہے۔ بوڑھا آدمی نکما ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ہمارے ہاں بوڑھے آدمی کی عزت نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے احباب اور عزیزوں اور معاشرے کے لئے بار سمجھا جاتا ہے۔

بیوی خدا کے فضل سے نہایت نیک خصلت اور اوصافِ حمیدہ کی مالک ہے۔ اگرچہ بعض دفعہ غالبؔ کا یہ مصرع زبان زد ہو جاتا ہے۔ "ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں!" لیکن بحیثیت مجموعی بے حد محنت کش، ہمدرد اور وفادار عورت واقع ہوئی ہے۔ اسے پاکستان میں صرف لاہور پسند ہے۔ لیکن اُسے بھی اگر ڈر ہے تو یہ ہے کہ شاید کوئی حسبِ منشا مصروفیت کا ذریعہ نہ مل سکے اور شاید فرنگی جان کر لوگ وہ عزت نہ کریں۔ جو مغربی ملکوں کے علاوہ ایران میں بھی اُسے گزشتہ پانچ چھ سال میں حاصل رہی ہے۔ آئندہ پروگرام کے بارے میں ہم میں اکثر اختلاف رہتا ہے۔ شاید حالات کی قدرتی روش خود بخود اس الجھن کو سلجھا دے۔ لطیفہ بہن کو ہم سب کی طرف سے سلام دعا۔ بچوں کو پیار۔

مخلص راشد

۲

پوسٹ بکس ۱۵۵۵ تہران ایران

۲۳ اپریل ۷۳ء ۱۹ء

برادر عزیز

تمہارا ۳ اپریل کا خط پیش نظر ہے۔ تم نے کیا خوب کہا ہے کہ آج کل اولاد پیدا کرنا اور انہیں پال پوس کر بڑا کرنا بہت بڑا سانحہ ہے! تمہارے بھی چھ بچے ہیں اور میرے بھی۔ ساری زندگی ان کی خاطر کھپتے گزر گئی ہے۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا نیک بخت ہو جسے اس بات کا احساس ہو۔ اگرچہ میرے بچوں میں سے کسی نے بھی حسب دلخواہ کمال حاصل نہیں کیا۔ لیکن اس حد تک ضرور مطمئن ہوں کہ ان میں سے کم از کم تین اس وقت زندگی کی اس ڈگر پر چل رہے ہیں جو خود انہوں نے اپنے لئے انتخاب کی اور اپنے حال میں خوش نظر آتے ہیں۔ تمرین کا موجودہ نظام ختم ہو جائے تو وہ بھی اپنا راستہ خود تلاش کرے گی۔ نزیل ابھی آٹھ برس کا ہے۔ اس کے سامنے بڑی منزل ہے۔ اور مجھے یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ میں اپنی زندگی میں اُسے بامراد دیکھ سکوں گا۔ نسرین نے ازل سے ایک بے قرار روح پائی ہے۔ بڑی حد تک اپنی موجودہ مصروفیت سے مطمئن نظر آتی ہے۔ لیکن مجھ سے عجیب و غریب تقاضے کرتی، اور توہین آمیز باتیں کرتی رہتی ہے۔ اگرچہ پہلے سے بہت کم۔ خدا اس کو تسکین قلب دے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کی شادی نہیں۔ ورنہ بچوں کی ماں بن کر اگر اُسے طلاق مل جاتی جب کہ اُسے کوئی ہنر تک نہیں آتا تو ایک مصیبت برپا ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی اور مجھ ناچیز کے لئے بھی! بہرحال کوئی خفیہ ہاتھ میرے سر پر ضرور موجود ہے۔ جو مجھے حد سے زیادہ مصائب سے بچاتا رہتا ہے۔ اکثر زندگی کے سانحوں کا شمار کرتا ہوں، جن میں کار کے تین چار حادثے، ڈاکو کا حملہ، ڈوبتے ڈوبتے بچ جانے کے تین واقعات وغیرہ شامل ہیں، تو خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔ پھر جیسے ایک دوست کہا کرتے ہیں، خدا "حلال" تو سب کو دیتا ہے، جس کو "حرام" کی توفیق دے، اس پر اس کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس کی خاص عنایات کا اہل رہا ہوں۔ جہاں تک روزگار کا تعلق ہے، کبھی بھول نہیں سکتا کہ تیس روپے کی ملازمت ایم اے کرنے کے بعد بمشکل ملی تھی (جس سے میں نے تمہیں بچا لیا تھا!) اور اب جب کہ ریٹائر ہونے میں چھ ہفتے سے کم وقت رہ گیا ہے۔ اپنے کئی حریفوں سے بہتر حالت میں ہوں۔ اس کے علاوہ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ زندگی بھر دشمن ساتھ لگے رہے ہیں، لیکن جب بھی کسی نے دشمنی حد سے بڑھ کر کی ہے، تو دُکھ ناقابل تلافی

نقصان پہنچا ہے۔ اور نیاز مند کو خدا نے ہر قسم کی ذلت اور رسوائی سے صاف بچا لیا ہے۔ خدا کا بار بار شکر ادا کرتا ہوں۔

البتہ گذشتہ بیس اکیس برس جو ملک سے باہر گزرے ہیں تو "چال چلن" اس حد تک خراب ہو چکا ہے کہ ملک واپس آنے کے خیال سے لرزتا ہوں۔ آئین کا بنا لینا، ایمان کی حرارت والوں کا شب بھر میں مسجد بنا لینے کے برابر تھا؟ لیکن اس مسجد میں بھی، ہر مسجد کے مانند، "نمازیوں" کی کمی کی شکایت ہمیشہ رہے گی ہماری قوم الجھی ہوئی قوم ہے۔ ہم میں محب وطن کم ہیں، افلاس نے دیانتداری کا دیوالہ نکال دیا ہے لوگ اپنے قدموں سے آگے کسی اور تک نہیں دیکھ پاتے۔ ہر شخص پانی کو خود گدلا کرکے مچھلیاں پکڑنے کا عادی ہو چکا ہے۔ باہمی بے اعتمادی کی وجہ سے ہر کاروبار میں رخنہ پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، یہ امراض گہرے ہیں، ان کا علاج صدیوں میں ہو تو ہو۔ یا خدا اپنے قانون کے مطابق کوئی بہتر قوم، اس قوم کی جگہ پیدا کر دے، لیکن بہت جلد اس قوم کی حالت کے درست ہونے کی امید نہیں ہے۔ تم نے ملک سے باہر سفر کیا ہے۔ لیکن باہر رہے نہیں۔ یہ اتنا عرصہ ملک سے باہر رہنا میرے لئے ایک طرح سے بلائے جان بن گیا ہے۔ اخلاق کے بلند تر معیار کی توقعات ہر شخص نے پیدا کر دی ہیں۔ جو کہ ناجائز توقعات ہیں! کیونکہ سب کا اخلاق درست ہونے کے قابل ہوتا تو دنیا میں فلسفی، شاعر اور پیغمبر کبھی پیدا نہ ہوتے۔ بلکہ کہیں حکومت کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ پولیس اور فوج کا نام بھی کسی نے نہ سنا ہوتا۔ لیکن انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ البتہ "شر" کو محدود رکھنا ضروری ہے۔ جو محض پولیس اور فوج کی مدد سے ممکن نہیں۔ آئین منظور کر لینے سے بھی یہ عزم تکمیل نہیں پا سکتا۔ شاید تعلیم کا نظام بدلنے کی ضرورت ہو، نیا نظام کیا ہو؟ کون کہہ سکتا ہے۔ شاید ایسی حکمت عملی اور ایسی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے کہ بیرونی خطرات کا منحوس سایہ ہمارے سر سے اٹھ جائے۔ شاید ایسے قدرتی وسائل کی دریافت ضروری ہے، جو دوسروں کو ہمارا محتاج کر دے۔ یا دوسروں کے دل میں ہمارا احترام بڑھا دے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تم خوش قسمت ہو کہ اپنے حالات پر مطمئن ہو بلکہ اس قابل ہو کہ اپنے ملک پر فخر کر سکتے ہو آخر بدبینی کا فائدہ بھی کیا ہے؟ خوش بینی اکثر الجھنوں کو دور کر دیتی ہے۔ یا کم از کم بعض زہروں کا تریاق ضرور ثابت ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خوش بینی کے سوا آدمی کو چارہ بھی کیا ہے؟ اور تم نے اپنے لئے یہ خوب راستہ نکالا ہے۔

میں ریٹائرمنٹ کے بعد، اگر وقت مل جائے، تو لکھنا پڑھنا چاہتا ہوں۔ اردو کے قاعدے سے شروع کرکے شیکسپیئر تک دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ آج کل جو کچھ لکھا جا رہا ہے اسے بھی پڑھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ کچھ نظم و نثر

لکھنا چاہتا ہوں۔ محض چھڑی لے کر گھومنے، حقہ پینے یا شطرنج کھیلنے کی تمنا ہرگز نہیں۔ لیکن اپنے ارادوں کی تکمیل شاید ملک میں نہ ہو سکے۔ اور ملک کے باہر جہاں نہ صرف کتابوں کی افراط ہے، بلکہ اہلِ علم بھی گوشے گوشے میں ملتے ہیں۔ اور جہاں ذہن کے لئے ہر قسم کی تحریک کے سامان موجود ہیں۔ شاید میں اپنے عزائم بہتر پورے کر سکوں۔ بڑی ساری زندگی اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کی تلاش میں گزر گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ ایسا کام کروں جو دیرپا ہو اور جو فیض جاری بھی بن جائے۔

خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم اکثر بہت یاد آتے رہتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ پایا ہے۔ اگرچہ تم نے علم کو پشتِ پا دکھا کر، کاروبار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ لیکن دنیوی امور میں تم ایک "جاتی" سوجھ بوجھ رکھتے ہو۔ جس نے تمہاری ہر موڑ پر رہنمائی کی ہے۔ تمہارے اندر میں نے ہمیشہ ایک عجیب قوت کا احساس کیا ہے جس کے بغیر تمہارا اس دنیا کے سیلاب یا سیلابوں پر تیرتے رہنا ناممکن ہو جاتا۔ خدا تمہیں زندگی اور صحت دے۔

لطیفہ بہن کو ہم دونوں کی طرف سے سلام دعا۔ بچوں کو پیار۔

مخلص راشد

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام

۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۲ء

برادرِ عزیز

میں آپ کا ایک ادنیٰ "مضمون نگار" ہوں۔ لیکن، یا شاید اسی لئے "نیا دور" مجھے نہیں پہنچا۔ حال ہی میں "نیا دور" کا تازہ نمبر کسی دوست کی وساطت سے موصول ہوا ہے۔ اس پر کسی کے دستخط بھی ہیں۔ معلوم نہیں کن صاحب نے یہ کرم فرمایا ہے۔ اس نمبر میں آپ نے جدید اردو شاعری پر متعدد مضامین شائع کرکے بڑا کام کیا ہے۔ تاہم اگر آپ اجازت دیں تو آپ سے اتنی شکایت ضرور کر دوں کہ میرے مضمون کے ترجمے پر کئی طرح کی زیادتیاں کی گئی ہیں۔ ایک تو ثنار اللہ صاحب نے وعدہ فرمایا تھا کہ ترجمہ شائع کرنے سے پہلے مجھے دکھا لیا جائے گا۔ اور یہ ممکن بھی تھا کہ اس کی ایک نقل مجھے یہاں بھجوا دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے

اس مضمون میں ایک پیراگراف جمیل الدین عالی کی شاعری کے بارے میں تھا جسے بلاوجہ حذف کر دیا گیا ہے۔ تیسرے اکثر مقامات پر میرا مفہوم بدل گیا ہے۔ معلوم نہیں کن صاحب نے ترجمہ کیا۔ اور یہ سب کچھ کیوں ہوا۔

پروفیسر احمد علی صاحب کے مختصر مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے آج کل پڑھنا لکھنا ترک کر رکھا ہے۔ ادب کے بارے میں ان کی معلومات میں پہلے بھی کئی رخنے ہوا کرتے تھے۔ اب نظر آتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔ انجم اعظمی صاحب ابھی نوجوان ہیں۔ اپنے تجربے سے خود سیکھیں گے۔ لیکن ان کے مضمون میں اس قسم کے PLATITUDE ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی آپ کے رسالے کو نہیں کرنی چاہیئے۔ سارے مضمون کا انداز سرپرستانہ ہے اور یہ بات کسی نوجوان کو کم زیب دیتی ہے۔ ساقی فاروقی مجھے ذاتی طور پر بے حد عزیز ہیں۔ لیکن ان کی ناپختگی ان کے مضمون نے واضح تر کر دی ہے۔ پھر انھوں نے ظلم یہ کیا ہے کہ اکثر اشعار خلط ملط کر دیئے ہیں۔ اقتباسات غلط ہیں۔ اور بے ربط ہیں۔ ان مغربی ملکوں میں رسالوں کے مدیر اپنے رسالوں کے وقار کی خاطر ان امور میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ معلوم نہیں آپ اس پر توجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں۔ کبھی کبھار نیا دور بھجوا دیا کیجئے۔ اُردو کے اس صحرا میں یہ نخلستان کا کام دے گا!

شاہد صاحب، زبیری صاحب، عباس صاحب سے ملاقات ہو تو نیازمندانہ سلام کہئے۔

مخلص راشد

۲

پوسٹ بکس ۱۵۵۵ ۔ تہران، ایران

۱۹ر مارچ ۱۹۶۸ء

برادرِ عزیز

آپ کا ۵ر مارچ کا خط کل موصول ہوا۔ پاکستان اور ایران کے درمیان ڈاک میں تاخیر کی شکایت اور بہت سے لوگوں نے بھی کی ہے۔ میں نے خود RCD والوں کی توجہ اس طرف دلائی ہے۔ ایران اور انگلستان یا امریکہ کے درمیان خط چار پانچ دن میں پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ تاخیر پاکستان میں واقع ہوئی ہے۔ شاید آپ کے ہاں اب بھی کسی قسم کا احتساب بدستور موجود ہو۔ خدا نہ کرے۔

مرحوم شاہد صاحب کے بارے میں ایک مختصر مضمون لکھ کر چند دن میں بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ بعض یادیں ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخیں یاد نہیں۔ پھر میرے پاس ان کی تصانیف یا ساقی کے

پرچے بھی یہاں نہیں ہیں۔ جہاں تک حافظے نے کام کیا چند حروف قلم بند کر دوں گا۔ ذاتی طور پر کوئی کام سرسری طریقے سے کرنے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ لیکن از رہِ امتثالِ امر جو کچھ یاد آیا لکھ بھیجوں گا۔ اگر یہ مضمون آپ کو کم مایہ یا کم پایہ نظر آئے تو شائع نہ کیجئے گا۔

جدید شاعری پر آپ ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ اگر شائع ہو گئی ہو تو ایک نسخہ اس نیاز مند کو بھی بھجوا دیجئے۔ کیا آپ کے تہران آنے جانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی؟ آج کل یہاں کا موسم ہو شربا طور پر عشق انگیز ہے۔ پاکستان کے اندر یا آس پاس تہران سے زیادہ خوبصورت اور سہانا شہر کم ہو گا۔ ہم غالب کے مصداق اس لطافت کے قائل ہیں جو بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہمارے ہاں اکثر کثافت کی فراوانی رہتی ہے۔ لیکن اس شہر کے لوگوں نے لطیف ترین بنا دیا ہے۔ میرا تیسرا مجموعہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔ کراچی میں کوئی ذمہ دار پبلشر مل سکتا ہے؟

مخلص راشد

۳

تہران

۸ دسمبر ۱۹۶۸ء

برادرِ عزیز

آپ کا ۲۹ نومبر کا خط کل ملا۔ میں نے "مصاحبے" کے دو دو صفحے دو مرتبہ بھجوائے ہیں۔ دونوں مختلف صفحے تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون سے دو صفحے گم ہوئے۔ اس لئے سوچ رہا ہوں کہ مصاحبہ کی ایک فوٹو کاپی (پورے مصاحبے کی) اور تیار کر دوں اور آپ کو ہفتے دس دن تک بھجوا دوں۔ تاکہ معاملہ صاف ہو۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر آپ "جدید شاعری" والا مضمون حسبِ منشا یعنی بغیر اس امر کا ذکر کئے کہ یہ "ایران میں اجنبی" کا دیباچہ ہے شائع کر دیں۔ اس لئے مناسب ہو گا کہ آپ اس مضمون کو وہاں سے شروع کریں جہاں نیما یوشیج کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ لیکن اگر مناسب سمجھیں تو اپنے اداریے میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہ یہ آپ کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ ن۔ م۔ راشد کے مجموعے "ایران میں اجنبی" کے دوسرے ایڈیشن میں مقدمے کے طور پر بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے کتاب کا اشتہار بھی ہو جائیگا اور آپ کے رسالے کو جو فوقیت حاصل ہے وہ بھی برقرار رہے گی۔

نظموں کے تراجم بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آپ ان نظموں کے تراجم چاہتے ہیں جو مضمون میں شامل کی گئی ہیں۔ یا ان کے علاوہ مزید چھ سات نظموں کے؟ اس کے لئے شاعروں سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔ اگر یہی آپ کی خواہش ہو تو اجازت حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے میز نیازی (پبلشر) کو خط لکھا ہے کہ وہ تینوں کتابوں کا اشتہار لکھ کر آپ کو بھجوا دے۔ خود اشتہار لکھنا مشکل نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی تو اپنی کتابوں کے اشتہاروں میں اپنے آپ کو "عظیم شاعر، عظیم مفکر، عظیم انسان" کہلا سکتے ہیں۔ میرے لئے یہ کام مشکل ہے۔ "عظمت" کی یہ ارزانی میں نے کم دیکھی ہے!

مخلص راشد

۴

تہران

۲۶ رجون ۱۹۶۹ء

برادر عزیز

آپ تندرست اور خوش و خرم رہیں۔ آپ کا ۱۹ رمئی کا خط میرے سامنے ہے۔ یاد نہیں اس کا جواب دے چکا ہوں یا نہیں۔ یہ بات مکرر کہنا چاہتا ہوں کہ "جدید فارسی شاعری" پر میرا مضمون مطبوعہ نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کر دیا تھا کہ اس کی صرف سو کاپیاں تقریر کے طور پر چھاپی گئی تھیں۔ ان میں سے شاید بیس تیس سے زیادہ تقسیم یا فروخت نہیں ہوئیں۔ اس لئے یہ مضمون اس وقت تک غیر مطبوعہ سمجھنا چاہیئے جب تک آپ اسے شائع نہ کریں۔ اس کی باقی کاپیاں جو چھاپی گئیں وہ میز نیازی کے دفتر میں محفوظ ہیں تاکہ جب میری کتاب اس موضوع پر شائع ہو تو اسے تمہید کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ البتہ "مصاحبہ" "لا۔انسان" کے ساتھ شائع ہو گیا ہے اس کا مجھے افسوس ہے۔ کاش "نیا دور" جلد جلد شائع ہو سکے۔ اب تک ۶۵ فارسی نظموں کا ترجمہ کر چکا ہوں۔ پچاس کے قریب نظموں کے ترجمے کے بارے میں متعلقہ شعراء سے گفتگو ہو چکی ہے۔ انہیں اب چھپنے کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ باقی پندرہ نظموں کے مصنفین سے رابطہ ابھی قائم نہیں ہوا ہے۔

لاہور میں پاکستان کونسل کے جلسے میں (۷) رمئی کو میرے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور افتخار جالب اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مضامین پڑھے۔ اعجاز بٹالوی صاحب نے زبانی تقریر کی۔ وزیر آغا کا مضمون "اردو زبان" (سرگودھا) میں شائع ہو رہا ہے۔ افتخار جالب صاحب نے جو مضمون پڑھا اس پر اخبارات نے خاصی تنقید کی

یں لاہور میں تھا تو اس شخص نے ہر محفل میں اس نیاز مند کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے لیکن
ن میں اس انداز سے نکتہ چینی کی جس سے ریاکاری، اور کم سوادی دونوں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے مضمون
۔ شائع کرنا چاہیں تو اسے براہِ راست خط لکھ کر منگا لیجئے۔ عبادت بریلوی صاحب کا مضمون کہاں شائع
، کا مجھے علم نہیں۔ لاہور کے ایک تازہ اخبار "ندائے ملت" میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب نے اس
کے خلاف زہر اگلا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دفعہ لاہور میں مجھ
سلوک ہوا جو غالب کے ساتھ کلکتے میں ہوا تھا۔ لیکن میرے چلے آنے کے بعد! بنیادی مسئلے پر بھی
بکت سبزواری کا مضمون اگر شائع کرنا ضروری ہو تو شائع کر دیجئے۔ اس کے بعد اس قصے کو طول دینا
ہے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اکثر دانش مندوں نے ذہن کے سوراخ بند کر رکھے ہیں اور جسم کے
کھول رکھے ہیں خدا رحم فرمائے۔

مخلص راشد

۵

پوسٹ بکس ۱۵۵۵۔ تہران، ایران

۱۰ اگست ۱۹۷۲ء

برادر عزیز

آپ کا ۲۴ جولائی کا لکھا ہوا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہاں آ کر جن احباب کے نام خط
ان میں سر فہرست آپ تھے۔ حیرت ہے کہ آپ کو میرا خط نہیں ملا۔ میں ۳۱ مئی کو ملازمت سے سبکدوش
۔ لیکن حکومت ایران کے خاص اصرار پر سکریٹری جنرل نے میری ملازمت میں مزید چھ ماہ کی توسیع
ہے۔ گویا اب ۳۰ نومبر سبکدوشی کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ مزید توسیع کا امکان ہے۔ لیکن اب کام
نہیں چاہتا۔ چوں پیر شدی حافظا از میکدہ بیروں شو! جب تک ممکن ہے ایران ہی میں رہنے
ہے۔ تاہم وقتاً فوقتاً پاکستان آتا رہوں گا۔ حالات سازگار رہے تو اسی سال دسمبر یا اگلے سال جنوری
ں گا۔ اسلام آباد میں پلاٹ خرید رکھا ہے۔ یا اس پر مکان تعمیر کروں گا یا اسے بیچ دوں گا۔ ریٹائر ہو کر
، ایک طرح سے تخلیقی قوتوں کے لئے مفید اقدام ہو سکتا ہے۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر کسی چیز کے
یا استمرار کا یقین دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ آدمی کس برتے پر آئندہ کی تجویزیں سوچے؟ ۱۹۷۲ء کا

سال یا اس کا باقی حصہ تو امید ہے بنستے کھیلتے گزر جائے گا۔ (جس حد تک ہمارے رہنماؤں کا تعلق ہے ان کے لئے) لیکن ۷۳، ۱۹ اور پر زیادہ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ شاید اب خارجی حملہ تو ایک عرصہ تک نہ ہو لیکن اندرونی خلفشار جن کے ساتھ خارجی ریشہ دوانیوں کی آمیزش ہوگی، شدید تر ہو جائیں گی۔ افسوس خود ہم نے اس فراست سے کام نہیں لیا، جو پاکستان کی عمر کو طوالت بخش سکتی تھی۔ ہم نے اس خرد کا دامن نہیں پکڑا جو اس ملک کے بخیئے سلامت رکھ سکتی تھی۔ بار بار خداوندی ارشاد کانوں میں گونجتا ہے۔
(جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے رہنماؤں کو حد سے بڑھنے کی ڈھیل دے دیتے ہیں اور پھر اسے ایسا تباہ کرتے ہیں کہ جیسے تباہی ہوتی ہے!)
تاہم میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہماری قوم کو مذہب سے زیادہ فلسفے کی اور ایمان یا "جنون" سے زیادہ خرد کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کے بغیر ہماری خودکشی کے دن قریب نظر آتے ہیں۔

گھر میں ہم دونوں کی طرف سے سلام پہنچا دیجئے۔

مخلص راشد

۶

پوسٹ بکس ۱۵۵۵، تہران، ایران

۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء

عزیز گرامی

آپ کا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ آپ کے والد گرامی کے انتقال کی خبر سے بے حد رنج ہوا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ لیکن آپ کی شخصیت اور کردار پر نظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس عظمت کے مالک ہوں گے۔ خدا کرے کہ آپ سب کو ان کی وفات کے بعد تسکین نصیب ہو۔ اور آپ بدستور، زندگی کی کٹھن منازل طے کرنے کی صلاحیت کے حامل رہیں۔

آپ نے نظم کے بارے میں جو توضیح کی، اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ نظم آپ نے "ناخش" نہیں کی ہوگی۔ لیکن خیال آیا کہ شاید کہیں ایسا ذکر ہوا ہو، اور اس وجہ سے بعض کلمات دہرائے گئے ہوں۔ اگر آپ کی رائے میں اب بھی نظم اشاعت کے قابل ہو تو میں آپ کے منشا کو ترجیح دوں گا۔

بتہ "زمین کا گناہ" میں لفظ "چودتا" کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ اگر قانونی یا اخلاقی اعتبار سے اس لفظ کی اشاعت ممکن نہ ہو تو اس کی جگہ نوچتا لکھ دیجئے لیکن یوں ۔ "نوچتا" یعنی واوین میں!

اس خط کے ساتھ ایک نئی نظم بھیج رہا ہوں "پیریڈ" یہ بھی بے وزن ہے لیکن امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ اس میں بعض اشارے آپ پر دوسروں کے مقابلے میں روشن تر ہوں گے مثلاً کرسمس کا دن (گویا انگریز یا عیسائی حکومت کا زمانہ)۔ "موم بتیاں" یہ لفظ گڑ گیا ہے۔ موم بتیاں نہیں کہا بلکہ اقبال کی خاص OBSESSION کی بنا پر "مومن بنیاں" کہا ہے۔ عید کا دن (یعنی اسلامی حکومت یا نام نہاد اسلامی حکومت کے زمانے میں) روحوں کی سلامی لینے سے مراد، واضح ہے یعنی اپنے کلچر کی تجلیل، اور دوبارہ تجلیل —— وغیرہ وغیرہ۔

آپ نے اپنے خط میں پاکستان کی طرف ایران کے رویے کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے اور مجھ سے اس کے اسباب کے بارے میں سوال کیا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ایران کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ہندوستان کی جارحیت کے بعد، اور خصوصاً بحر ہند میں ہندوستان کی مزید "بازدکشائی" کے باعث ایران زیادہ چوکنا ہو گیا ہے۔ اور پاکستان کو مضبوط کرنا اور دیکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ ڈھال کا کام دے سکے۔ "ایران کے رویے میں تبدیلی" کا ذکر وہ لوگ کر رہے ہیں۔ جو یہاں آکر ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ یا ہجرت کر کے آنا چاہتے ہیں۔ ایران اس کے لئے تیار نہیں۔ خود یہاں کے نوجوانوں کی بڑی تعداد۔ یورپ اور امریکہ میں ہر قسم کا ہنر سیکھ کر آ رہی ہے۔ اُن پر پاکستانیوں یا کسی اور کو کیونکر ترجیح دیں؟ البتہ منظم طریقے سے بعض قابل پاکستانیوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ مثلاً ابھی وزیر اعظم ہویدا نے اعلان کیا کہ ایران ۲۵۰ پاکستانی ڈاکٹر منگوا رہا ہے۔ یہ لوگ افراتفری نہیں چاہتے کہ جس پاکستانی کا جی چاہے ایران کا رُخ کرے اور پھر گداگری کرتا نظر آئے۔ اب بھی رضا شاہ مرحوم کے مقبرے کے آس پاس سینکڑوں پاکستانی بھکاری پڑے نظر آتے ہیں اور وہ سب ہمارے دامن پر بہت بڑا داغ ہیں۔ خاص طور پر جب ایران میں گداگری تقریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ خدا آپ کو زندہ اور خوش و خرم رکھے۔

مخلص راشد

۷

پوسٹ بکس ۱۵۵۵۔ تہران، ایران

۷ر اپریل ۱۹۷۳ء

برادرِ عزیز

خدا آپ کو خوش رکھے۔ آج صبح قبرص سے واپسی پر آپ کا خط ملا۔ پندرہ دن اس جزیرے میں بسر کرکے آ رہا ہوں۔ اس مختصر وقت میں بھی قریب قریب پورا جزیرہ دیکھ ڈالا۔ آدمی کار میں جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تین سے لے کر پانچ گھنٹے میں پہنچ جاتا ہے۔ جزیرہ کے چاروں طرف بحیرہ روم کا نظارہ حیرت انگیز طور پر دلکش ہے۔ ہم لوگ سمندر میں کئی بار نہائے اور ہر چند میں آثارِ قدیمہ کا ماہر ہوں نہ ضرورت سے زیادہ دلدادہ، لیکن رخصت گزارنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ یونانی اور رومی صنادید کی زیارت کر لی جائے۔ جو اس جزیرے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، پرانے قلعوں کی دیواریں اب تک کھڑی ہیں، پرانے محلات کے موزائیک فرش کھود کر نکالے گئے ہیں، ان کے خوبصورت نقش و نگار جو بجنسہ موجود ہیں، اپنا ثانی کم رکھتے ہیں۔ افروڈائیتے کے محل کے کھنڈر اور اس کے مجسمے میں نے پہلی مرتبہ دیکھے۔ اور ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر جزیرے کے مغربی شہر عاسول کے قریب وہ غار دیکھے جن میں اصحابِ کہف نے، یعنی ان لوگوں نے جن کے مسیحیت قبول کرنے پر دقیانوس کی طرف سے ان پر سخت مظالم ڈھائے گئے تھے، پناہ لی تھی۔ اور ان کے دیر تک ان غاروں کے اندر رہنے کا راز بھی معلوم ہوا، ان کے حامی لوگ، رات کے پردے میں غاروں کی چھتوں کے سوراخوں سے ان کو غذا پہنچاتے رہتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ان مقدس بزرگوں کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ اور ان کے ساتھ پناہ لینے والا چرواہا اور اس کا کتا قطمیر، جس کا قرآن میں نام لیا گیا ہے، میرے سامنے موجود ہے۔ پھر پرانے کلیسا دیکھے جن میں سے بعض کو مساجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ان میں اب بھی نماز خوانی ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کی اجڑی ہوئی عظیم خانقاہیں دیکھیں۔ مثلاً ایک شہر BELLAPAIS کی ABBEY جو اپنی خرابی میں بھی، جس کا الزام ترکوں کے سر رکھا جاتا ہے، نرالی عظمت، نرالی شان دلآویزی کی حامل ہیں۔ جزیرے میں یونانی اور ترک، شہروں کے الگ الگ محلوں میں رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے میل جول بہت کم ہے۔ راستوں میں کئی ترک گاؤں نظر آئے جو یونانیوں کی دست درازی کی بدولت ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ترک اپنے

بھی اس ملک میں جگہ جگہ مہاجرین کر رہے ہیں۔ اور یو۔ این کے سپاہی اپنی آبی رنگ وردیوں میں ہر جگہ
دیتے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ سپاہی نہ ہوں تو شاید یونانیوں کے عتاب کا لاوا ایک بار پھر اُبل پڑے۔ لیکن
ترکوں اور یونانیوں کے درمیان گفت و شنید کا راستہ دوبارہ کھولا گیا ہے۔ شاید یہ بھی مہذب قوم
کے افراد کے مانند از سرِ نو باہم زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔

خوش ہوں کہ غزل کے بارے میں آپ کے سوالات کا جواب دے سکا۔ اور آپ کو یہ جواب پسند
آیا۔ لا = انسان کے بارے میں آپ کے سوال کا جواب اسی کتاب کے مقدمے میں ایک حد تک موجود ہے۔
بات تو یہ ہے کہ کتاب کا نام "انسان = لا" یا "لا = انسان" نہیں۔ یعنی میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ انسان کوئی حیثیت
نہیں رکھتا یا انسان محض صفر ہے۔ یہ "لا" الجبرے کا "X" ہے اور الجبرے کی اُردو کتابوں میں اسی حیثیت
سے اس کا استعمال عمل میں آیا ہے۔ نفی کا لا نہیں، کلمہ کا لا بھی نہیں کہ اس کے مفاہیم میں مذہب کا فکر
ہے۔ مراد یہ ہے کہ جیسے الجبرے میں ہم "X" یا "لا" سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح قدرت انسان سے کام لے رہی
ہے۔ یعنی اسے کسی نامعلوم "قیمت" کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ قدرت کو کسی ایسے ہندسے کی تلاش
ہے جو تخلیق کی مساوات یا EQUATION کا جواب یا حل ہو، لیکن ابھی وہ ہندسہ معلوم نہیں ہو سکا
انسان اس کا بدل یا SUBTITUTE ہے۔ تاکہ اس کی مدد سے وہ اصل ہندسہ دریافت ہو سکے
دوسرے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر فن، شعر ہو یا نقاشی، بت تراشی ہو یا موسیقی، سب اس ہندسے کی دریافت
کی کوششیں ہیں۔ یعنی اسی مساوات کے اجزا ہیں جن کے حل کی قدرت یا ہم کوششیں کر رہے ہیں۔
کے اندر انسان کی حیثیت گویا لا کے مانند ایک مفروضے کی ہے۔

میں ۳۱ مئی کو یو۔ این سے بہر حال سبکدوش ہو جاؤں گا اس کے بعد شاید کچھ وقت رخصت کا کچھ
سیر و تفریح میں گزاروں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یو۔ این کی ایک ایجنسی کی پیش کش قبول کروں اور چھ
مہینے کے لئے اس کے ساتھ منسلک ہو جاؤں۔ یہ ایجنسی یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ انگریزی میں جاری
کرنا چاہتی ہے۔ اسے ایک ایسے اڈیٹر کی تلاش ہے جو اطلاعاتِ عامہ کا تجربہ رکھتا ہو۔ اور یو۔ این کا
تجربہ رکھتا ہو۔ اور اقتصاد کے علم کی شُدھ بدھ بھی اُسے ہو۔ مجھے اس ایجنسی نے خود APPROACH
کیا ہے۔ لیکن میں ابھی دل نہاد نہیں ہوا۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ تاہم جولائی یا اگست میں امکان اس بات کا
ہے کہ میں یہیں تہران میں پایا جاؤں گا! آپ بسر و چشم آئیں۔

مخلص راشد

۲۶ر مارچ ۱۹۷۵ء

برادرِ عزیز

یک مدت سے آپ کے ساتھ خط و کتابت موقوف ہے۔ معلوم نہیں تار کہاں اور کس وقت ٹوٹا! میں
ت سے انگلستان میں مقیم ہوں۔ ۱۵ر اگست کو یو۔ این سے ریٹائر ہو کر براہِ راست یہیں چلا آیا تھا۔ اور اس
ایں ہوں کہ یہاں آباد ہو جاؤں۔ ایک تو بیوی کا پاکستان میں آباد ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ دوسرے
سے چھوٹا بچہ نزیل یہاں ایک مدرسے میں زیرِ تعلیم ہے۔ اس کی عمر ابھی دس سال ہے۔ اس کے قریب رہنے
یوں مجبور ہیں۔ در گلوئم رشتہ اے افگندہ دوست۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست!
ی رومی کا شعر ہے۔ آج کل نئے سرے سے مثنوی پڑھ رہا ہوں۔ ایران کے مشہورِ عالم آقائے فروزاں فر
ی کی شرح نہایت مفصل لکھی ہے۔ اس کی مدد سے مثنوی کو دوبارہ سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔
غنیمت ہے اگرچہ اس میں طوالت بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ اور اکثر مقامات پر فروزاں فر اپنے تبحرِ علمی کے
رومی کے اصل مضمون سے ہٹ گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک ہندوستانی کی جو شرح نظر سے گزری
ن کا نام ولی محمد اکبر آبادی تھا) بدرجہا بہتر تھی۔ میرے پاس اس کا ایک نسخہ تھا جو والد یا دادا نے خریدا
ن کہیں گم ہو گیا۔ اگر اب بھی کہیں سے مل جائے تو ہر قیمت پر خرید لوں۔ یا حافظ کی وہ نامکمل شرح جو
مدرں میں ترجمان الغیب کے نام سے شائع ہوئی تھی اور جس کے مصنف میر ولی اللہ ایبٹ آبادی تھے۔
نہیں رکھتی۔ اگر وہ بھی کہیں نظر سے گزرے تو ضرور پڑھیے اور مجھے بھی اس کا کوئی نسخہ حاصل کر دیجیے۔
"نیا دور" نکل رہا ہے یا نہیں۔ یاد آیا کہ آپ نے اپنے آخری خط میں میری اس وقت تازہ ترین نظم
ی" کی رسید دی تھی اور حسبِ معمول نہایت فیاضی سے کام لے کر اس کی تعریف بھی کی تھی۔ وہ "نیا دور"
ئع ہو سکی یا نہیں۔ اگر پرچہ مندرجہ بالا پتہ پر بھجوا دیں تو مجھے مل جائے گا۔ مستقل پتہ بعد میں لکھوں گا۔
اپنی اور اعزہ و اقربا کی خیریت لکھتے رہا کیجیے۔ کراچی کی ادبی فضا کیسی ہے۔ کون لوگ آج کل پہلوں
ز لکھ رہے ہیں؟ کون کون سی کتابیں، کس کس مضمون پر چھپ رہی ہیں؟ کسی نئے شاعر کا نیا مجموعہ نظر سے
و تو بھجوا دیجیے۔ کرم ہو گا۔

مخلص راشد

۹

۱۲ر ستمبر ۱۹۷۵ء

برادرِ عزیز

آپ خوش رہیں اور تندرست۔ آپ کا ۲۰ر جون کا لکھا ہوا خط بہت دنوں سے سامنے ہے۔ جواب نہیں لکھ سکا۔ بہت سے دن پے در پے ایسے گزر جاتے ہیں کہ کچھ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انگلستان میں رہ کر سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ان احباب سے دور ہو گیا ہوں جنہیں اہلِ دل میں شمار کرتا تھا۔ اور جن کے ساتھ گفتگو مایۂ الہام بنتی تھی۔ چند نظمیں آپ کو بھجوا چکا ہوں۔ تاحال رسید نہیں آئی۔ آپ کے بھیجے ہوئے رسالے بھی ابھی تک موصول نہیں ہوئے۔ اب مستقل پتہ لکھ رہا ہوں۔ رسالے رجسٹرڈ بھجوانے پر خرچ تو آئے گا۔ لیکن یہی ایک صورت ہے کہ پاکستان سے آئی ہوئی ڈاک یہاں حفاظت سے پہنچ جائے۔ ورنہ بہت سی چیزیں تو وطنِ عزیز کے ہرکارے ہضم کر لیتے ہوں گے۔ یہاں اُردو کے رسائل یا کتب کی کس کو ضرورت یا تمنا ہو گی۔ سبطِ حسن "پاکستانی ادب" کا ہر شمارہ رجسٹرڈ بھجواتے ہیں۔ اور باقاعدہ پہنچ جاتا ہے۔

آپ نے اپنے مذکورہ بالا خط میں شعروں کے نئے نئے مجموعوں کی اشاعت کی خبر دی ہے۔ اگر ان کا ایک ایک نسخہ آپ بھجوا سکیں تو اُردو کی پہلی کتاب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی زیرِ مطالعہ رکھ سکوں گا۔!

آپ نے رومی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ ممنون ہوں۔ لیکن رومی ایک بحرِ زخّار ہے۔ اس کا مطالعہ کب ختم ہوا اور میں کب اس قابل ہوں کہ اس پر "جدید ذہن کے شعور" کی روشنی میں آپ کے لئے کچھ لکھ سکوں۔ کچھ معلوم نہیں۔ تاہم جی بہت چاہتا ہے کہ رومی پر حسبِ عادت کوئی ناقدانہ مضمون اس انداز میں لکھوں جیسے وہ ایک ہم عصر شاعر ہوں! رومی سے ہم عصری کی توقع رکھنا مشکل بھی نہیں۔ کیونکہ وہ اُن زندہ جاوید شاعروں میں ہیں جو ہمیشہ ہر شاعر کے معاصر رہیں گے۔

پچھلے دنوں یہاں بعض اُردو شعراء کا نزولِ اجلال ہوا۔ حفیظؔ جالندھری، احمد فراز، عالیؔ، قتیلؔ شفائی۔ یہ لوگ برمنگھم کے پاکستانیوں کی دعوت پر یہاں آئے تھے۔ عالیؔ اور قتیلؔ تو اس نیازمند سے دامن بچا کر نکل گئے، لیکن حفیظؔ صاحب سے ایک اور احمد فراز صاحب سے کئی صحبتیں میسر آئیں۔ حفیظؔ حسبِ معمول صحت کے شاکی، روس کے شاکی اور موجودہ ادب کے شاکی نظر آئے۔ لیکن ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے اُن

کی صحت بری نظر نہیں آئی۔ ان کی شاعری البتہ پہلے سے زیادہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ پڑھتے اسی شان سے ہیں اور حاضر جوابی بھی وہی ہے۔ لیکن شعری دنیا ایسی بدلی ہے کہ وہ تو وہ، خود مجھے اپنی شاعری کسی شہر مدفون سے نکلے ہوئے آثار قدیمہ کی مانند" قیمتی" معلوم ہونے لگی ہے۔! احمد فراز کی شاعری پر ہر محفل میں داد کے ڈونگرے برسائے گئے۔ احمد فراز کی غزل میں کلاسیکی عناصر کے ساتھ ساتھ جدید حساسیت کے آثار فراواں ہیں۔ جب تک شاعر اپنے "نئے پن" کو ایک حد تک زندہ نہ رکھ سکے۔ اس کا اپنے قدموں پر جمے رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

یہاں ساقی فاروقی کا دم غنیمت ہے۔ لندن کے نواح میں رہتے ہیں۔ ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ حیدر آباد (دکن) کے بعض شعرا سے بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان میں خاص طور پر اکبر حیدر آبادی کا کلام سُنا اور بے حد پسند آیا۔ غزل کہتے ہیں۔ اور غزل میں بڑا وقار رکھتے ہیں۔ عشق اور فلسفہ کی شگفتہ آمیزش ان کے کلام پر حاوی ہے۔ ایک مجموعہ شائع کر چکے ہیں۔ جس کی تمام جلدیں حیدر آباد سے انگلستان آتی ہوئی سمندری جہاز میں بارش کی نذر ہو گئیں۔ جو چند جلدیں بچ گئیں ان میں سے ایک انہوں نے مجھے عنایت کی ہے لیکن اس مجموعہ کے بعد کا ان کا کلام زیادہ اہمیت کا حامل ہے یعنی جو شعر دوست حضرات اب کہہ رہے ہیں۔ اور اکثر محفلوں میں سنا چکے ہیں۔ حیدر آبادی لوگوں میں بہت ہیں۔ اور حیرت کی بات ہے کہ انہیں میرے ناچیز کلام سے پہلے ہی سے علاقہ شدید تھا۔ اور اب اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ (آپ کو یاد ہوگا کہ سب سے پہلے حیدر آباد دکن ہی میں اس نیازمند کی زندگی اور شاعری کے بارے میں خاص نمبر شائع ہوا۔ اور وہی اب تک آخری ہے۔ اگرچہ اس دوران میں اور اس سے پہلے جوشؔ ملیح آبادی، فیضؔ، حفیظؔ اور اب احمد ندیم قاسمی کو صہبا لکھنوی "نمبردار" بنا چکا ہے!)

میرے احباب میں عزیز ترین آغا عبدالحمید ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ سوانح حیات لکھنے کے در پے ہیں۔ آپ نے کرم کیا کہ میرے "سوال و جواب" کا وہ نسخہ ان کے حوالے کر دیا، جو آپ کے پاس محفوظ تھا۔ شاید میں نومبر یا دسمبر میں چند دن کے لئے پاکستان آنکلوں۔ وہ اس دوران میں مزید تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ذاتی گفتگو کے ذریعے میری زندگی اور شاعری کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹے ہیں۔ معلوم نہیں اس قسم کا کام کرنے کی ہمت کس قدر رکھتے ہیں۔

لاہور کے ایک ناشر نے میرا چوتھا مجموعہ شائع کرنے کی ہامی بھری ہے۔ ان کے معاہدے کا انتظار ہے اس کے بعد مسودہ انہیں بھیج دوں گا۔ اور دسمبر کے لگ بھگ وہاں جا کر پروف وغیرہ دیکھ لوں گا۔

لمبے سفروں سے اب گھبراتا ہوں لیکن یہ دونوں کام ضروری معلوم ہوتے ہیں۔
حال ہی میں میں نے اپنی دو نظمیں "پاکستانی ادب" کو بھجوائی ہیں۔ سبط حسن کے پے در پے اصرار کے بعد۔ اگرچہ میری دوڑ تو "نیا دور" تک ہی رہی ہے۔ اور اس پر فخر کرتا ہوں!
میرے ایک خط پر جو سبط نے شائع کیا ہے کس قدر بحث کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کا بھی ضرور تعاقب کیجئے۔ اور مجھے اپنی ذاتی رائے سے مطلع کیجئے۔ بحث کا موضوع اشتراکیت اور ترقی پسندی کا رشتہ ہے۔ آپ کو آج خط لکھنے بیٹھا ہوں تو جی چاہتا ہے لکھتا چلا جاؤں۔ لیکن صفحہ (چوتھا صفحہ) ختم ہو رہا ہے اب اور کس قدر اس ذوقِ حضوری کی بدولت داستان کو طول دوں؟

مخلص راشد

۱۰

۲۶ ستمبر ۱۹۷۵ء

برادرِ عزیز

آپ تندرست رہیں۔ اور عشق زیادہ ہو۔ آپ کی طرف سے کسی نظم کی رسید آئی نہ گزشتہ خط کا جواب۔ ہی مصروف ہیں تو مبارک بات ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی صحت درست ہو۔ اور آپ خوش و خرم ہوں۔
آج "نیا دور" کے تمام شماروں کا حساب لگا رہا تھا۔ بہت سے شمارے میرے پاس مفقود ہیں۔ کیا کوئی صورت ایسی نہیں کہ سب کے سب ایک ایک کر کے آپ مجھے سمندری ڈاک سے یہاں بھجوا دیں۔ تاکہ میری فائل مکمل ہو سکے۔

کوزہ گر (۴) مکمل ہو گئی ہے۔ یہ اس سلسلے کی آخری نظم ہے۔ کہیئے تو بھجوا دوں؟
غلام عباس صاحب کا کیا حال ہے؟ ان کی طرف سے بھی خط کا جواب نہیں آیا۔ انہیں سلام کہیئے گا۔
باقی احباب کو بھی۔ جواب جلدی۔

مخلص راشد

۱۱

روم نمبر ۳۷-۱۰۱ - یونائیٹڈ نیشن - ہیڈ کوارٹر

نیویارک - ۱۸ نومبر ۱۹۶۶ء

برادر عزیز ــــ دو نئی نظمیں اور بھیج رہا ہوں۔ اب آپ کے پاس پانچ نظمیں ہو گئیں۔ سب کو چھاپنے کی ضرورت نہیں۔ انتخاب کر لیجیے۔ "شاید زندگی سے ڈرتے ہو؟" اور "آنکھیں کالے غم کی" ایسی نظمیں ہیں جن کی اشاعت ملتوی ہو سکے۔ فضا کا رنگ آپ مجھ سے زیادہ پہچانتے ہیں کہ میں کالے کوسوں پڑا ہوں۔ تاہم "تمنا کے تار"، "ہم کہ عشاق نہیں...." اور "اے غزالِ شب" نسبتاً "پاک" ہیں اور اول الذکر دو نظموں سے ایک حد تک بہتر ہے۔

اگر ہو سکے تو مختصر سا خط لکھ کر اپنا عندیہ بتا دیجیے۔ ممنون ہوں گا۔

معاوضے کی فکر نہ کیجیے۔ جس شمارے میں نظمیں چھپیں۔ اس نیاز مند کے حق میں کوئی "کلمۂ خیر" کہہ دیجیے! شاہد صاحب اور عباس صاحب کا حال ضرور لکھیے گا۔

مخلص راشد

۱۲

نیویارک

۶ دسمبر ۱۹۶۶ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو زندہ سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ آپ کے دونوں خط موصول ہوئے۔ دوسرا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ جو مصرعے آپ نے نقل کئے ہیں سب درست ہیں سوائے "ہم کہ عشاق نہیں ....." کے آٹھویں بند کے چوتھے مصرعے کے ــــ

یہ مصرعہ یوں ہونا چاہیئے۔

جس میں ہیں بکھرے ہوئے ماضیٔ نمناک کے برگ

یعنی جس میں کے بعد ہیں درج ہونے سے رہ گیا۔ شاید میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے ہی میں یہ کمی ہوگی آپ نے گذشتہ خط میں لکھا تھا کہ میں آپ کے اس اداریے کے بارے میں جس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا تھا۔ اپنے خیالات قلم بند کر کے آپ کو بھیج دوں۔ آپ نے اس بارے میں واقعی بڑی تشویش

دلائی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جلد سے جلد کچھ لکھ ڈالوں۔ لیکن جنرل اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے سب لوگ بے حد مصروفیت کا شکار ہیں۔ اسمبلی ۲۰ دسمبر کو ختم ہو رہی ہے۔ اگر وقت ملا تو اس وقت ایک دن صرف کر کے لکھ ڈالوں گا۔ آپ کے رسالے کی اشاعت میں تاخیر کا مجرم نہیں بننا چاہتا۔ اگر دسمبر کے آخر تک مضمون آپ کو بھیج جائے گا تو دیر تو نہ ہو گی؟ ورنہ کسی اگلے شمارے کے لئے اسے رکھ لیجئے چاہتا ہوں کہ اپنی تہذیب (پاکستانی تہذیب) کے عناصر سے بحث کروں۔ ویسے تو اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن شاید آپ کے رسالے کے چار پانچ صفحے پُر کرنے کے لئے مواد جمع ہو جائے۔

مکرر آنکہ۔ آپ نے گذشتہ خط میں معاوضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر آپ کو پسند ہو تو معاوضے کی بجائے اُس شمارے کے نسخے میرے بعض احباب کو بھجوا دیجئے جس میں نظمیں شائع ہوں۔ اس کے نام حسب ذیل ہیں۔ پتے آپ کے پاس اکثر کے ہوں گے۔ (۱) فیض (۲) آغا عبدالحمید کیبنٹ سیکریٹری راولپنڈی۔ (۳) عطاء اللہ سجاد جج ہائی کورٹ۔ لاہور (۴) حمید نسیم ریڈیو پاکستان (۵) ضیاء جالندھری (۶) غلام عباس (۷) راجہ فخر محمد ماجد ۷۔ ۸۳۵ سمن آباد۔ لاہور (۸) صفدر میر (۹) قیوم نظر (۱۰) جیلانی کامران (۱۱) آفتاب احمد، ڈائرکٹر فنانس اکیڈمی لاہور (۱۲) احمد فراز پشاور۔ (۱۳) اعجاز بٹالوی (۱۴) مختار صدیقی ان کے علاوہ میرے نام چار نسخے بھجوا دیجئے جو یہاں بعض احباب کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

شاہد صاحب اور عباس صاحب سے سلام کہیئے گا۔ امید ہے کہ شاہد صاحب کی صحت اب بہتر ہو گی۔

مخلص راشد

۱۳

نیو یارک

۱۳ اپریل ۱۹۶۷ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ ۷ اپریل کا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ حیرت ہے کہ اس سے پہلے مضمون اور نظم "دو حرف تہا"۔۔۔ "کے بارے میں آپ کا خط مجھ تک نہ پہنچ سکا۔

شاہد صاحب کی علالت کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ ان کا یوں "برخوردار بستر" ہو جانا

رت انگیز ہے کیونکہ انہوں نے ہمیشہ نہایت چاق وچوبند زندگی بسر کی ہے۔ دعا ہے کہ انہیں جلد
حت کاملہ حاصل ہو۔ اور وہ دوبارہ چلنے پھرنے پر مُصِر نظر آئیں۔

اس خط کے ساتھ "بے پر و بال" کا ایک اور نسخہ بھیج رہا ہوں۔ اس میں کچھ ترمیم کی گئی ہے معلوم
یں میں نے جو نقل آپ کو بھیجی تھی وہ اس اصول کے مطابق تھی یا نہیں۔ اگر نہ ہو تو اس نسخے کو اصل سمجھئے اور
ت ہو تو کاتب سے درست کرا لیجئے۔

یہاں سے ۷ ارجون کے لگ بھگ روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔ جولائی کا مہینہ اٹلی میں گذار کر ہم لوگ
ست کے شروع میں کراچی پہنچیں گے۔ لیکن کراچی رکنے کا ارادہ نہیں۔ لاہور سے واپسی پر یعنی اگست کے آخر
ب ایک ہفتہ کراچی میں ٹھہرنے کی تجویز ہے۔ اٹلی سے آپ کو لکھ کر اس کی مزید توثیق کر دوں گا۔

مخلص راشد

۱۴

پی۔ او۔ بکس نمبر ۱۵۵۵
تہران۔ ایران۔
۷ ار فروری ۱۹۶۸ء

برادر عزیز و گرامی۔ اس خط کے ساتھ چھ تازہ نظمیں بھیج رہا ہوں جو تہران آکر لکھی ہیں۔ شاید
"نیا دور" کے کام کی ثابت ہوں۔

(۱) "بے مہری کے تابستانوں میں"۔ اس نظم میں ان بنیادی اختلافات کا ذکر ہے جو ہمیشہ پائے
گئے ہیں، اور جن کی وجہ سے انسانی دنیا میں بے مہری اور بے گانہ پن پیدا ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کی
طرف اشارہ ہے کہ ان اختلافات کو رفع کرنے کا وسیلہ صرف حرف و معنی کا وہ آہنگ ہے جو نایاب
ہوتا جا رہا ہے۔ اور جسے حاصل کرنا "بشارت" کا درجہ رکھتا ہے۔

(۲) "افسانۂ شہر": یہ نظم گویا پاکستان کا افسانہ ہے، یا ہر نو آزاد ملک کا۔ پہلے بند کے تین
مصرعوں میں پاکستان کی تخلیق، اور چوتھے سے چھٹے مصرعے میں تازہ "انقلاب" اور اصلاح کی مساعی۔
دوسرے بند میں اسباب کی طرف اشارہ ہے کہ خود لوگ بدلنے پر رضامند نہیں۔ اور صرف اپنے "آج" میں،

زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے "کل" تک پہنچنے کی خواہش یا جسارت نہیں رکھتے۔

(۳) "گرداب": اس نظم میں جنگ، ہر جنگ کے خلاف احساسات کا اظہار ہے۔

(۴) "میر ہو، مرزا ہو، میراجی ہو": اس نظم میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قدیم شاعر اپنی ہی ذات کے خلفشار میں گم ہے لیکن ہمارے موجودہ زمانے میں شاعر ان ہنگاموں کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہے جو اس کی ذات کے اندر در آئے ہیں۔ [صفحہ ۹ پر پہلے دو مصرع میر کے، دوسرے دو مصرعے غالب کے اور تیسرے تین مصرعے میراجی کے ہیں]

(۵) "مسکراہٹیں": اس نظم میں ہنگامی مسرت اور دُور رس مسرت کا تقابل منظور ہے۔

(۶) "زمانہ خدا ہے": یہ نظم وقت کے بارے میں چند نیم فلسفیانہ 'خیالات کا اظہار ہے یعنی حال جس سے ہمارا رشتہ ہے اور جس رشتے کا ہمیں سب سے زیادہ احساس ہے۔ وہی سب سے زیادہ نازک رشتہ ہے۔ اصل رشتہ اس ماضی کے ساتھ ہے جس میں انسان نمودار ہوا یا اس مستقبل کے ساتھ، جہاں انسان کو پہنچنا ہے۔

نظمیں ملنے پر رسید بھیج دیجئے تاکہ تسلی ہو جائے ایران اور پاکستان کے درمیان ڈاک نہایت غیر یقینی ہے

عباس صاحب سے سلام کہئے گا۔

اس خط کے ساتھ چند پتے بھیج رہا ہوں جس پرچے میں یہ نظمیں شائع ہوں وہ براہ کرم ان حضرات کو بھجوا دیجئے۔ اگر پرچہ بھیجنا مشکل ہو تو نظموں کا تراشہ بھجوا دیجئے۔ شاید بعض ایسے نام ہوں گے جنہیں آپ از خود رسالہ بھیجتے ہوں گے۔ اس لئے آپ کی زحمت کم ہوگی۔

مخلص راشد

۱۵

تہران۔

۱۱ مئی ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ خط ملا۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے خط کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اس میں کہیں کہیں معمولی ترمیم کی ہے۔ تاکہ مطلب کسی قدر اور واضح ہو سکے۔

"گفتگو" میں اپنی نظموں کی اشاعت کے متعلق مجھے قرۃ العین حیدر سے اطلاع ملی۔ وہ پچھلے دنوں

تہران تشریف لائیں۔ اور بر سبیل تذکرہ انہوں نے "گفتگو" میں نظموں کی اشاعت پہ مسرت کا اظہار کیا۔ اس پر میں نے علی سردار جعفری صاحب کے نام خط لکھا۔ اور انہوں نے مجھے "گفتگو" کے تین شمارے ارسال فرمائے۔ انہوں نے "نیا دور" سے غالباً تین نظمیں اور "داستان" (پشاور) سے ایک نظم بغیر حوالے کے نقل کی ہے۔ اس پر میں نے ان کی توجہ اس امر کی طرف دلائی کہ یہ بات شاید "نیا دور" اور "داستان" کو گوارا نہ ہو۔ انہوں نے میرے خط کے جواب میں اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ میں نے ان کے اصرار پر دو تازہ نظمیں انہیں حال ہی میں چھپنے کے لئے بھیجی ہیں۔ یہ دو نظمیں "نیا دور" کو نہیں بھیجی گئیں۔ اس لئے آپ مطمئن رہیں۔

اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنی ایک تازہ تصویر بھی آپ کے نام بھیج رہا ہوں۔ معلوم نہیں "نیا دور" کے کام کی ہے یا نہیں۔

جن پرانے مضمونوں کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ ان کی کوئی نقل میرے پاس موجود نہیں۔ اور اب انہیں دوبارہ جمع کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ یوں بھی جہاں تک مجھے یاد ہے وہ مضامین رواروی میں لکھے گئے تھے۔ اور ان کی حیثیت کسی قدر سفرنامے کی تھی۔ اور ان میں کسی قدر غور و فکر کا پہلو کم تھا۔ اگر جمع ہو سکیں تو "تبرک" کے طور پر شاید اب بھی چھاپے جا سکیں۔

تیسرا مجموعہ چھاپنے کی تمنا سب سے زیادہ ہے اگر کوئی تسلی بخش انتظام ہو سکے تو ممنون ہوں گا۔

یہ پڑھ کر عنایت افسوس ہوا کہ "جدید شاعری" پر آپ کی کتاب کا مسودہ عنت ربود ہو گیا۔ میں تیسرے مجموعے میں تمہید کے طور پر "جدید شاعری" اور اپنی شاعری کے بارے میں ایک انٹرویو کا ترجمہ اور خلاصہ شامل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انٹرویو میں نے امریکہ میں اردو کے بعض پاکستانی اور امریکی طالب علموں کو انگریزی میں دیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو "نیا دور" میں اشاعت کے لئے بھیج دوں؟

تہران ضرور آئیں۔ چھٹی منانے کے لئے بہترین جگہ ہے۔

مخلص راشد

۱۶

تہران

۸ رجون ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔ خط ملا ممنون ہوں۔ اس دوران میں تین اور نظمیں ہو گئیں۔

لیکن ایک تو ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک عرصے سے تقاضا تھا کہ "اوراق" کے لئے کچھ بھیجوں۔ دوسرے "نیا دور" کے لئے اتنا کچھ بھیج چکا ہوں کہ ندامت کا احساس ہونے لگا۔ سوچتا ہوں کہ آپ کے اکثر قاری اسے نیاز مندی کی اجارہ داری سمجھنے لگیں گے۔ تاہم یار زندہ صحبت باقی۔ اب کوئی اور نظم لکھی گئی تو آپ کی نذر کروں گا۔

اپنی شاعری کے بارے میں امریکی طالب علموں کے ساتھ انٹرویو کی نقل تیار کر رہا ہوں۔ شاید اور دو ہفتے میں بھجوا سکوں گا۔

جدید فارسی شاعری کے بارے میں مواد جمع کر رہا ہوں۔ یہ لوگ ہماری طرح سے "مشکل گو" ہیں۔ اور وہی الزامات جو اس نیاز مند پر یا میراجی پر لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پر لگائے گئے ہیں۔ یہاں بھی نیما یوشیج، جدید فارسی شاعری کا میراجی ہے اسے آج تک گالیاں دی جاتی ہیں۔ اس نے فارسی شاعری کی دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ اب نئے شاعروں میں نادر نادر پور، ید اللہ رویائی، مہدی اخوان ثالث — م۔ امید) اور سہراب سپہری ہیں۔ جن کا کلام پڑھ رہا ہوں، ابھی ان میں سے کسی سے ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں انتظار کر لیجئے۔ ان کے بارے میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور پھر "نیا دور" کو بھجواؤں گا۔

آپ کو جب آنا ہو ایک خط لکھ دیجئے۔ اگر خط لکھنے کا وقت نہ ملے تو یہ دو ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔ دفتر۔ ۵ — ۶۷۵۹۱ (اوقات صبح ساڑھے سات بجے سے دوپہر ڈیڑھ بجے تک) گھر۔ ۸۶۴۱۳۔

ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔ اگر "جامع القواعد" کراچی میں مل سکے (اگر جامع القواعد نہ ملے) تو کوئی نہایت اچھی سی اردو گرامر کی کتاب (مثلاً انجمن ترقی اردو نے اگر شائع کی ہو تو) اور ساتویں آٹھویں نویں دسویں کے اردو کے کورس، اور ڈاکٹر صادق کی انگریزی کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" کی ایک جلد بھجوا دیجئے ممنون ہوں گا۔ اس بارے میں اگر عجلت سے کام لے سکیں تو مزید شکریہ ادا کروں گا۔ بل مجھے بھیج دیجئے۔

مخلص راشد

۱۷

تہران۔

۱۸ جون ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اس خط کے ساتھ ہی آپ کو "اُس مصاحبے" (انٹرویو) کا خلاصہ اور

ترجمہ ملے گا جو میں نے تین امریکی یونیورسٹیوں کے تین طالب علموں کو دیا تھا خلاصہ کرنے کے باوجود مضمون طویل ہو گیا ہے۔ ستر کے قریب سوال شامل کئے ہیں چند ایک حذف کر دیئے ہیں۔ پھر بھی ٹائپ کے چھبیس صفحوں پر مضمون پھیل گیا ہے۔ امید ہے "نیا دور" کا دامن اس کے لئے تنگ ثابت نہ ہوگا۔

میں نے ابھی تک ایران کے جدید شاعروں کے ساتھ رسم و راہ پیدا نہیں کی تاہم جہاں کہیں سے ان کا کلام ملتا ہے اس کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اس میں ایک ایرانی دوست کی مدد بھی لے رہا ہوں کیونکہ یہ لوگ جو زبان لکھتے ہیں۔ وہ کلاسیکل ڈکشنریوں میں نہیں ملتی۔ بہت سے الفاظ بے معنی یوں بھی مرورِ وقت سے بدل چکے ہیں۔ اور یہ لوگ الفاظ کو نئے معنی پہنانے میں خاصے "دلیر" بھی واقع ہوئے ہیں۔ بہت سا وقت چاہیئے۔ جب بھی ممکن ہوا آپ کو جدید ایرانی شاعری پر سیر حاصل مضمون لکھ کر بھیجوں گا۔ ان جدید شاعروں میں سے بعض، خاص طور پر مہدی اخوان ثالث (م۔ اُمید) ہم سے خفا ہیں کہ ہم ملک الشعرا بہار اور صادق سرمدکو ایران کے قومی شاعر سمجھتے ہیں۔ اور جدید شاعروں سے پاکستان آشنا نہیں۔ یہاں پاکستان کے سفارت خانے میں کسی زمانے میں خواجہ عبدالحمید عرفانی افسر مطبوعات تھے۔ اُن سے خاص طور پر خفا ہیں۔ جو ایک طرف فیض کا ذکر آنے سے کتراتے تھے، دوسری طرف جدید فارسی شاعری کا فراق کم رکھتے تھے تیسرے فارسی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے باوجود فارسی پنجابی لہجے سے بولتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اعتراضات کہاں تک درست ہیں۔ لیکن م۔ اُمید نے تو ان کا مفصل ذکر اپنے مجموعہ کلام "از ین اوستا" کے دیباچے میں کیا ہے۔ اور کچھ ناراضگی سے اور کچھ طنز سے۔

تہران آنے کا پروگرام ضرور بنایئے۔ اور اگر یہاں آنے سے پہلے اپنے "ادبی مقاصد" کو مدنظر رکھ کر ادبی پروگرام بنانا چاہیں تو اس میں ہر مدد کے لئے حاضر ہوں۔

مخلص راشد

تہران

۲۲ جون ۱۹۶۸ء

برادرِ عزیز۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ میرا مضمون (انٹرویو) موصول ہو گیا ہوگا۔ اس میں کسی قدر ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر ممکن ہو تو اصلاح کر لیجئے۔

صفحہ ۱۱ پر سطر ۹ ۔۔۔ دہی کی جگہ کسبی ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۲۶ آخری سطر۔ تادقتیکہ وہ ایسے کی بجائے تادقتیکہ وہ ریاست ایسے ... ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۷۱ پر سطر ۵ ۔ عشق کا ایک رُخ ہے کے بعد یہ عبارت ترمیم ، اضافہ کر لیجئے۔

میری نظموں میں "آدابِ محفل" کا رکھ رکھاؤ نسبتاً کم ہے ۔ ہم نے اپنی زندگی اور شاعری میں "آدابِ محفل" کو اس بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ ان سے خوف آنے لگا ہے ۔ اور ان نظموں کا "غم و غصہ" بھی در اصل اسی عشق کی تکمیل کی خواہش اور اسی کی ناپائی اور شگفتگی دیکھنے کی تمنا ہے، غصہ کمزوری سہی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غصہ دیانت داری اور بے لوثی کے بغیر ممکن بھی نہیں۔

میں اپنے تیسرے مجموعے کا نام ......

مخلص راشد

۱۹

تہران

۲۱ جولائی ۱۹۶۸ء

برادرِ عزیز ۔ ۱۱ جولائی کا خط ملا ۔ کتابوں کا پارسل بھی ۔ آپ نے بے حد کرم فرمایا ۔ اور بے حد ممنون ہوں "نیا دور" میں بعض نئی کتابوں کا اشتہار چھپتا رہتا ہے ۔ اگر ان کا ایک ایک نسخہ بھی بھیج سکیے تو شکرگزار ہوں گا ۔ لیکن آپ نے "حسابِ دوستاں در دل" کہہ کر ایک حد تک ڈرا دیا ہے ۔

نیا شمارہ ملا جس میں میری نظمیں ہیں ۔ صرف ایک نظم "افسانۂ شہر" کے تیرھویں مصرعے میں آن کی جگہ تان چھپ گیا ۔ اور مصرع بے معنی ہو گیا ۔ بہر حال کتابت اور کاتب کے ظلم سے پورے طور پر بچ نکلنا کسی لکھنے والے کے لئے ممکن نہیں ہے ۔

فارسی کی جدید نظمیں جمع کر رہا ہوں ۔ اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ ہے ۔ کتاب کے آخر میں شاعروں کے مختصر حالات بھی ہوں گے ۔ آپ نے PENGUIN کے سلسلے میں ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ شاعری کے مجموعے دیکھے ہوں گے ۔ ان کا تتبع کرنا چاہتا ہوں ۔ کاش اسی طرح جدید اردو شاعری کا ایک مجموعہ فارسی ترجمے کے ساتھ شائع ہو سکے ۔

مخلص راشد

۲۰

تہران
۳ اگست ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ "معاصر" کی کتابت تو شاید ابھی شروع نہ ہوئی ہوگی۔ اس میں صفحہ ما پر ایک چھوٹی سی ترمیم ضروری ہے۔ سطر ۲۶ جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے "خوش قسمتی سے ....." اسے یوں شروع ہونا چاہیئے

جیسے "ملک سپیا" نے بھی کہیں اشارہ کیا ہے خوش قسمتی سے ..... الخ

کرم ہوگا اگر آپ یہ تصحیح مسودے میں کرلیں۔ تہران آنے کے پروگرام نے کس حد تک "ترقی" کی۔

مخلص راشد

۲۱

تہران
۱۱ ستمبر ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ بہت دنوں سے آپ کی خیریت کی خبر نہیں ملی۔ اور "نیا دور" کا کوئی پرچہ بھی موصول نہیں ہوا۔ آپ "شاہد نمبر" شائع کرنا چاہتے تھے۔ وہ کس منزل میں ہے؟ وہ پرچہ جس میں پاکستانی کلچر کے تقاضوں پر بحث شائع کرنا مقصود تھی وہ کب چھپے گا! میں نے جو انٹرویو بھیجا تھا وہ آپ کے کام کا ہے یا نہیں؟ میں نے آپ کی فرمائش کے پیش نظر، اور جدید فارسی شاعری پر مضمون کی تیاری کے لئے جدید فارسی شاعری کے دیوان جمع کرنے شروع کر دیئے ہیں، اور ایک اتالیق کی مدد سے سبقاً ان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد جدید شاعروں سے ملاقات کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس مضمون میں شاید خاصا وقت صرف ہو جائے۔ لیکن آپ نے جو تفریق دلائی ہے اس کا نتیجہ ضرور کچھ نہ کچھ نکلے گا۔

آپ کے سفر تہران کے ارادے کہاں تک پہنچے؟ دسمبر میں شاید کراچی آنکلوں۔ اگر نیویارک سے اجازت مل گئی تو، پھر آپ سے مفصل باتیں ہوں گی۔ کراچی میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں کوئی ۲۲۵۰ مربع گز زمین کا پلاٹ ہے اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی گاہک اتفاق سے مل جائے تو اطلاع دیجئے گا۔

پھر "اتمالی" (لاہور، میر نیازی) "مادرا" اور "ایران میں اجنبی" کے نئے اڈیشن اور "لا = انسان" کا پہلا اڈیشن شائع کرنے پر آمادہ ہے۔ ان کے پروف دسمبر میں دیکھ سکوں گا۔ اگر ہو سکے تو پورا پرچہ نہیں۔ صرف میری نظموں کے ورقے ذیل کے پتہ پر بھجوا دیجئے (یعنی جو گذشتہ سال بھر میں "نیا دور" میں شائع ہوئی ہیں۔)

مخلص راشد

۲۲

تہران

۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

برادر عزیز ـــ گذشتہ خط میں یہ لکھنا یاد نہ رہا کہ نیویارک میں ان تین اصحاب کے نام پرچہ بھیجنا فی الحال بند کر دیجئے۔ آغا عبدالحمید، کے۔ جی فرید اور مرزا مظفر شکوہ۔ بیروت میں مرزا تقی تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا ان کے نام بھی اب پرچہ بھیجنا بے کار ہے۔

یو۔ این میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ آیا عملے کے کارکنوں کو اپنی ہر تصنیف کی اشاعت کے لئے پیشگی اجازت لینے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ قواعد کی رو سے صرف ان تصانیف کی اشاعت کے لئے اجازت لینا ضروری ہے جن کا تعلق کسی سیاسی مسئلے سے ہو یا اقوام متحدہ کے کاروبار سے۔ تاہم (ان) جب پرچہ جاتا ہے تو ایک ہندوستانی ڈائرکٹر تک بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور اس پر اس نیازمند کے نام خط آ جاتا ہے کہ اجازت کیوں نہیں لی۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاہد نمبر کب تک آئے گا؟ انتظار ہے۔

مخلص راشد

۲۳

تہران

۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ کا ۱۴ اکتوبر کا خط ملا۔ ممنون ہوں۔ اس خط کے ساتھ بلاٹ

کا نقشہ بھیج رہا ہوں۔ یہ پلاٹ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی اسکیم ۲ میں واقع ہے۔ یہ سوسائٹی اب قریب قریب کورنگی تک پھیل گئی ہے۔ اس لئے اسکیم ۲ کے پلاٹوں کی طلب بہت ہے۔ سنا ہے کہ ساٹھ روپے فی گز تک یہ بک گئے ہیں۔ اگر سودا اچھا ہو سکے، آپ کی وساطت سے، تو ممنون ہوں گا۔

"جدید فارسی شاعری" پر مضمون قریب قریب مکمل ہو چکا ہے لیکن یہاں ۲۱ اکتوبر سے ۵ نومبر تک "شاعروں کی کانفرنس" ہو رہی ہے۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ شاید اس کانفرنس سے معلومات میں مزید اضافہ ہو اور جدید فارسی شاعری کو پرکھنے کے لئے نئے اشارات حاصل ہو سکیں۔ نومبر میں مجھے تبریز، رضائیہ، آبادان، اہواز، مشہد، نیشاپور اور رشت کے دورے پر جانا ہے۔ پورا مہینہ لگ جائے گا۔ اس لئے مضمون دسمبر کے پہلے ہفتے میں آپ کو بھیج دوں گا۔ خیال ہے کہ اس مضمون کو "ایران میں اجنبی" کے دوسرے اڈیشن کے دیباچے کے طور پر استعمال کروں۔ لیکن کسی قدر اختصار کے ساتھ۔ "لا = انسان" یعنی تیسرا مجموعہ جنوری میں چھپ جائے گا۔ اس کے فوراً بعد "ماورا" کا چوتھا اڈیشن اور "ایران میں اجنبی" کا دوسرا اڈیشن شائع ہو جائیں گے۔ "ماورا" کا نیا دیباچہ لکھا ہے۔ اور "لا = انسان" کا دیباچہ وہ مصاحبہ ہو گا جو امریکہ میں چند طالب علموں کو دیا تھا۔ اور جس کی نقل نیا دور کے لئے بھیج چکا ہوں۔

اگر ہو سکے تو "نیا دور" میں ان تینوں مجموعوں کی اشاعت اور خاص طور پر "لا = انسان" کی اشاعت کا ایک آدھ دفعہ اشتہار شائع کر دیجئے۔ پبلشر کا نام "المثال"، نیپیئر روڈ۔ لاہور ہے۔

میرا ارادہ ۶ جنوری کو کراچی پہنچنے کا ہے۔ غالباً جنوری کے آخر تک کراچی میں رہوں گا اور پھر فروری اور مارچ کا مہینہ لاہور، جوہر آباد (جہاں بھائی کالج کے پرنسپل ہیں) اور راولپنڈی میں گھوم پھر کر گزاروں گا۔ ۶ جنوری مشروط تاریخ ہے۔ صحیح تاریخ سے بعد میں آگاہ کر دوں گا۔

مخلص راشد

---

۲ نومبر ۱۹۶۱ء

محب عزیز! "جدید فارسی شاعری" پر مضمون خلاف توقع جلد مکمل ہو گیا۔ گذشتہ چند دنوں میں کچھ فرصت مل گئی تھی۔ اس لئے اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ مضمون خاصا طویل ہے۔ غالباً "نیا دور" کے

چالیس یا زیادہ صفحے لے گا۔ مجھے اس مضمون کو دو قسطوں میں شائع کرنا پسند نہیں کیوں کہ آپ کے دو شماروں کے درمیان خاصا "زمانہ" گزر جاتا ہے۔

آپ اس کا عنوان "مقدمہ" بدل کر "جدید فارسی شاعری" رکھ لیجئے۔ اور ایک چھوٹا سا فٹ نوٹ اپنی طرف سے اضافہ کر دیجئے۔ "یہ مضمون ن۔م۔راشد صاحب کے مجموعے "ایران میں اجنبی" کے دوسرے ایڈیشن میں مقدمے کے طور پر شامل ہے۔ یہ ایڈیشن مکتبۂ لاہور کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔"

مضمون آج یا کل رجسٹرڈ ائرمیل سے بھجوا دوں گا۔ پہنچنے پر اطلاع دیجئے۔

امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ غالباً اردو میں پہلی مرتبہ اس حد تک جدید فارسی شاعروں کے بارے میں کچھ لکھا گیا ہے۔ پھر کہیں کہیں اردو کے جدید شاعروں کے ساتھ موازنہ شاید مزید دلچسپی کا باعث ہو۔ اس مضمون کے پروف دیکھنے میں آپ کو خاصا دقت کا سامنا ہوگا۔ خاص طور پر فارسی نظموں کے پروف، اردو ہی کی جدید نظموں میں طرح طرح کی طباعت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ چہ جائے کہ جدید فارسی شاعری! اگر آپ چاہیں تو پروف مجھے یہاں بھجوا دیجئے۔ اگر اس میں کسی مشکل کا اندیشہ ہو تو جب ۴ جنوری کو کراچی آؤں گا تو پروف دیکھ لوں گا۔ اگر شاعروں کی تصویریں درکار ہوں تو فراہم کرنے کی کوشش کروں۔ مضمون میں نو شاعروں کا ایک حد تک مفصل تذکرہ ہے۔ میں نے ان کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف شاعروں پر تبصرہ ہے اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔

مخلص راشد

تہران

۲۷ نومبر ۱۹۶۸ء

برادر عزیز۔ اس خط کے ساتھ نو جدید فارسی شاعروں کی تصاویر بھیج رہا ہوں۔ مناسب ہوگا۔ انہیں آپ اسی ترتیب سے شائع کریں جس ترتیب سے میرے مقالے میں ان کا تذکرہ ہوا ہے۔ شعراء کے نام ہر تصویر کی پشت پر درج ہیں۔

یاد آیا کہ اب آپ کے پاس میرے مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔

(۱) ایک خط جس میں پاکستانی کلچر کی بحث تھی

(۲) شاہد احمد۔ کچھ یادیں۔

(۳) مصاحبہ (جس میں جدید اردو شاعری سے اور میری شاعری سے بحث کی گئی ہے)

(۴) جدید فارسی شاعری (مقدمہ)

یا شاید کوئی اور چیزیں بھی ہوں۔ بہرحال کرم ہوگا اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مضامین کب اور کس ترتیب سے شائع ہو رہے ہیں۔

مخلص راشد

۲۶

ہوٹل انٹرنیشنل

اپر مال ـــ لاہور

۱۲ فروری ۱۹۶۹ء

برادر عزیز ـــ خدا آپ کو خوش رکھے۔ "لا = انسان" چھپنی شروع ہو گئی ہے۔ شاید فروری کے آخر تک بازار میں آ جائے گی۔ "ماورا" کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ "ایران میں اجنبی" تاحال شروع نہیں ہوئی۔ میں نے "لا = انسان" میں مصاحبہ شامل کیا گیا ہے۔ اور اس کے نیچے (آپ خوش ہوں گے) یہ نوٹ دیا ہے کہ یہ "مصاحبہ نیا دور" کراچی کے شمارہ ۴۹ ـ ۵۰ سے ماخوذ ہے" اب اسے آئندہ شمارے میں ضرور شامل کر لیجئے۔ جدید فارسی شاعری والے مضمون کو "ایران میں اجنبی" کے مقدمے کے طور پر استعمال کرنے کا خیال بدل دیا ہے۔ اس کی بجائے ایک نیا مختصر سا دیباچہ لکھ کر دے رہا ہوں۔ خیال ہے کہ جدید فارسی شاعری والے مضمون کو ایک مغلٹ کتاب کے لئے محفوظ کروں جس میں پچاس یا پچپتر کے لگ بھگ جدید فارسی نظموں کے ترجمے (مع اصل یا بغیر اصل) شامل کئے جائیں جس کا مقدمہ وہی مضمون ہوگا جو آپ کی فرمائش پر "جدید فارسی شاعری" پر لکھا ہے۔

اگر مجھے "مصاحبہ" اور "جدید فارسی شاعری" کے پروف بھجوا دیں تو ممنون ہوں گا۔ ویسے پروگرام میں تبدیلی کر رہا ہوں۔ ۲۸ فروری یا یکم مارچ کو کراچی لوٹ آنے کا ارادہ "باندھ" رہا ہوں۔ بشرطیکہ یہاں تینوں کتابیں میری مدد کی ضرورت سے بے نیاز ہو کر اپنا راستہ خود اختیار کر لیں۔ کراچی میں چند دن گذار کر اودزمین

کا معاملہ حتمی طور پر طے کر کے واپس تہران چلا جاؤں گا۔ یہ سب باتیں فی الحال دماغ میں یک رہی ہیں۔ آخری فیصلہ جلد لکھوں گا۔

پاکستانی کلچر کے بارے میں ہو سکے تو ضیا جالندھری صاحب سے مل کر بات کیجیے۔ شاید مضمون لکھ سکیں۔

اپنے حالات سے اطلاع دیجیے۔

مخلص، راشد

۲۷

تہران

۳۰ر اپریل ۱۹۶۹ء

برادر عزیز۔ ۲۵ر اپریل کا خط کل ملا۔ اس خط کے ساتھ یہ تین نظمیں بھیج رہا ہوں۔ (۱) ہم جسم (۲) یہ خلا پر نہ ہوا (۳) طلب کے تلے۔

جدید فارسی نظموں کے ترجمے میں مصروف ہوں۔ اب تک کوئی تیس نظموں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے۔ بیس اور ہو جائیں تو منیر نیازی کو بھیج دوں گا۔ وہ "لا = انسان" ہی کے سائز اور گٹ اپ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

میں یو۔ این سے سبکدوش ہو کر یہاں کی کسی یونیورسٹی میں پاکستانی اسٹڈیز کے شعبے میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ بعض یونیورسٹیوں کے ساتھ گفت و شنید ہو رہی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک تو اردو ادب پر (تاریخ نہیں، بلکہ اردو ادب کی روایت اور درایت پر) لیکچروں کا ایک سلسلہ تیار کروں۔ دوسرے، پاکستانی تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں ایک اور سلسلہ ہو جس میں ہندی، عربی، ایرانی اور عہد حاضر کے ان تمام عناصر کے چشموں کا ذکر کیا جائے جو ہماری موجودہ تہذیب کے اجزائے لاینفک ہیں۔ اور جن کو سمجھے بغیر عہد حاضر کے پاکستانی کی نفسیات کو سمجھنا مشکل ہے۔ اردو ادب پر جو لیکچروں کا سلسلہ تیار کر رہا ہوں اس کے بارے میں آپ کو دو تین ہفتوں کے بعد لکھوں گا۔ اگر کسی یونیورسٹی نے منظور کر لیا تو ان لیکچروں کو تقویت دینے کے لئے اردو نظم اور نثر کا انتخاب کرنا مناسب ہو گا۔ محض جدید یعنی موجودہ زمانے کی نظم و نثر کا انتخاب باہر کے ملکوں کے طلبا کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھے گا۔ شاید اپنے ملک کے لئے زیادہ دلچسپ اور کارآمد ثابت ہو۔

کتابیں جب پہنچیں گی، آپ کو بھجوا دوں گا۔ اطمینان رکھئے۔ اردو میں کوئی نئی شعر یا تنقید کی کتاب
ہ تو کرم ہوگا۔ اگر میرے نام آپ بھجوا سکیں۔ اور ہاں اگر ممکن ہو تو میری تینوں کتابوں کا اشتہار ایک
ر شائع کر دیجئے۔ پبلشر کا نام "امثال" نہیں بلکہ "المثال" ہے۔ پہلے اشتہار میں غلط چھپ گیا تھا۔

مخلص راشد

۲۸

پوسٹ بکس۔ ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۱۴؍ جولائی۔ ۱۹۶۹ء

برادر عزیز۔ آپ کے ۲۲؍ جون اور یکم جولائی کے خط میرے سامنے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو "نیا دور"
ہ شمارے کی دس پندرہ جلدیں بھجوا دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔ جن فارسی شاعروں کا ذکر اس میں ہوا ہے۔
یک ایک جلد آپ کی طرف سے نذر کروں گا۔ اور اس کے علاوہ دو تین کاپیاں اُن یونیورسٹیوں
ں اردو پڑھائی جاتی ہے۔

منیر نیازی کو خط لکھ کر "مادرا" اور "تہران میں اجنبی" کے نسخے منگوا لیجئے۔ ہو سکے تو اگلے شمارے
ا پر تبصرہ شائع کر دیجئے۔ اگر کراچی کے کوئی بزرگ مثلاً ممتاز حسین تبصرہ کر سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔
بھی میرے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ یا کوئی اور ذہین آدمی جو دقیانوس کے عشق میں مبتلا نہ ہو، لکھ
مناسب ہوگا۔

آپ کی کتابوں کا کوئی پیکٹ تا حال موصول نہیں ہوا۔ اس میں کون کون سی کتاب ہے اور کتنی ہیں۔

جدید فارسی شاعری پر کتاب پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ جتنا مطالعہ کرتا ہوں، اُتنا ہی عشق بڑھتا جا رہا
ب تک کوئی پچاس نظموں کے ترجمے اپنی آخری صورت میں موجود ہیں لیکن بیس کے قریب اور شامل ہوں
ن کا ابتدائی مسودہ تیار کر چکا ہوں۔ کل شاعروں کی تعداد نو سے بڑھتے بڑھتے بائیس تک جا پہنچی ہے۔
بدید شاعری پر اپنے مقالے میں بھی مزید آٹھ دس صفحے کا اضافہ کیا ہے۔ یہاں اس ترجمے کا ذکر انگریزی
رسی کے اخباروں اور رسالوں میں ہونے لگا ہے۔ ریڈیو پر بھی اس کے بارے میں ایک انٹرویو دے رہا ہوں۔

ایک ہفتہ وار اخبار "فردوسی" میں (جو جدید فارسی شاعری کے پرستاروں میں ہے) ایک صاحب اور میری دو نظموں کا ترجمہ اسی ہفتہ شائع ہوا ہے۔ اور اس میں اس ترجمے کی مہم کا بھی مفصل ذکر ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اگلا پرچہ کب شائع ہوگا۔ تاکہ اس کے لئے نظمیں تیار رکھوں۔

مخلص راشد

۲۹

تہران

۱۹ اگست ۱۹۶۹ء

برادر عزیز۔ "نیا دور" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ خدا کا شکر کہ "بنیادی مسئلے" پر بحث ختم ہوئی۔ اس کے بعد توبہ کی ہے کہ آئندہ کسی مسئلے پر کسی اڈیٹر کے نام خط نہیں لکھوں گا۔ انگریزی مثل کے مصداق ___ جہاں لوگ نادانی میں خوش ہوں۔ وہاں عقل کی بات کرنا بے وقوفی ہے۔

مجھے یہ بتایئے کہ آپ کتابت کی غلطیوں کو کب تک "پرانی امانت" سمجھ کر برقرار رکھیں گے۔ یا کوئی ایسی ترکیب سجھایئے کہ اُن الفاظ کے بارے میں پیش بینی کی جا سکے جن کے سہو کاتب کی نذر ہونے کا احتمال ہو۔ تاکہ یا وہ الفاظ صاف لکھے جائیں یا حذف کر دیئے جائیں؟ کیسے بے چارہ کاتب، ہر لکھنے والے کے حق میں کاتب تقدیر کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ صرف ایک جنبش قلم سے۔

کرم ہوگا اگر آپ فارسی شعراء میں سے فریدون توللی کی تصویر یا بلاک یا ہردو منیر نیازی کے نام بھجوا دیں۔ ان کا پتہ ہے۔ انتال ___ گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ نیپیر روڈ۔ لاہور۔

اگلا پرچہ کب نکلے گا۔ اس کے لئے دو تین نظمیں تیار ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو بھجوا دوں؟

مخلص راشد

۳۰

تہران

۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء

برادر عزیز ___ بہت دنوں سے آپ تغافل سے کام لے رہے ہیں۔ خدا کرے خیریت ہو۔

"نیا دور" بھی" راشد نمبر"[1] کے بعد موصول نہیں ہوا۔ چھپ رہا ہے یا نہیں۔ کتابیں آپ کے نام بھجوائی تھیں اُن کی رسید بھی اب تک موصول نہیں ہوئی ہے۔

مخلص راشد

۳۱

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء

عزیز گرامی۔ آپ کا ۱۸ ستمبر کا اور اس کے بعد ۲ اکتوبر کا خط ملا۔ جب یو۔ این۔ ڈی۔ پی اجلاس ہوتا ہے تو ہماری معروفیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ پھر ہفتہ بھر پہلے کرمان شاہ سے واپس آتے ہوئے جس گاڑی میں میں میری بیوی اور چھ سال کا بچہ تریل سفر کر رہے تھے۔ وہ پلٹ کر ایک نالے میں جا گری اور ہم مشکل سے جاں بر ہو سکے۔ سب کو حسب توفیق چوٹیں آئی ہیں۔ میری گردن اور کمر کے پٹھوں کو ضرب پہنچی ہے۔ اور زیر علاج ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ زندہ ہوں۔

تازہ شمارہ تا حال موصول نہیں ہوا۔ انتظار ہے جب مل جائے گا تو لکھوں گا۔ آپ کے آئندہ شمارے کے لئے مضمون کا موضوع متواتر زیر غور ہے۔ کچھ طے نہیں کر سکا۔ ادھر کوئی نئی نظم بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ ضرور بھیج دیتا۔ ایک طویل نظم کی بنیاد پڑی ہے معلوم نہیں کب مکمل ہو۔ اس میں کچھ ذاتی کچھ اجتماعی یادیں ہوں گی۔ مکمل ہو گئی تو بھیج دوں گا۔

کتابوں کے پیکٹ جیسے ہی موصول ہوتے، روانہ کر دوں گا۔ فکر نہ کیجئے۔ میں تہران میں جون ۱۹۷۲ء تک قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ البتہ اگلے سال فروری کے شروع میں جانے کا ارادہ ہے اور پھر پاکستان اگر کوئی ڈیڑھ مہینہ گذاروں گا۔ اس میں کراچی کا ایک ہفتہ بھی شامل ہے۔ دسمبر میں آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ کیوں کہ

---

[1] چونکہ ایک شمارہ میں راشد کی بہت سی تخلیقات ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں اس لئے راشد نے اس شمارے کو "راشد نمبر" کا نام دے دیا ہے۔

یہاں کچھ کانفرنسیں ہو رہی ہیں جن میں میری حاضری ضروری ہے۔

آپ نے کرم کیا کہ "لا=انسان" پر تبصرہ شائع کر دیا۔ ممنون ہوں۔ منیر نیازی کی غفلت سے، اس کتاب پر وہ توجہ نہیں دی گئی جس کی یہ حقدار ہے۔ یا جس کی مجھے توقع تھی۔ آپ کو تہران ضرور آنا چاہیئے۔ بلکہ ایران آ کر اصفہان، شیراز اور مشہد کی سیر بھی کرنی چاہیئے۔ جنوری میں میں دورے پر جا رہا ہوں۔ اگر آپ آ رہے ہوں تو آپ کی رفاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ والسلام۔

مخلص راشد

۳۲

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۵ نومبر ۱۹۷۰ء

برادر عزیز و گرامی۔ مزید نو کتابیں جن کی فہرست منسلک ہے، آپ کے نام سمندری ڈاک سے بھجوا دی گئی ہیں۔ رسید سے مطلع کر دیجئے تاکہ اطمینان رہے۔

"نیا دور" میں اپنی نظمیں اور ریویو دوبارہ پڑھا۔ چھوٹی موٹی کتابت کی غلطیاں اب بھی رہ گئی ہیں۔ لیکن دو غلطیاں ایک حد تک اساسی ہیں۔ یعنی معانی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نظم "مجھے وداع کر" میں ایک جگہ "تمام اپنے آپ ہی کو چاٹتے ہوئے" کی جگہ "تمام اپنے آپ ہی کو چاہتے ہوئے" چھپ گیا ہے۔ اسی طرح نظم "جہاں ابھی رات ہے" میں "دود دامنی" کی جگہ "دور دامنی" چھپا ہے۔ نئی قسم کی شاعری کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ کاتب کے فہم سے بالا رہتی ہے۔ وہ جن کلیشوں کے عادی ہوتے ہیں، اگر وہ نظم میں موجود نہ ہوں۔ تو ان کی خوش نویسی پر حرف آتا ہے۔ "ریویو" میں صرف اس بات پر اعتراض ہے کہ "ابولہب کی شادی" کو بہترین نظم قرار دیا گیا ہے۔ یہ بوجوہ درست نہیں۔ بہرحال نظم کے بارے میں رائے کے اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ والسلام

مخلص راشد

۳۳

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵
تہران
۲۹ ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء

محب عزیز۔ اس خط کے ساتھ ان کی کتابوں کی فہرست بھجوا رہا ہوں جو چار پارسلوں کی صورت میں
کے نام زمینی ڈاک سے آج ارسال کی جا رہی ہیں۔
"نیا دور" کا تازہ پرچہ ملا۔ ممنون ہوں۔ ریویو مختصر تھا لیکن اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔
نار کا بھی شکریہ سلیم احمد کی نظمیں پڑھ کر محظوظ ہوا۔ وہ بے حد ذہین اور طباع آدمی ہیں۔ لیکن اگر وقت
نے پر ان کی "بقراطیت" کسی قدر کم ہو جائے تو ان کا جوہر زیادہ چمک اٹھے گا۔ لیکن اسے ایک بیر
ن سال کی رائے سے زیادہ اہمیت نہ دیجئے گا۔
مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ جو عنوان فی الحال سوچا ہے وہ ہے "پاکستان میں خدا"۔ اگر مکمل
یا تو بھیج دوں گا۔ اگر جنوری کے پرچے کے لئے نہ بھیج سکا تو بعد میں سہی۔
مخلص راشد

۳۴

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵
تہران۔ ایران
۱۷ ر نومبر سنہ ۱۹۷۰ء

برادر عزیز۔ آپ تندرست اور خوش و خرم رہیں۔ آپ کا ۴ ر نومبر کا خط پیش نظر ہے۔ ممنون
ں۔ ابھی تک زیر علاج ہوں۔ سر اور گردن کے پٹھے بدستور اکڑے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک
ر رہا ہوں۔ خوش قسمتی سے بیوی اور نزیل کو معمولی چوٹیں آئیں اور انہیں جلد افاقہ ہو گیا۔ لیکن مجھے شاید
ری تندرستی کے لئے کسی قدر انتظار کرنا پڑے گا۔
اس خط کے ساتھ مزید فہرست بھیج رہا ہوں۔ یہ کتابیں کل زمینی ڈاک سے آپ کو بھیج دی گئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر چند دن یہاں تھیں۔ اُن سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ یہاں سے بے سروصدا کراچی روانہ ہوگئیں۔ شاید آپ سے ملی ہوں۔

منیر نیازی کے بارے میں جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں دردناک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت درویشی کے عالم میں ہیں اور بزنس کی طرف اُن کی کوئی توجہ نہیں۔ پاکستان آنے پر ارادہ ہے کہ اپنی ساری کتابیں ان سے خرید کر کسی کتاب فروش کے حوالے کردوں۔ ورنہ یہ ان کے دفتر میں پڑی پڑی سڑتی رہیں گی۔ میں نے یہاں سے تینوں کتابوں کا سرورق چھپوا کر بھجوا دیا تھا۔ اس کی رسید بھی انہوں نے نہیں دی۔ اور کسی خط کا جواب بھی نہیں دیتے۔ خدا خیر کرے۔ کتابوں کی فروخت کے بارے میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ جنوری میں بشرط صحت میں ایران کے مختلف شہروں کا دورہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پھر ۲ فروری کے لگ بھگ کراچی پہنچوں گا۔ دفتر اطلاعات میں سدن خان میرے پروگرام سے واقف ہوں گے۔ پھر ۱۴ فروری کو بمبئی، حیدرآباد، دلی، علی گڑھ اور لکھنؤ جانا چاہتا ہوں تاکہ پرانے احباب سے ایک بار مل لوں۔ اور نئی صورتوں سے شناسائی پیدا کرلوں۔ وہاں سے براہ راست ۵ مارچ کو لاہور پہنچوں گا۔ اور رخصت کا زیادہ تر وقت لاہور پنڈی، اور پشاور میں گذار کر اپریل کے شروع میں واپس تہران آجاؤں گا۔ یہ سب کچھ ویزا ملنے پر اور صحت پر منحصر ہے۔

والسلام۔ مخلص راشد

۳۵

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔

۱۴ فروری ۱۹۷۱ء

برادر عزیز۔ اس خط کے ساتھ اپنی طویل ترین نظم "گُمان کا ممکن — جو تو ہے، میں ہوں" بھیج رہا ہوں "نیا دور" کے لئے۔ اس دفعہ ہاتھ سے لکھی ہے تاکہ کتابت کی غلطی کا امکان کمتر ہو جائے۔

اب یہ نظر آتا ہے کہ ۱۴ مارچ کو ملاقات ہوگی۔ پروگرام کی ایک نقل درج کر رہا ہوں۔ کراچی میں انٹرکانٹی نینٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ بیوی اور دو بچے بھی ساتھ ہوں گے۔

مخلص راشد

۳۶

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۲۹ اپریل سنہ ۱۹۷۱ء

برادر عزیز۔ پاکستان سے واپس آکر اتنا مصروف رہا کہ خط لکھنے کو دم بھر کی مہلت نہ مل سکی۔ کراچی کے مختصر قیام میں آپ جس محبت سے پیش آئے اس کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور میں اور میری بیوی آپ کا اور آپ کی بیگم صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ وقت گذارا اور ہمیں نہایت اچھا کھانا کھانے کا موقعہ دیا۔ خدا آپ دونوں کو بخیریت اور خوش و خرم رکھے۔

حیدرآباد دکن کے رسالے "شعر و حکمت" کے خاص نمبر کی چند جلدیں موصول ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں ملنے پر اطلاع دیجیئے گا۔ والسلام

مخلص راشد

۳۷

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

یکم اگست سنہ ۱۹۷۱ء

برادر عزیز۔ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ جس قدر جلد ممکن ہو، میراجی کی تمام تصانیف کا ایک سیٹ میراجی کے بارے میں کتاب یا مضمون اور "نیا دور" کے وہ شمارے یا شمارہ جس میں میراجی کی نظمیں وغیرہ شائع ہوئی ہیں مجھے بھجوا دیجیے۔ اس میں "میراجی کے گیت"، "اس نظم میں"، "مشرق و مغرب کے نغمے" بھی شامل کر لیجیے۔ حیدرآباد دکن میں "شعر و حکمت" کے مغنی تبسم اپنے رسالے کا میراجی نمبر شائع کر رہے ہیں انہیں بھجوانا چاہتا ہوں۔

"نیا دور" کا تازہ شمارہ جس میں آپ میری طویل نظم شامل کرنے والے تھے، تا حال موصول نہیں ہوا۔ خدا کرے خیریت ہو۔ مزید نظمیں ایک ہفتہ تک بھجوا دوں گا۔ یا شاید جلد تر۔

اگر آموں کا موسم باقی ہو تو دس بیس دانے اچھے آموں کے PIA کے ذریعہ بھجوا دیجئے پارسل پہ۔ ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔ آفس ۳۱۷۹۹ گھر ۸۶۶۰۴۹

پتہ یوں لکھئے۔ سازمان ملل متحد ادارۂ اطلاعات۔ کوچہ بدر پہلوی۔ خیابان تخت جمشید۔ تہران۔ ایران

مخلص راشد

۳۸

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۱۴ اگست ۱۹۷۱ء

برادر عزیز۔ خدا آپ کو زندہ اور خوش رکھے۔ آموں کا پارسل بخیریت پہنچ گیا۔ بے حد ممنون ہوں۔ اگرچہ موسم ختم ہی ہو چکا ہوگا لیکن سب آم بہت میٹھے اور لذیذ تھے۔

اگر آپ چاہیں تو قیمت کا چیک بھیج دوں۔ ورنہ اگر یہاں سے کچھ منگانا چاہیں تو لکھئے۔

اس خط کے ساتھ چار نظمیں بھیج رہا ہوں۔ شاید ان میں سے ایک پہلے ہی بھجوا چکا ہوں۔ اگر نہیں تو یہ بھی اگلے پرچے میں شامل کر لیجئے ورنہ اس نسخے کو تصحیح شدہ نسخہ گردانئے۔

بیوی بچے انگلستان میں ہیں۔ اکیلا آپ کے بھیجے ہوئے آم کھا رہا ہوں۔ بعض ایرانی احباب کے ساتھ۔

مخلص راشد

۳۹

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء

برادر عزیز۔ آپ کے ۱۸ اگست کے خط کا جواب آج دے رہا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔ آموں کا

بے حد شکریہ دوبارہ ادا کر رہا ہوں۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے آپ نے بڑی عنایت کی۔ اس سلسلے میں جو مشکلات درپیش ہوتی ہوں گی ان کا مجھے بے حد احساس ہے۔

مجھے ذاتی طور پر اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور کی ادبی زندگی (خواہ کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو) آپ کے لئے تازہ اور تنوّع کی حامل ہوگی۔ پھر لاہور کے ادبی حلقوں میں "نیادور" اور آپ کی تصانیف یقیناً اشتیاق سے پڑھی جاتی ہوں گی۔ اور اس وجہ سے آپ اس محبت کی فراوانی سے بہرہ ور ہوں گے جو اہل لاہور کا خاصہ ہے۔

اگر "نیادور" سفید کاغذ پر چھپنے لگے تو میں تو بے حد خوش ہوں گا۔ کیوں کہ سفید کاغذ اخباری کاغذ کے مقابلے میں دیرپا بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ اور اس پر اغلاط کا امکان بھی شاید کم ہو۔ تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ پرچے کی اشاعت زیادہ ہو اور اشتہارات میں اضافہ ہو تاکہ خرچ پیدا ہو سکے۔ ایک عرصے سے نیا شمارہ نہیں ملا منتظر ہوں۔ خاص طور پر جس شمارے میں آپ "گمان کا ممکن ....." شائع کرنے والے تھے۔

والسلام مخلص راشد

۴۰

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۵۵

تہران۔ ایران

۱۷؍ستمبر ۱۹۶۲ء

برادر عزیز۔ آپ ہمیشہ خوش اور تندرست رہیں۔ خط ملا ممنون ہوں۔ میں نے جب یہ لکھا تھا کہ ہمیں مذہب سے زیادہ فلسفے کی اور ایمان سے زیادہ خرد کی ضرورت ہے۔ تو کسی خاص فلسفے یا کسی خاص نظام خرد کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا منظور تھا کہ ہم مذہب پر اپنے بے جا اصرار کی بنا پر بعض توہمات اور توہمات سے زیادہ خوش فہمیوں کے شکار برابر چلے آتے ہیں۔ یہ توہمات اور یہ خوش فہمیاں سیاسی بھی رہی ہیں، اقتصادی بھی اور اجتماعی بھی۔ اور پوری کی پوری قوم ان میں جکڑی ہوئی ہے۔ جہاں تک "ایمان" کا تعلق ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ اگر ایمان ہو تو "پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے" لیکن کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ ہاں پتھر ایمان سے پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی محض ایک پرکالے کی طرح نمودار ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ دیر

نہیں ہوتی۔ لیکن جب پتھر خرد کے زور سے پانی ہوتا ہے۔ بلکہ جب خرد کے زور سے پانی پتھر میں تبدیل ہو جاتا ہے (کیوں کہ دونوں باتیں ممکن ہیں) تبدیلی دور رس ہوتی ہے۔ بلکہ فیض جاری بن جاتی ہے۔ فیض جاری بھی اور فیض دائمی بھی۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ تہذیبوں کو دیر پا بنانے والی بات نہ مذہب میں ہے نہ محض ایمان میں۔ بلکہ ہمیشہ فلسفیانہ نقطۂ نظر اور خرد پرستی اس کا راز رہے ہیں۔

جہاں تک موجودہ حالات کا تعلق ہے میں تنا جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ناروا حجم کا کم ہو جانا کوئی بڑا حادثہ نہیں۔ صرف جن حالات میں یہ حادثہ رونما ہوا وہ افسوسناک ہیں۔ اور اگر ہم نے خرد سے کام نہ لیا اس کے عواقب اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ کیونکہ فطرت اپنی منطق نہیں بھولتی۔ کیوں کہ ہمارے بے ربط افکار پر دیوانہ وار ہنستی چلی جاتی ہے۔ میں نے ملک کے حجم میں کمی واقع ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ حجم کی زیادتی ملکوں پر بھی وہی اثر ڈالتی ہے جو افراد پر۔ طرح طرح کے امراض کی تولید کے علاوہ پیٹ کو بھوکا اور جسم کو ننگا رہ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ چادر سے سر ڈھانپئے تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانپئے تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔ جسم بھوکا اور ننگا رہتا ہے تا آنکہ اسی تناسب سے اسے خوراک اور لباس مہیا نہ کیا جائے۔ ہم سے زیادہ آبادی والے بعض ملکوں نے اسے حاصل کر لیا ہے لیکن ہم نہیں کر سکے۔

اس کے علاوہ ہم نے جو سب سے زیادہ خطرناک بات کی وہ اپنے وجود سے باہر اپنے لئے گرمی اور نور اخذ کر کے اس پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ باہر سے گرمی اور نور مستعار لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر انحصار کر لینا پڑتا ہے۔ ہر تہذیب اسی طرح پھولتی پھلتی ہے۔ جس طرح پودے، درخت اور پھول اپنی نشوونما پاتے ہیں۔ لیکن جس طرح پودوں اور درختوں اور پھولوں کے اندر اپنا رس نہ ہو جس سے وہ اپنی غذا حاصل کر سکیں تو وہ مرجھا جاتے ہیں۔ اسی طرح تہذیبیں اپنے اندرونی رس کے بغیر زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ رس ہے جو در اصل ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم باہر کی گرمی اور نور سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ یا ہم میں یہ رس باقی نہیں۔ یا ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی وجہ سے ہماری حرارت عزیزی کم ہوتی چلی گئی۔ اور اندیشہ ہے کہ اور بھی کم ہو جائے گی۔

تاہم حجم کے کم ہو جانے سے 'ہمارا جسم' میری رائے میں پہلے سے زیادہ متناسب ہو گیا ہے اور اس پر ہماری سیاسی اور فکری قبائیں زیادہ راس آنے لگیں گی۔ اب پاکستان کا ہیکل بھی درست ہے اور اس کی قوت بھی ۱۷ فیصد۔ کہ اشند وا کے حوصلے کے مطابق ہے۔ اپنے اس موجودہ ہیکل یا ہیئت اور قوت کے ساتھ

پاکستان اس قابل ہو جائے گا کہ آنے والے زمانے کا بار اٹھا سکے! ابھی تک ہم میں ایسے اہل بصیرت موجود نہیں ہیں جو اس بار کی شکل و صورت کا صحیح اندازہ لگا سکیں! ورنہ یہ پاکستان پر لادتے ہوئے اس بات کا کبھی اطمینان کر لیں کہ یہ بار نہ تو ایک جگہ پر بیٹھ کر رہ جائے نہ اس طرح کناروں سے لٹکنے لگے کہ گھسٹ کر زمین پر آ رہے اور ساتھ ہی پاکستان کی ٹانگیں دوبارہ لڑکھڑا جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صوبوں کی خود مختاری سے بیار پاکستان کے جسم پر ایک حد تک برابر تقسیم ہو جائے گا۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے کہ صوبے اور بھی زیادہ اور حجم میں اور بھی کم ہوتے جائیں تاکہ وہ اس طرح اپنی اس قامت کی بہتری سے قیمت کی بہتری کا راز پا لیں۔ اور جنہیں پھر ایک دوسرے کے ساتھ ہم بستگی کے سوا چارہ باقی نہ رہے! اور جنہیں اسی بستگی میں اپنی بقا کا راز دریافت کرنا پڑے۔

ایک دوام جس پر میں نے غور کیا ہے یہ ہے کہ ہم آزادی کے بعد سے نام نہاد sub-continent کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ جیسے ترکی نے اپنی سلطنت کی تباہی کے بعد اپنے آپ کو یورپ سے وابستہ کر لیا تھا۔ کیا ہم مشرقی پاکستان کے چلے جانے کے بعد اپنے آپ کو مشرق وسطیٰ سے وابستہ نہیں کر سکتے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری سرنوشت کا تعلق مشرق وسطیٰ کے ساتھ زیادہ ہے، ہندوستان کے بر صغیر کے ساتھ کم۔ ہندوستان ہمیں اپنے ساتھ باندھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے لیکن ہندوستان کے ساتھ بندھ جانا ہمارے لئے ایسا ہی ہوگا جیسے بندر اپنے قلندر کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری تہذیب متواتر پسپائی اختیار کرتی چلی جائے گی۔ چنانچہ ہندوستان کے موجودہ عزائم سے ہمیں اپنے آپ کو ہر حال میں محفوظ کر لینا چاہیئے۔ ہر قیمت پر ہمیں ہندوستان سے الگ ہو جانا چاہیئے کیونکہ ہندوستان میں ایسے عناصر ہمیشہ موجود رہیں گے جو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے LABENSRAUON کی تلاش میں ہوں۔ اور پھر ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ہر اس شخص کا قلع قمع کرتے چلے جائیں جس کے نام میں فارسی اور عربی شامل ہو۔ گزشتہ دو جنگوں میں ہندوستان نے جو ہمارے خلاف تبلیغ کی ہے، اسی سے اس کے آئندہ دیرپا عزائم کا اندازہ ہوتا ہے! اس کے علاوہ یہ امر مزید روشن ہو جاتا ہے کہ ہمارے اخلاق میں اور ہندوستانی کے اخلاق میں کیا فرق ہے! اخلاق اس فلسفے کا جزو اعظم ہے، جو تہذیبوں کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ان کو دیرپا بناتا ہے! اور ان کے نتائج کو دور رس۔ ہندوستانی کو جھوٹ اور مکر کی جو صلاحیت ملی ہے وہ اس کی تہذیب کو کوئی علو نہیں بخش سکتی۔ لیکن ہمارا اس کے اس منطقی انجام پر تکیہ کر لینا بھی درست نہ ہوگا۔ ہمارے لئے اپنے استحکام کا ہر راستہ تلاش کرنا ضروری ہے۔

مخلص

راشد

ن ۔ م ۔ راشد

پرانی سے نئی پود تک

رات جب باغ کے ہونٹوں پہ تبسم نہ رہا
رات جب باغ کی آنکھوں میں
تماشا کا تکلم نہ رہا
غنچے کہنے لگے:
"رُکنا ہے ہمیں باغ میں "لاسال" ابھی"۔
صبح جب آئی تو "لاسال" کے
جانکاہ معمّا کا فسوں بھی ٹوٹا!

صبح کے نام سے اب غنچے بہت ڈرتے ہیں
صبح کے ہاتھ میں
جرّاح کے نشتر سے بہت ڈرتے ہیں
وہ جو غنچوں کے مہ و سال کی کوتاہی میں
ایک لمحہ تھا، بہت ہی روشن
وہی اب ان کے پگھلتے ہوئے جسموں میں
گُلِ تازہ کے بہروپ میں
کن زخموں سے دلگیر ہے، آشفتہ ہے!

رات میں خواب بھی تھے
خوابوں کی تعبیر بھی تھی
صبح سے غنچے بہت ڈرتے ہیں!
غنچے خوش تھے کہ یہ پھول
ہو بہو اُن کا خد و خال لئے
اُن کا رنگ، ان کی طلب،
اُن کے پر و بال لئے
اُن کے خاموش تبسم ہی کی پنہائی میں ـــ
کیا خبر تھی اُنہیں وہ کیسے سمندر سے
ہوئے ہیں خالی!

جیسے اک ٹوٹے ہوئے دانت سے
یہ ساری چٹانیں اُٹھیں
جیسے اک بھولے ہوئے قہقہے سے
یہ سارے ستارے اُبھرے
جیسے اک دانۂ انگور سے
افسانوں کا سیلاب اُٹھا
جیسے اِک بوسے کے منشور سے
دریا جاگے
اور اک درد کی فریاد سے
انساں پھیلے

اُنہیں [اُن غنچوں کو امید تھی
وہ پھول بھی اُن کے مانند
ان کی خود فہمی کی جویائی سے
پیدا ہوں گے
اُن کے اُس وعدہ مبرم ہی کا
ایفا ہوں گے !

پھول جو اپنے ہی وہموں کے تکبّر کے سوا
کچھ بھی نہیں
اُن کی [اُن غنچوں کی]
دلگیر صدا سنتے ہیں،
ہنس دیتے ہیں !

ن ۔ م ۔ راشد

میں

میں وہ اقلیم کہ محروم چلی آتی ہے
آج تک دشت نوردوں سے جہاں گردوں سے
سالہا سال میں گر ہم نے رسائی پائی
کسی شے تک تو فقط اس کے نواحی دیکھے
اس کے پوشیدہ مناظر کے حواشی دیکھے
یا کوئی سلسلۂ عکس رواں تھا اس کا
ایک روئے گذراں تھا اس کا

کوہِ احساس پر آلام کے اشجار بلند
جن میں محرومیٔ دیرینہ سے شادابی ہے
برگ و باران کا وہ پامال امیدیں جن سے
پریٔ افشاں کی طرح خواہشیں آویزاں تھیں
کبھی ارمانوں کے آوارہ سراسیمہ طیور
کسی نادیدہ شکاری کی صدا سے ڈر کر
ان کی شاخوں میں اماں پاتے ہیں سستاتے ہیں

اور پھر شوق کے صحراؤں کو اُڑ جاتے ہیں
شوق کے گرم بیاباں کہ ہیں بے آب و گیاہ
ولولے جن میں بگولوں کی طرح گھومتے ہیں
اونگھتے ذرّوں کے تپتے ہوئے لب چومتے ہیں

دور اس وادی سے اک منزلِ بے نام بھی ہے
کروٹیں لیتے ہیں جس میں انہی صحراؤں کے خواب
اُن کہستانوں کی ردحیں ـــــــــ سر دور و بستہ ہیں
اور یہیں نقش ہیں آوارہ پرندوں کے جہاں
خواہشوں اور امیدوں کے جنین
اور بگولوں کے ہیولے
کسی نقاش کی حسرت میں ملول
میں وہ اقلیم ہے محروم چلی آتی ہے
آج تک دشت نوردوں سے جہانگردوں سے
کون اس دشت گریزاں کی خبر لاتا ہے!

(نیو یارک ــ ۱۳ فروری ۱۹۵۵ء)

ن ۔م ۔ راشد

مسز سالامانکا

خدا حشر میں ہو مددگار میرا
کہ دیکھی ہیں میں نے مسز سالامانکا کی آنکھیں
مسز سالامانکا کی آنکھیں
کہ جن کے افق ہیں جنوبی سمندر کی نیلی رسائی سے آگے
جنوبی سمندر کی نیلی رسائی
کہ جس کے جزیرے ہجوم سحر سے درخشاں
درخشاں جزیروں میں زرتاب و عناب و قرمز پرندوں کی جولانگہیں
ایسے پھیلی ہوئی جیسے جنّت کے داماں
پرندے ازل اور ابد کے مہ و سال میں بال افشاں!

خدا حشر میں ہو مددگار میرا
کہ میں نے لئے ہیں مسز سالامانکا کے ہونٹوں کے بوسے
وہ بوسے کہ جن کی حلاوت کے چشمے
شمالی زمینوں کے زرتاب و عناب و قرمز درختوں
کے مدہوش باغوں سے آگے
جہاں زندگی کے رسیدہ شگوفوں کے سینوں

سے خوابوں کے رم دیدہ زنبور لیتے ہیں رس اور پیتے ہیں وہ
کہ جس کے نشے کی جلا سے
زمانوں کی نادیدہ محراب کے دو کناروں کے نیچے
ہیں یکبارگی گونج اٹھتے خلا و ملا کے جلاجل
جلاجل کے نغمے بہم ایسے پیوست ہوتے ہیں جیسے
مسز سالا مانکا کے لب میکے لب سے !

خدا حشر میں ہو مددگار میرا
کہ دیکھا ہے میں نے
مسز سالا مانکا کو بستر میں شب بھر برہنہ
وہ گردن وہ باہیں وہ رانیں وہ پستاں
کہ جن میں جنوبی سمندر کی لہروں کے طوفاں
شمالی درختوں کے باغوں کے پھولوں کی خوشبو
جہاں دم بدم عطر و طوفاں بہم اور گریزاں
مسز سالا مانکا کا جسمِ برہنہ
افق تا افق جیسے انگور کی بیل جس کی
غذا آسمانوں کا نور اور حاصل
وہ لذت کہ جس کا نہیں کوئی پایاں
خدا کے سوا کون ہے پاک داماں !

نیویارک ـ ۲۹ ر اگست ۱۹۵۵ء

ن ۔ م ۔ راشد

اے وطن اے جان

اے وطن، اے جان
تیری انگبیں بھی اور خاکستر بھی میں
میں نے یہ سیکھا ریاضی سے ادب بہتر بھی ہے برتر بھی ہے
خاک چھانی میں نے دانش گاہ کی
اور دانش گاہ میں بے دست و پا درویش حُسن و فہم کے جویا ملے
جن کو تھی میری طرح ہر دستگیری کی طلب
دستگیری کی تمنّا سالہا جاری رہی ۔

لیکن اپنے علم و دانش کا ثمر اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا
سر نتیجی نقلی خدا تھے خیر و قوت کا نشاں
اور انساں، اہلِ دل انساں شریر و ناتواں

اے وطن ترکے میں پائے تو نے وہ خانہ بدوش
جن کو تھی کہنہ سرابوں کی تلاش
اور خود ذہنوں میں اُن کے تھے سراب
جن سے پسپائی کی ہمت بھی کبھی ان میں نہ تھی

اے وطن کچھ اہلِ دیں نے اور کچھ انساں پرستوں نے تجھے انشا کیا

عالمِ سکرات سے پیدا کیا
تاکہ تیرے دم سے لوٹ آئے جہاں میں عفتِ انساں کا دور !
دشمن اُس خواہش پہ خندہ زن رہے اور دوست اس پر بدگماں
اے وطن اے جان تو نے دوست اور دشمن کا دل توڑا نہیں

ہم ریاضی اور ادب کو بھول کر
سیم و زر کی آز کے ریلے میں یوں بہتے رہے
جیسے ان بپھری ہوئی امواج کا ساحل نہ ہو
اُس یقیں کا اُس عمل کا اُس محبت کا یہی حاصل تھا کیا ؟

اے وطن، اے جان ہر اک پل پہ تو استادہ ہے
بن گیا تیری گذرگاہ اک نیا دورِ عبور
یوں تو ہے ہر دورِ نو بھی ایک فرسودہ سوال
حرف اور معنی کا جال !
آج لیکن اے وطن، اے جاں تجھے
اور بھی پہلے سے بڑھ کر حرف و معنی کے نئے آہنگ کی ہے جستجو
پھر ریاضی اور ادب کے ربطِ باہم کی طلب ہے روبرو !

کراچی - ۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء

ن ۔ م ۔ راشد

تصوّف

ہم تصوف کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طول المناک کے پروردہ ہیں،
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی !

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں
تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی دن رات کی پاکوبی کا حاصل پایا

ہم تصوّف کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا

ن ۔ م ۔ راشد

اک زمزمے کا ہاتھ

اُبھرا تھا جو آواز کے نابود سے
اک زمزمے کا ہاتھ
اُس ہاتھ کی جھنکار
نئے شہروں کا، تہذیبوں کا
الہام بنے گی!
وہ ہاتھ نہ تھا دھات کے اک معبد کہنہ
سے چُرایا ہوا، تاریخ میں لتھڑا ہوا
اک ہاتھ
وہ ہاتھ خداوند ستمگر کا نہیں تھا
وہ ہاتھ گداپیشہ پیمبر کا نہیں تھا

اس ہاتھ میں [تم دیکھتے ہو]
شمع کی لرزش ہے، جو کہتی ہے کہ:
"آؤ،
شاہراہ پہ بکھرے ہوئے اوراق اُٹھاؤ

اس ہاتھ سے لکھو!"
کہتی ہے کہ: "آؤ،
ہم تم کو نئے زینوں کے،
آئینوں کے، باغوں کے،
چراغوں کے، محلوں کے، ستونوں کے
نئے خواب دکھائیں
وہ پھول جو صحراؤں میں شبنم سے جُدا
[خود سے جدا]
ہانپتے ہیں، ان کے
نئے صحنوں میں انبار لگائیں،
اُلجھے ہوئے لمحات جو انکار
کی دیواروں سے آویختہ ہیں،
اُن سے نئے ہار بنائیں،
سینوں میں اُتر جائیں،
پھر افسردہ تمنائیں جلائیں"
کہتی ہے کہ:
"وہ وقت کی روٹی کا سہارا ہے یہی ہاتھ
جینے کا اشارہ ہے یہی ہاتھ
اس ہاتھ سے پھر جام اُٹھائیں
پھر کھولیں کسی صبح کی کرنوں کے دریچے،

اس ہاتھ سے آتی ہوئی خوشبوؤں کو
آداب بجا لائیں !

کہتی ہے کہ :

" افسوس کی دہلیز پہ
اک عشقِ کہن سال پڑا ہے
اس عشق کے سوکھے ہوئے چہرے
پہ ڈھلکتے ہوئے آنسو
اس ہاتھ سے پونچھیں
یہ ہاتھ ہے وہ ہاتھ
جو سورج سے گرا ہے،
ہم سامنے اس کے
جھک جائیں دعا میں
کہ یہی زندگی و مرگ کی ہر دھوپ میں
ہر چھاؤں میں
الفاظ و معانی کے نئے وصل
کا پیغام بنے گا
ہر بوسے کا الہام بنے گا !"

ن ۔ م ۔ راشد

آگ اور حنا

کیسے بکھری پھول نیند
کیسے شانوں پہ گرا اک چاند گیت،
جس سے میں ظاہر ہوا ۔
چاند گیت !
اُن گہری ندیوں کے فرازوں کی طرف
لے چل، جہاں
آگ کے پہلو میں اُگتی ہے حنا،
اُن درختوں کی طرف لے چل مجھے
جن کی جانب لوٹ آئے،
راہ سے بھٹکے ہوئے زنبور
چھتوں کی طرف،
جن سے کرنا ہے مجھے سرگوشیاں !
مجھ کو لے چل کشت زاروں کے
خزاں کجلائے چہروں کی طرف
جن پہ ماتم کی عنبریں کرنیں جھلک اُٹھی ہیں ۔
گیت !

عشق، جیسے روشنائی کا کوئی دھبہ تھا
پیراہن پہ ناگاہاں گرا

میں نے اُس بھری جوانی میں
وہ موسیقی کی سرشاری سُنی
میں نے خوشبوؤں کی پُرباری سُنی
میں نے بازاروں میں گھبرائے ہجوموں کا
وہی نغمہ، وہی شیون سُنا
جو ہر اک زخمی سے کہتا ہے کہ: "آ
تیرا مزار اب میں ہی ہوں،
میں وہ مطلع ہوں جو اُجلا ہی سہی
نارسا بھی ہے،
میں وہ تصویرِ خداوندی ہوں، دھندلائی ہوئی
میں وہ دُنیا ہوں کہ جس کے لب نہیں!"

لیکن اپنے زرد آج اور سُرخ کل کے درمیاں
تنگ دورا ہے پہ اک لمحہ بھی تھا
نارنج رنگ!
ہاں، اُسی لمحے میں
کتنے راہ سے بھٹکے پرندے
ذہن کے بُرجوں پہ آ بیٹھے کہ: "ہم ــــ
ہم میں کھو جا! ہم تجھے لے جائیں گے
اَب اُس حنا تک
اُگ رہی ہے، آگ کے مسموم پیمانوں کے پاس
اُن سے رس لیتی ہوئی!"

ن ۔ م ۔ راشد

برزخ

شاعر

اے مری رُوح تجھے
اب یہ برزخ کے شب و روز کہاں راس آئیں
عشق بپھرا ہوا دریا ہے، ہوس خاک سیاہ
دست و بازو نہ سفینہ کہ یہ دریا ہو عبور
اور اس خاک سیاہ پر تو نشان کفِ پا تک بھی نہیں
اُجڑے بے برگ درختوں سے فقط کاسۂ سر آویزاں
کسی سفاک تباہی کی المناک کہانی بن کر!
اے مری روح، جدائی سے حزیں روح مری
تجھے برزخ کے شب و روز کہاں راس آئیں؟

روح

میرا ماویٰ نہ جہنم مرا ملجا نہ بہشت
برزخ اُن دونوں پہ اک خندۂ تضحیک تو ہے۔
ایک برزخ ہے جہاں جور و ستم، جود و کرم کچھ بھی نہیں۔
اس میں وہ نفس کی صرصر بھی نہیں
جسم کے طوفاں بھی نہیں
مبتلا جن میں ہم انسان سدا رہتے ہیں
ہم سیہ بخت زمیں پر ہوں، فلک پر ہوں کہیں
ایک برزخ ہے جہاں مخمل و دیبا کی سی آسودگی ہے
خواب سرما کی سی آسودگی ہے

نیو یارک — ۱۶ جون ۱۹۵۵ء

ن ۔ م ۔ راشد

بے چارگی

میں دیوارِ جہنم کے تلے
ہر دوپہر، مفرورِ طالب علم کے مانند
آکر بیٹھتا ہوں اور دزدیدہ تماشا
اس کی پُراسرار و شوق انگیز جلوت کا
کسی رخنے سے کرتا ہوں!

معرّی جام خوں در دست، لرزاں
اور متنبّی کسی بے آب ریگستاں
میں تشنہ لب سراسیمہ
یزید اک قلّۂ تنہا پہ اپنی آگ میں سوزاں
ابوجہل اژدہا بن کر
خجالت کے شجر کی شاخ پر غلطاں
بہار اللہ کے جسمِ ناتواں کا ہر
رواں اک نشترِ خنداں
زلیخا، ایک چہرۂ نور و رنگ آرا
تے پا بستہ

وہی پیہم رواں، گرداں
ژدال، حلاج، سرمد
جری انسان کی طرح ژولیدہ مُو، عریاں
مگر رقصاں
ستالن، مارکس، لینن روئے آسودہ
مگر نارس تمناؤں کے سوز و کرب سے شمع تہ داماں
یہ سب منظور ہے یارب
کہ اس میں ہے وہ ہاؤ ہو، وہ ہنگامہ وہ سیمابی
کہ پائی جس سے ایسی سیمیائی سورتوں نے
روح خلاقی کی بے تابی
مگر میرے خدا، میرے محمدؐ کے خدا مجھ سے
غلام احمد کی برفانی نگاہوں کی
یہ دلسوزی سے محرومی
یہ بے نوری یہ سنگینی
بس اب دیکھی نہیں جاتی
میں بھی غلام احمد کی یہ نامردی دیکھی نہیں جاتی؟

نیویارک — ۱۰ دسمبر ۱۹۵۳ء

ن ۔ م ۔ راشد

رات عفریت سہی

رات عفریت سہی،
چار سو چھائے ہوئے موئے پریشاں جس کے
خون آلودہ نگاہ ولب و دنداں جس کے
ناخن تیز ہیں، سوہانِ دل و جاں جس کے

رات عفریت سہی،
شکر للہ کہ تابندہ ہے مہتاب ابھی
چند میناؤں میں باقی ہے مئے ناب ابھی
اور بے خواب مرے ساتھ ہیں احباب ابھی

رات عفریت سہی،
اسی عفریت نے سو بار ہزیمت پائی
اس کی بیداد سے انساں نے راحت پائی
جلوۂ صبح طربناک کی دولت پائی

رات عفریت سہی،
آؤ احباب کہ پھر جشنِ سحر تازہ کریں
پھر تمناؤں کے عارض پہ نیا غازہ کریں
ابنِ آدم کا بلند آج پھر آوازہ کریں

۳ فروری ۱۹۵۲ء

ن۔م۔ راشد

غزل

زہرِ غم کی نگہِ دوست بھی تریاک نہیں
جا، ترے درد کا درماں، دلِ صد چاک نہیں

اُف تعیّنات! ہمیں بھی ہوسِ راہگزار
جن کا اپنا کوئی ثانی تہِ افلاک نہیں

بجز صہبا کے شناور تو بہت ملتے ہیں
اشکِ خوں کا مگر اے دل کوئی پیراک نہیں

ساغرِ مے نہ سہی، دُردِ تہِ جام قبول
خاک جو ہم نفسِ بادہ ہے وہ خاک نہیں

یہ نصیبہ کہ ہم آزاد ہیں اے طرۂ یار
اب گرہ میں تیری شاید کوئی پیچاک نہیں

ولے گر قافلۂ شوق یہیں رک جائے
منزلِ رہرواں بجز ادراک نہیں!

آفتاب آج ہو کس رخ کے داماں سے طلوع
جب ستارہ کوئی موجود سرِ تاک نہیں

مجھ کو بخشا گیا وہ شعلۂ ازل میں راشد
باد و بارانِ حوادث سے جو نمناک نہیں

(امروز۔ لاہور۔ ۹ر جون ۱۹۴۹ء)

غزل

فلک سے گر کے بھی ٹوٹا نہ شیشۂ بے بینی
کہ راس آ ہی گیا اہتمامِ خود بینی

رہِ فرار سے اُس تک کوئی پہنچ نہ سکا
کہ بے دلی سے تھا برتر مقامِ بے دینی

ابھی تو تیشہ بکف ہے اور کوہکن بھی ہیں
عبث ہے حسن کا یہ ادعائے کوہ تمکینی!

وہ ایک جرعہ جو تیری نگاہ نے بخشا
تمام زہرِ ہلاہل، تمام شیرینی

رہِ تلاش میں گذری تمام عمر مگر
ملا نہ کچھ بھی ہوس کو بجز خزف چینی

وہ آئے خواب میں یوں بے صدا چلے جیسے
کنارِ کوثر و تسنیم، روحِ گل چینی

ہے سب فسردہ دلوں کی نظر کی نقش گری
رخِ نگار کی یہ آب و تاب و رنگینی

میں شعرِ نو کا خدا ہی سہی مگر راشد
مری غزل بھی ہے ان کے حضور لاطینی

(امروز لاہور ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء)

انتخابِ کلامِ راشد

ڈاکٹر جمیل جالبی
اور
ساقی فاروقی

یہ انتخاب ن۔م۔ راشد کے ان مجموعوں سے کیا گیا ہے:

۱۔ ماورا
۲۔ ایران میں اجنبی
۳۔ لا = انسان
۴۔ گمان کا ممکن

"ماورا" سے

مکافات

رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زُہد سے یارانہ اُستوار مرا
گزر گئی ہے تقدّس میں زندگی میری
دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا
کسی پہ رُوح نمایاں نہ ہو سکی میری
رہا ہے اپنی اُمنگوں پہ اختیار مرا

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو
وہیں دیا ہے شب و روز پیچ و تاب انہیں
زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو
کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
اذیتوں سے بھری ہے ہر ایک بیداری
مہیب رُوح ستاں ہے ہر ایک خواب مرا

اُلجھ رہی ہیں نوائیں مرے سرودوں کی
فشارِ ضبط سے بے تاب ہے رباب مرا
مگر یہ ضبط مرے قہقہوں کا دشمن تھا
پیامِ مرگِ جوانی تھا اجتناب مرا

لو آ گئی ہیں وہ بن کر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جن کا کیا تھا خوں میں نے
لو آ گئے ہیں وہی پیروانِ اہرمن
کیا تھا جن کو سیاست سے سرنگوں میں نے
کبھی نہ جان پہ دیکھا تھا یہ عذابِ الیم
کبھی نہیں لیے مرے بجنتِ واژگوں میں نے
مگر یہ جتنی اذیت بھی دیں مجھے کم ہے
کیا ہے رُوح کو اپنی بہت زبوں میں نے
اسے نہ ہونے دیا میں نے ہمنوائے شباب
نہ اس پہ چلنے دیا شوق کا فسوں میں نے
اے کاش چھُپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے

جرأتِ پرواز

بجھ گئی شمعِ ضیا پوشِ جوانی میری!
آج تک کی ہے کئی بار "محبت" میں نے
اشکوں اور آہوں سے لبریز ہیں ارمان کے
ہو گئی ختم کہانی میری!
مٹ گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی
خوفِ ناکامی و رسوائی سے
حسن کے شیوۂ خود رائی سے
دلِ بے چارہ کی مجبوری و تنہائی سے!
میرے سینے ہی میں پنہاں ہیں آہیں میری
کر سکیں روح کو عریاں نہ نگاہیں میری!
ایک بار اور محبت کروں
سعیِ ناکام سہی
اور اک زہر بھرا جام سہی
میرا یا میری تمناؤں کا انجام سہی
ایک سودا ہی سہی، آرزوئے خام سہی
ایک بار اور محبت کروں؟
ایک انسان سے الفت کروں؟
میرے ترکش میں ہے اک تیر ابھی
مجھ کو ہے جرأتِ تدبیر ابھی

برسرِ جنگ ہے تقدیر ابھی
اور تقدیر ہے پھیلانے کو اک دام ابھی!

مجھ کو اک بار وہی کوہ کنی کرنے دو
اور وہی "کاہ برآوردن" بھی —؟
یا تو جی اٹھوں گا اس جرأتِ پرواز سے میں
اور کر دے گی وفا زندۂ جاوید مجھے
جو بتا دے گی رہِ جادۂ امید مجھے
رفعتِ منزلِ ناپید مجھے
یا اتر جاؤں گا میں یاس کے ویرانوں میں
اور تباہی کے نہاں خانوں میں
تا کہ ہو جائے مہیا آخر
آخری حدِ تنزل ہی کی اک دید مجھے
جس جگہ تیرگیاں خواب میں ہیں
اور جہاں سوتے ہیں اہرمن بھی
تا کہ ہو جاؤں اسی طرح شناسا آخر
نور کی منزلِ آغاز سے میں
اپنی اس جرأتِ پرواز سے میں

طلسمِ جاوداں

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے،
اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے۔
تیری آنکھوں میں ہے وہ سحرِ عظیم
جو کئی صدیوں سے پیہم زندہ ہے
انتہائے وقت تک پائندہ ہے!
دیکھتی ہے جب کبھی آنکھیں اُٹھا کر تو مجھے
قافلے بن کر گزرتے ہیں نگہ کے سامنے
مصر و ہند و نجد و ایراں کے اساطیرِ قدیم
کوئی شاہنشاہ تاج و تخت لٹواتا ہوا
دشت و صحرا میں کوئی شہزادہ آوارہ کہیں
سر کوئی جانبازِ کہساروں سے ٹکراتا ہوا
اپنی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہوا
”..............“
قافلے بن کر گزر جاتے ہیں سب
قصہ ہائے مصر و ہندوستان و ایران و عرب!

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے،
آج میں ہوں چند لمحوں کے لئے تیرے قریب،
سارے انسانوں سے بڑھ کر خوش نصیب!
چند لمحوں کے لئے آزاد ہوں
تیرے دل سے اخذِ نور و نغمہ کرنے کے لئے
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھرنے کے لئے
تیرے پیکر میں جو روحِ زیست ہے شعلہ فشاں
وہ دھڑکتی ہے مقام و وقت کی راہوں سے دور
بیگانۂ مرگ و خزاں!
ایک دن جب تیرا پیکر خاک میں مل جائے گا
زندہ تابندہ رہے گی اس کی گرمی اس کا نور
اپنے عہدِ رفتہ کے جاں سوز نغمے گائے گی
اور انسانوں کو دیوانہ بناتی جائے گی

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت
اب رہنے دے!
وقت کے اِس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا
پھیل کر خود بیکراں ہو جائے گا
مطمئن باتوں سے ہو سکتا ہے کون؟
دیکھ اس جذبات کے نشے کو دیکھ
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو گئی!
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے
مجھ کو اپنی رُوح کی تکمیل کر لینے بھی دے!

گُناہ

آج پھر آ ہی گیا
آج پھر رُوح پہ وہ چھا ہی گیا
دی مرے گھر پہ شکست آ کے مجھے!
ہوش آیا تو میں دہلیز پہ اُفتادہ تھا
خاک آلودہ افسردہ غمگین و نزار
پارہ پارہ تھے مری رُوح کے تار
آج وہ آ ہی گیا

روزنِ در سے لرزتے ہوئے دیکھا میں
خرم و شاد سرِ راہ اُسے جاتے ہوئے
سالہا سال سے مسدود تھا یارانہ مرا
اپنے ہی بادہ سے لبریز تھا پیمانہ مرا
اُس کے لَوٹ آنے کا امکان نہ تھا
اُس کے ملنے کا کبھی ارمان نہ تھا
پھر بھی وہ آ ہی گیا
کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی مرے خداوند کی تھی!

اتفاقات

آج، اس ساعتِ دزدیدہ ونایاب میں بھی،
جسم ہے خواب سے لذت کشِ خمیازہ ترا
تیرے مژگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول
جس سے دھل جانے کو غازہ ترا
زندگی تیرے لئے رس بھرے خوابوں کا ہجوم
زندگی میرے لئے کاوشِ بیداری ہے،
اتفاقات کو دیکھ
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ
توڑ دے وہم کے جال
چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال،
خوفِ موہوم تری رُوح پہ کیا طاری ہے!
اتنا بے صرفہ نہیں تیرا جمال
اس زمستاں کی جنوں خیز حسیں رات کو دیکھ!
آج، اس ساعتِ دزدیدہ ونایاب میں بھی
تِشنگی رُوح کی آسودہ نہ ہو
جب ترا جسم جوانی میں ہے نیسانِ بہار
رنگ ونکہت کا فشار!

پھول ہیں، گھاس ہے، اشجار ہیں، دیواریں ہیں
اور کچھ سائے کہ ہیں مختصر وتیرہ وتار،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟
دیکھ پتوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اوّلیں بادہ گساری میں نئے تازہ ونایاب،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟

کہکشاں اپنی تمناؤں کا ہے راہگزار
کاش اس راہ پہ مل کر کبھی پرواز کریں،
اک نئی زیست کا در باز کریں!
آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہِ راز کریں!
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں
آ اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں!
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے!

ایک رات

یاد ہے اک رات زیرِ آسمانِ نیلگوں،
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات!
چاندنی کرنوں کا بے پایاں فسوں پھیلا ہوا
سرمدی آہنگ برساتا ہوا ۔۔۔ ہر چار سُو!
اور مرے پہلو میں تُو ۔۔۔!
میرے دل میں یہ خیال آنے لگا ۔۔۔
غم کا بحرِ بےکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطحِ شورانگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اُس کو آہستہ لیے جاتا ہوں میں
دل میں یہ جاں سوز وہم
کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات
تیرے دل میں راز کی اک کائنات

تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
سرخوشِ اظہار تیری ہر نگاہ
تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال
بےبسی کی نیند میں الجھے ہوئے ۔۔۔
تیرا چہرہ آبگوں ہونے کو تھا
دفعتاً، پھر جیسے یاد آجائے اک گم گشتہ بات
تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
میرے انگاروں کو بےتابانہ لینے کے لئے
اپنی نکہت، اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے
غم کے بحرِ بےکراں میں ہو گیا پیدا سکوں
یاد ہے وہ رات زیرِ آسمانِ نیلگوں
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات!

سپاہی

تُو مرے ساتھ کہاں جائے گی ؟
موت کا لمحۂ مایوس نہیں
قوم ابھی نیند میں ہے !
مُصلح قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے ــــ
میں تو اک عام سپاہی ہوں ، مجھے
حکم ہے دور کے منزل کے قدم لینے کا
اور اسی سعیٔ جگر دوز میں جاں دینے کا
تُو مرے ساتھ مری جان، کہاں جائے گی ؟

تُو مرے ساتھ کہاں جائے گی ؟
راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے
دشتِ بے آب و گیاہ
اور کہیں رودِ عمیق
بے کراں تیز و کف آلود عظیم
اُجڑے سُنسان دیار
اور دُشمن کے گرانڈیل جوان
جیسے کُہسار پہ دیودار کے پیڑ
عزّت و عفّت و عصمت کے غنیم

ہر طرف خون کے سیلاب رواں ـــ
اِک سپاہی کھیلتے خون کے نظّاروں میں
جسم اور روح کی پابندگی ہے
تو مگر تاب کہاں لائے گی
تُو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

دم بدم بڑھتے چلے جاتے ہیں
سرِ میدان رفیق،
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟
عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمۂ اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پروبال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟
دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگِ آزادی میں کام آنے بھی دے
تُو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

عہدِ وفا

تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!
شمع کے سائے سے دیوار پہ محراب سی ہے
سالہا سال سے بدلا نہیں سائے کا مقام
شمع جلتی ہے تو سائے کو بھی حاصل ہے دوام
سائے کا عہدِ وفا ہے ابدی!
تو مری شمع ہے، میں سایہ ترا
زندہ جب تک ہوں کہ سینے میں ترے روشنی ہے
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

اک پتنگا سرِ دیوار چلا جاتا ہے
خوف سے سہما ہوا خطروں سے گھبرایا ہوا
اور سائے کی لکیروں کو سمجھتا ہے کہ ہیں
سرحدِ مرگ و حیات اُس کے لیے!
ہاں یہی حال مرے دل کی تمناؤں کا ہے
پھر بھی تو عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

ہاں مرا عہدِ وفا ہے ابدی،
زندگی اُن کیلئے ریت نہیں، دھوپ نہیں
ریت پر دھوپ میں گر لیٹتے ہیں آ کے نہنگ
قعرِ دریا ہی سے وابستہ ہے پیماں ان کا
ان کو لے آتا ہے ساحل پہ تنوّع کا خمار
اور پھر ریت میں اک لذّت آسودگی ہے!
میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشی و عشرت کیلئے
اور تری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذّت کے لیے
میرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

شاعرِ درماندہ

زندگی تیرے لیے بسترِ سنجاب و سمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل،

میں ہوں درماندہ و بیچارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش!

پارۂ نانِ جویں کے لیے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول!

تجھے اس شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی
مجھ سے جس دن سے ستارہ ترا وابستہ ہوا
تجھے بھی تھی کہ اک روز مرا ذہنِ رسا
اور مرے علم و ہنر
بحر و بر سے تری زینت کو گہر لائیں گے!
میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب

کیوں دعائیں تری بیکار نہ جائیں
تیرے راتوں کے سجود اور نیاز
اس کا باعث مرا الحاد بھی ہے!

اے مری شمعِ شبستانِ وفا،
بھول جا میرے لیے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے!
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے، تو سراپردۂ نسیاں میں ہے
تو "مسرت" ہے مری، تو مری "بیداری" ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے!

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے!
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ـــ اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں!
اُن میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دُلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہ سوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لَوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انھیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے!

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں!
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں،
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں

اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری اُن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

بیکراں رات کے سناٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعصاب مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے، چیختی ہے!
بے کراں رات کے سناٹے میں!

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں!

ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبکبار کرے!
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں!

یہ مرے عمل میں خیال آتا ہے
ترے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں!

اِنتقام

اُس کا چہرہ، اُس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اِک شبستاں یاد ہے
اِک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بُت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے!
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
اُن بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
اُن فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بُنیادِ فرنگ!

اُس کا چہرہ اُس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم،
میرے "ہونٹوں" نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!

شرابی

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں!
شکر کر اے جانِ من
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں،
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ؟
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کی بجائے
بیکسوں اور ناتوانوں کا لہو؟
شکر کر اے جانِ من
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں!

اجنبی عورت

ایشیا کے دُور اُفتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں!
کاش اِک دیوارِ ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن یہ لالہ زار،
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارتگر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں!

کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہرِ خند
یہ گزرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بیباک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق، ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے،
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری ــــ
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوارا
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کُود جاؤں ساتویں منزل سے آج!
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ[ٹ] کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو،
بُوئے مے میں بُوئے خوں اُلجھی ہوئی!
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری!
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے دبام کو!
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

ٹ مرادِ زندگی

داشتہ

میں ترے خندۂ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے کوئی الم زہرہ گداز
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا
آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے
اشکوں کے سحاب
اس پہ حیرت تو نہیں تھی لیکن
کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ
پرندے کی طرح

ایک مبہم سا خیال
دفعتاً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن میری باہوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور
یہ ترے گریۂ غمناک سے میں جان گیا
تجھ سے وابستگیٔ شوق بھی ہے
ہو چلی سینے میں بیدار وہ دلسوزی بھی

مجھ سے مہجورِ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل
نفسِ خود میں تسلی کے لئے
وہ سہارا بھی تجھے دینے پہ آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے
کوئی اندیشہ اگر ہے تو یہی
ترے ان اشکوں میں اک لمحے کی نومیدی
کا پرتو ہو کہیں
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک دریچہ بن جائے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لئیم
جسم کی مزدِ شبانہ دے کر
بن کے رازق تری تذلیل کئے جاتا ہے
میں بھی باہوں کا سہارا دے کر ——
تری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں

پہلی کرن

کوئی مجھ کو دورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو،
کوئی یہ سمجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستیِ رائیگاں سے؟
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی!
میں اُس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے نانِ شبینہ نہیں ہے
اور اس میں بھی یہ قوم دل شاد ہے شوکتِ باستاں سے
اور اب بھی ہے اُمیدِ فردا کسی ساحرِ بے نشاں سے!
مری جاں، شب و روز کی اس مشقت سے تنگ آ گیا ہوں
میں اس خشت کوبی سے اُکتا گیا ہوں
کہاں ہیں وہ دُنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنھوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا؟
تری چھاتیوں کی جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جاں
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ہے ترے سینۂ مہرباں سے
جو واقف نہیں ترے دردِ نہاں سے؟
اسے بھی تو ذلت کی پایندگی کے لئے آلۂ کار بننا پڑے گا
بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج بے دست و پا ہیں
اس آیندہ نسلوں کی زنجیرِ پا کو تو ہم توڑ ڈالیں!

مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی
یہ شہنائیاں سُن رہی ہو؟
یہ شاید کسی نے مسرت کی پہلی کرن دیکھ پائی!
نہیں، اس دریچے کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے!
یہ انساں کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سُن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتوِ اوّلیں بھی
اُٹھو اور ہم بھی زمانے کی تازہ ولادت کے اس جشن میں مل کے
دُھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں!

"ایران میں اجنبی" سے

ہمہ اوست

خیابان سعدی میں
روسی کتابوں کی دکان پر ہم کھڑے تھے
مجھے روس کے جدید صنعت گروں کے
نئے کارناموں کی اک عمر سے تشنگی تھی!
مجھے روسیوں کے "سیاسی ہمہ اوست" سے
کوئی رغبت نہیں ہے
مگر ذرّے ذرّے میں
انساں کے جوہر کی تابندگی دیکھنے کی تمنّا
ہمیشہ رہی ہے!
اور اس شام تو مدرسہ کی عروسی تھی،
اُس شوخ دیوانی لڑکی کی خاطر
مجھے ایک نازک سی سوغات کی جستجو تھی
وہ میرا نیا دوست خالد
ذرا دُور، تختے کے پیچھے کھڑی
اک تنومند لیکن فسوں کار،
قفقاز کی رہنے والی حسینہ سے شیر و شکر تھا!
یہ بھوکا مسافر
جو دستے کے ساتھ
ایک خیمے میں، اک دُور افتادہ صحرا میں
مدّت سے عزلت گزیں تھا،
بڑی التجاؤں سے
اس حورِ قفقاز سے کہہ رہا تھا،
"نجانے کہاں سے ملا ہے
تمہاری زباں کو یہ شہد
اور لہجے کو مستی!
میں کیسے بتاؤں
میں کس درجہ دلدادہ ہوں رُوسیوں کا
مجھے اشتراکی تمدّن سے کتنی محبّت ہے
کیسے بتاؤں!
یہ ممکن ہے تم مجھ کو روسی سکھا دو؟

کہ رُوسی ادیبوں کی سرچشمہ گاہوں کو میں
دیکھنا چاہتا ہوں!"

وہ پروردۂ عشوۂ بازی
کنکھیوں سے یوں دیکھتی تھی
کہ جیسے وہ اُن سرنگوں آرزوؤں کو بھانپتی ہو،
جو کرتی ہیں اکثر یونہی رہ شناسی
کبھی دوستی کی تمنا،
کبھی علم کی پیاس بن کر!
وہ کولھے ہلاتی تھی، ہنستی تھی
اُس سوچی سمجھی حسابی لگاوٹ سے،
جیسے وہ ان خفیہ سرچشمہ گاہوں کے ہر راز کو
جانتی ہو
وہ تختے کے پیچھے کھڑی قہقہے مارتی لوٹتی تھی!

کہا میں نے خالد سے،
"بہر دیجئے!
اس ولایت میں ضرب المثل ہے
"کہ اونٹوں کی سوداگری کی لگن ہو
تو گھر اُن کے قابل بناؤ ——
اور اس شہر میں یوں تو اُستانیاں ان گنت ہیں

مگر اس کی اُجرت بھلا تم کہاں دے سکو گے!"
وہ پھر مضطرب ہو کے بے اختیاری سے ہنسنے
لگی تھی۔

وہ بولی:
"یہ سچ ہے،
کہ اُجرت تو اک شام ہی بھر کم نہ ہوگی
مگر نوجوانوں کا بھروسہ ہی کیا ہے،
بھلا تم کہاں باز آؤ گے
آخر زباں سیکھنے کے بہانے
خیانت کرو گے!"
وہ ہنستی ہوئی
اک نئے مشتری کی طرف ملتفت ہو گئی تھی!
تو خالد نے دیکھا
کہ رومان تو خاک میں مل چکا ہے!
اُسے کھینچ کر جب میں بازار میں لا رہا تھا،
لگاتار کہنے لگا وہ مقولوں میں باتیں
"زباں سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھو
جہاں بھر میں روسی ادب کا نہیں
کوئی ثانی
وہ قفقاز کی حور مزدور عورت!
جو دُنیا کے مزدور سب ایک ہو جائیں

آغاز ہوا اِک نیا دورِ شادمانی!"

مرے دوستوں میں بہت اشتراکی ہیں،
جو ہر محبت میں مایوس ہو کر
یونہی اِک نئے دورِ شادمانی کی حسرت میں
کرتے ہیں دلجوئی اِک دوسرے کی
اور اب ایسی باتوں پہ میں
زیرِ لب بھی کبھی مسکراتا نہیں ہوں!
اور اس شامِ جشنِ عروسی میں
حسن و مے، رقص و نغمے کے طوفان بہتے رہے تھے
فرنگی شرابیں تو عنقا تھیں
لیکن مئے نابِ قزوین و خلّارِ شیراز کے دور
پیہم سے

رنگین لباسوں سے
خوشبو کی بے باک لہروں سے
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
مزامیر کے زیر و بم سے
وہ ہنگامہ برپا تھا،
محسوس ہوتا تھا
طہران کی آخری شب یہی ہے!
اچانک کہا مرشدہ نے:

"تمہارا وہ ساتھی کہاں ہے؟
ابھی ایک صوفے پہ دیکھا تھا میں نے
اسے سر بزانو!"
تو ہم کچھ پریشان سے ہو گئے
اور کمرہ بکمرہ اسے ڈھونڈنے مل کے نکلے!
تو اک گوشۂ نیم روشن میں
وہ اشتراکی زمیں پر پڑا تھا
اسے ہم بلایا کیے اور جھنجھوڑا کیے
وہ تو ساکت تھا جامد تھا
روسی ادیبوں کی سرچشمہ گاہوں کی اس
کو خبر ہو گئی تھی!

مارِ سیاہ

سرِ شام ہم یاسمن سے ملے تھے
وہ بُت کی طرح بے زباں اور افسردہ،
اِک کہنہ و خستہ گھر میں،
ہمیں لے کے داخل ہوئی تھی!
کسی پیرہ زن نے ہمارا وہاں
شمعِ لرزاں لیے خیر مقدم کیا تھا
مئے کم بہا اور خیّام سے
میری اور دوستوں کی مدارت کی تھی!
مگر یاسمن کی نگاہیں جُھکی تھیں
وہ بالیں پہ زُلفِ سیہ میں
سپیدے کے داغوں کو مجھ سے چُھپاتی رہی تھی!
وہ پھر ہم سے مہمانخانے میں ملتی رہی تھی،
شکر اور قہوے کے ظروفِ ارزاں
جو بازار میں انتہائی گراں تھے
وہ ہر بار ہم سے بصد معذرت لے کے جاتی
رہی تھی!
خیاباں میں وہ مُسکرا کر گزرتی
تماشا گھروں اور تفریح گاہوں کی خلوت
کو جلوت بناتی رہی تھی
ہم اِس لُطفِ آساں ربودہ پہ نازاں رہے تھے!

مگر کل سحر وہ دریچے کے نیچے
جہاں سیب کے اک شجر کے گلابی شگوفے
ابھی کِھل رہے ہیں
رُکی اور کہنے لگی
"آج کے بعد تم یاسمن کو نہیں پا سکو گے
کہ مارِ سیہ بَن کے اِک اجنبی نے اُسے ڈس لیا ہے!"
میں خود اجنبی ہوں
مگر سُن کے یوں دم بخود ہو گیا تھا
کہ جیسے مجھی کو وہ مارِ سیہ ڈس گیا ہو!
میں اُٹھا، خیاباں میں نکلا
اور اک کہنہ مسجد کی دیوار سے لگ کے
آنسو بہاتا رہا ہوں۔

تیل کے سوداگر

بخارا سمرقند اک خالِ ہندو کے بدلے!
بجا ہے، بخارا سمرقند باقی کہاں ہیں
بخارا سمرقند نیندوں میں مدہوش،
اک نیلگوں خامشی کے حجابوں میں مستور
اور رہرووں کے لیے ان کے در بند،
سوئی ہوئی مہ جبینوں کی پلکوں کے مانند
روسی "ہمہ اوست" کے تازیانوں سے معذور
دو مہ جبینیں!

بخارا سمرقند کو بھول جاؤ
اب اپنے درخشندہ شہروں کی
طہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کر لو،
تم اپنے نئے دورِ ہوش و عمل کے دلآویز جشنوں کو
اپنی نئی آرزوؤں کے ان خوبصورت کنایوں کو
محفوظ کر لو!
ان اونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو
ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہباں چڑھا دو،

گھروں میں ہوا کے سوا،
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن،
تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر،
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں
تمہارے گھروں میں،
وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خونِ محفل!

مگر پو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مُردوں کی ق
بساطِ ضیافت کی خاکسترِ سوختہ کے کنار
بہاؤ گے آنسو!

بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو!
کہ گو اب خاکِ ہند کی ارزش نہیں ہے
عذارِ جہاں پر وہ رِستا ہوا گہرا ناسور
افرنگ کی آزِ خونخوار سے بن چکا ہے —
بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو،
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں
سیّال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر،
گرتے ہوئے بام و در،
اور مینار و گنبد،
مگر وقت محراب ہے
اور دشمن اب اس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہوا
اس کے نچلے اُفق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے!
ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے!

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعیں،
انہیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں!

وزیرِ چنیں

...... تو جب سات سو آٹھویں رات آئی
تو کہنے لگی شہرزاد:
"اے جواں بخت
شیراز میں ایک رہتا تھا نائی،
وہ نائی تو تھا ہی۔
مگر اُس کو بخشا تھا قدرت نے،
اِک اور نادر، گراں تر ہنر بھی،
کہ جب بھی،
کسی مردِ دانا کا ذہنِ رسا،
زنگ آلود ہونے کو آتا
تو نائی کو جا کر دکھاتا
کہ نائی دماغوں کا مشہور ماہر تھا،
وہ کاسۂ سر سے اُن کو الگ کر کے،
اُن کی سب آلائشیں پاک کر کے،
پھر اپنی جگہ پر لگانے کے فن میں تھا کامل!
خدا کا یہ کرنا ہوا،

ایک دِن
اُس کی دکان سے
ایران کا اِک وزیرِ کہن سال گزرا
اور اُس نے بھی چاہا
کہ وہ بھی ذرا
اپنے اُلجھے ہوئے ذہن کی
از سرِ نو صفائی کرا لے!

کیا کاسۂ سر کو نائی نے خالی
ابھی وہ اُسے صاف کرنے لگا تھا،
کہ ناگاہ آ کر کہا ایک خواجہ سرا نے
میں بھیجا گیا ہوں جنابِ وزارت پنہ کو بُلانے

اور اُس پر
سراسیمہ ہو کر جو اُٹھا وزیر ایک دم،
رہ گیا پاس دلّاک کے مغز اُس کا

وہ بے مغز سر لے کے دربارِ سلطاں
میں پہنچا
— مگر دوسرے روز اُس نے
جو نائی سے آکر تقاضا کیا
تو وہ کہنے لگا:

"حضور،
کل شب پڑوسی کی بلّی
کسی روزنِ در سے گھس کر
جنابِ وزارت پنہ کے
دماغِ فلک تاز کو کھا گئی ہے!
اب حکمِ سرکار ہو تو،
کسی اور حیوان کا مغز لے کر لگا دوں؟
تو دلّاک نے رکھ دیا،
دانیالِ زمانہ کے سر میں،
کسی بیل کا مغز لے کر!
تو لوگوں نے دیکھا
جنابِ وزارت پنہ اب،
فراست میں
دانش میں
اور کاروبارِ وزارت میں،
پہلے سے بھی چاق و چوبند تر ہو گئے ہیں!"

نیا دَور

ظلمِ رنگ

"یہ میں ہوں!"
"اور یہ میں ہوں!"
یہ دو میں ایک سیمِ نیلگوں کے ساتھ آویزاں
ہیں شرق و غرب کے مانند
لیکن مل نہیں سکتے!
صدائیں رنگ سے ناآشنا
اک تار اُن کے درمیاں حائل!
مگر وہ لمحہ جن کا بخت،
مشرق کے جواں سورج کی تابانی
کبھی اُن نرم و نازک، برف پروردہ حسیں
باہوں کو چھو جائیں،
محبّت کی کہیں گاہوں کو چھو جائیں
یہ ناممکن! یہ ناممکن!
کہ "ظلمِ رنگ" کی دیوار اُن کے درمیاں حائل!
"یہ میں ہوں!"
"اور یہ میں ہوں"
انا کے زخم خوں آلودہ، ہر پرزے میں،
ہر پوشاک میں عُریاں،
یہ زخم ایسے ہیں جو اشکِ ریا سے سِل نہیں سکتے
کسی سوچے ہوئے حرفِ وفا سے سِل نہیں سکتے!

زنجیر

رشتۂ زنجیر میں
ـس نئی جنبش ہویدا ہو چلی
ـنکِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
ـمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی ——
ـدست سے دست و گریباں ہی سہی
ـبھی تو شبنم نہیں ——
ـبھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں ——

ـہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
ـک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
ـحجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
ـوہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
ـتو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کیلئے
ـسالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تار ہائے
ـسیم و زر
ـان کے مردوں کیلئے بھی آج اک سنگین جال
ـہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال!

تسکرے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چارسو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

ایک شہر

یہ ہے نیا، اور سب سے بڑا اور نایاب شہر
یہاں آ کے رکتے ہیں سارے جہاں کے جہاز
یہاں ہفت اقلیم کے ایلچی آ کے گزرانتے ہیں نیاز
یہ نادر برآمد کے لاریب چشموں سے شاداب شہر
یہ گلہائے شبّو کی مہکوں سے محفل کی شمعوں
سے، شب تاب شہر
یہ اک بسترِ خواب شہر
یہ دیبا و سنجاب شہر

یہاں ہیں عوام اپنے فرماں روا کی محبت میں سرشار
طبیعت کی قید و زنجیر و بندِ سلاسل کے ارماں
کے ہاتھوں گرفتار
دیوانہ وار!
یہاں فکر و اظہار کی حرّیت کی وہ دولت
لٹائی گئی
کہ اب سیم و زر اور لعل و گہر کی بجائے
یہ الفاظ و معنی سے
اہلِ قلم کے، خطیبوں کے اچھوتے خزانے ہیں معمور

خیالات کا ہے صنم خانہ نقش گری میں وفور
مغنّی ہے فن کی محبّت میں چُور
سلاخوں کے پیچھے فقط چند شوریدہ سر بے شعور!

مسافت یہاں صدر سے تا بہ نعلین بس
ایک دو گام
یہاں بے زباں اور مہماں ہیں، ایک ہی شہد
کے جام سے شاد کام
اگر ہیں برہنہ عوام تو سب برہنہ
کہ یہ شہر ہے، عدل و انصاف میں
اور مساوات میں
اور اخوت میں
مانندِ حمام!

یہاں تخت و دیہیم ہوں یا کلاہ و گلیم
ہے سب کا وہی ایک ربّ کریم!

انقلابی

"مورخ،" مزاروں کے بستر کا بارِ گراں،
عروس اس کی نارس تمناؤں کے سوز سے
آہ برلب
جدائی کی دہلیز پر، زلف درخاک، نوحہ کناں!
یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غمزدہ سے
کہا: "لاؤ، اب لاؤ، دریوزۂ غمزۂ جاں ستاں!"
تو یہ مضطرب جاں،
یہ ہر تازہ و نو بنو رنگ کی دلربا
تری اس پذیرائی چشم و لب سے
وفا کے سنہرے جزیروں کی شہزادہ ہوتی،
ترے ساتھ منزل بمنزل رواں و دواں!

مگر خواہشیں اشہبِ بادپیما نہیں،
جو ہوں بھی تو کیا
کہ جولانگہ وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں؟
یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی رخِ رواں کو اجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟
جو آنکھوں میں اس وقت آنسو نہ ہوتے،
اسے اپنے ہی زلف و گیسو کے دامِ ازل سے
رہائی تو ملتی
مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیوتا نارہ کا حجرۂ تار
جس کی طرف تو اسے کر رہا تھا اشارے،
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں ہے
جہاں چار سو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں
کے بے انتہا استخواں ایسے بکھرے پڑے ہیں؟
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر فغاں!

سوغات

زندگی ہیزمِ تنورِ شکم ہی تو نہیں
پارۂ نانِ شبینہ کا ستم ہی تو نہیں
ہوسِ دام و درم ہی تو نہیں
سیم و زر کی جو وہ سوغات صبا لائی تھی
ہم سبھی کاہ مگر کاہ ربا ہو نہ سکی
دردمندوں کی غذا ہو نہ سکی
آرزو ہدیۂ اربابِ کرم ہی تو نہیں!

ہم نے مانا کہ ہیں جاروب کشِ قصرِ حرم
کچھ وہ احباب جو خاکسترِ زنداں نہ بنے
شبِ تاریکِ وفا کے مہِ تاباں نہ بنے
کچھ وہ احباب بھی ہیں جن کے لئے
حیلۂ امن ہے خودساختہ خوابوں کا فسوں
کچھ وہ احباب بھی ہیں، جن کے قدم
راہ پیما تو ہے، راہ شناسا نہ ہوئے
غم کے ماروں کا سہارا نہ ہوئے
کچھ وہ مردانِ جنوں پیشہ بھی ہیں جن کے لئے
زندگی غیر کا بخشا ہوا سم ہی تو نہیں
آتشِ دیر و حرم ہی تو نہیں!

طلسمِ ازل

مجھے پھر طلسمِ ازل نے
نئی صبح کے نور میں نیم وا
شرم آگیں دریچے سے جھانکا!

میں اس شہر میں بھی،
جہاں کوئے و برزن میں بکھرے ہوئے
حسن و رقص و مے و نور و نغمہ
اُسی نقشِ صد رنگ کے خط و محراب ہیں، تار و پود ہیں
کہ صدیوں سے جس کے لئے
نوعِ انساں کا دل، کان، آنکھیں
سب آوارۂ جستجو ہیں۔
میں اس شہر میں تھا پریشان و تنہا!

یہاں زندگی ہے اک آہنگ تازہ،
مُسلسل مگر پھر بھی تازہ
یہاں زندگی لمحہ لمحہ، نئے، دمبدم تیز تر
جوشش سے گام زن ہے۔
یہاں وہ سکوں، جس کے گہوارۂ نرم و نازک
میں پلتے ہیں ہم ایشیائی
فقط دُور ہی دُور سے خندہ زن ہے

مگر میں اسی شہر میں تھا پریشان و غمگین و تنہا!

پریشان و غمگین و تنہا
کہ ہم ایشیائی
جو صدیوں سے ہیں خواب تمکیں کے رسیا
یہ کہتے رہے ہیں:
ہمارا لہو زخمِ افرنگ کی مومیائی
ہمارے ہی دم سے جلالِ شہی، فرّہ کبریائی!
پریشان و غمگین و تنہا
کہ ہم تا کجے اپنے اوہامِ کہنہ کے دلبند بن کر
یونہی عافیت کی پُراسرار لذّت کے آغوش سے
زہرِ تقدیر پیتے رہیں گے
ابھی اور کے سال دریوزہ گرِ بن کے جیتے رہیں گے!
اسی سوچ میں تھا کہ مجھ کو
طلسمِ ازل نے نئی صبح کے نور میں نیم وا،
شرمِ آگیں دریچے سے جھانکا
مگر اس طرح، ایک چشمک میں جیسے
ہمالہ و الوند کے سینۂ آہنی سے
محبّت کا اک سیلِ گراں سیل بہنے لگا ہو
اور اس سیل میں سب ازل اور ابد مل گئے ہوں!

سبا ویراں

سلیماں سر بزانو اور سبا ویراں
سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
سبا آلام کا انبارِ بے پایاں!
گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقار زیرِ پر
تو سرمہ در گلو انساں!

سلیماں سر بزانو، ترش رو، غمگیں، پریشاں مو
جہانگیری، جہانبانی، فقط طرّارۂ آہو،
محبت شعلۂ پرّاں، ہوس بوئے گلِ بے بو
ز رازِ دہر کمتر گو!
سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیّار کے غارتگروں کے نقش پا باقی
سبا باقی نہ مہروئے سبا باقی!

سلیماں سر بزانو
اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے؟
کہاں سے کس سبو سے کاسۂ پیری میں مے آئے؟

شبابِ گریزاں

مئے تازہ و ناب حاصل نہیں ہے
تو کر لوں گا دُردِ تہِ جام پی کر گزارا۔

مجھے ایک نورس کلی نے
یہ طعنہ دیا تھا۔
تری عُمر کا یہ تقاضا ہے
تو ایسے پھولوں کا بھونرا بنے
جن میں دو چار دن کی مہک رہ گئی ہو۔

یہ سچ ہے وہ تصویر،
جس کے سبھی رنگ دُھندلا گئے ہوں
نئے رنگ اس میں بھرے کون لاکر
نئے رنگ لائے کہاں سے؟

ترے آسمان کا،
میں اک تازہ وارد ستارا ابھی
جانتا ہوں کہ اس آسماں پہ
بہت چاند، سُورج، ستارے اُبھر کر
جو اک بار ڈوبے تو اُبھرے نہیں ہیں
فراموش گاری کے نیلے اُفق سے
اُنھی کی طرح میں بھی
نا تجربہ کار انساں کی ہمت سے آگے بڑھا ہوں!
جو آگے بڑھا ہوں
تو دل میں ہوس یہ نہیں ہے
کہ اب سے ہزاروں برس بعد کی داستانوں میں
زندہ ہو اک بار پھر نام میرا!
یہ شام دلآویز تو اک بہانہ ہے،
اک کوششِ ناتواں ہے
شبابِ گریزاں کو جاتے ہوئے روکنے کی
وگرنہ ہے کافی مجھے ایک پل کا سہارا
ہوں اک تازہ وارد مُصیبت کا مارا
میں کر لوں گا دُردِ تہِ جام پی کر گزارا ——،

حیلہ ساز

کئی تنہا برس گزرے
کہ اس وادی میں ان سبز اونچے کہساروں میں
اُٹھا لایا تھا میں اُس کو،
نظر آتا ہے گاڑی سے وہ سینے توریم اب بھی
جہاں اُس سے ہوئی تھیں آخری باتیں:
"تجھے اے جان، میری بے وفائی کا ہے غم اب بھی؟
"محبت اُس کا بھکارن سے؟
"وہ بے شک خوبصورت تھی،
"مگر اس سے محبت، آہ نا ممکن!
"محبت گوشت کے اس کہنہ و فرسودہ پیکر سے؟
"ہوسناکی؟
"میں اک بوسے کا مجرم ہوں
"فقط اک تجربہ منظور تھا مجھ کو
"کہ آیا مفلسی کتنا گرا دیتی ہے انساں کو!"

نہ آیا اعتماد اس کو مری اس حیلہ سازی پر
بس اپنی ناتواں و لدوز آنکھوں سے
پہاڑوں اور ان پرتند و سرافروختہ چیلوں
کو وہ تکتی رہی پیہم!
"یہ دیکھو ایک اونچے پیڑ کا تھنا
"پہاڑی میں بنا لی اس نے اپنی راہ یوں جیسے
"چٹان اس کیلئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی!"
زمانے بھر پہ تاریکی سی چھائی ہے
مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی
مجھے بھولی نہیں وہ بے کسی اسکی نگاہوں کی
اور اُس کی آخری باتیں ہیں یاد اب تک!
مگر میں اس لئے "تازہ افق" کی جستجو میں ہوں
کہ اس کی یاد تک روپوش ہو جائے؟

کشاکش

شبِ دوشینہ کے آثار کہیں بھی تو نہیں،
تیری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ، نہ رخساروں پر،
اُڑ گئی اوس کے مانند ہر انگڑائی بھی!
اور ترا دل تو بس اک مجلۂ تاریکی ہے،
اس میں کام آ نہیں سکتی مری بینائی بھی!

یہ تجسس مجھے کیوں ہے کہ سحر کے ہنگام
کون اٹھا ترے آغوش سے سرجوش
جوانی لے کر
کیا وہ اس شہر کا سب سے بڑا سوداگر تھا؟
(تیرے پاؤں میں ہے زنجیرِ طلائی جس کی)
یا فرنگی کا گرانڈیل سپاہی تھا کوئی؟
(جن سے یہ شہر ابلتا ہوا ناسور بنا جاتا ہے)
یا کوئی دوست، شب و روز کی محنت کا شریک؟
امیرے ہی شوق نے ترغیب لائی ہو جسے!)
یہ تجسس مجھے کیوں ہے آخر،
جبکہ خود میرے لیے دور نہ تھا، دور نہیں،
کہ میں جا پہنچوں ترے جسم کے خمخانوں کا محرم بن جاؤں؟

جس کی قسمت میں کوئی موجِ تبسم بھی نہ ہو،
قہقہوں کا اُسے ذخّار سمندر مل جائے،
مبتلا کیوں نہ وہ اوہام کے اس دام میں ہو،
کہ وہی ایک ہی ہے تری ہستی پہ محیط
اور تو عہدِ گزشتہ کی طرح
کارواں سرائے تمنا کی گزرگاہ نہیں!

شبِ دوشینہ کے آثار کہیں بھی تو نہیں،
تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ نہ رخساروں پر
اور نمودار بھی ہو جائیں تو کیا،
آگہی ہو بھی، تو حاصل نہیں کچھ اس کے سوا
کہ غمِ عشق چراغِ تہِ داماں ہو جائے،
زندگی اور پریشاں ہو جائے!

خرابے

اک تمنا تھی کہ میں
اک نیا گھر، نئی منزل کہیں آباد کروں
کہ مرا پہلا مکان
جس کی تعمیر میں گزرے تھے مرے سات برس
اک کھنڈر بنتا چلا جاتا تھا
یہ تمنا تھی کہ شوریدہ سری
خشت اور سنگ کے انبار لگاتی ہی رہے
روز و شب ذہن میں بنتے ہی رہیں
در و دیوار کے خوش رنگ نقوش
مجھ کو تخئیل کے صحرا میں لیے پھرتا تھا
ایک آفت زدہ دیوانے کا جوش
لے گئے میرے قدم آخر کار
ایک دن اپنے نئے گھر میں مجھے
خیر مقدم کو تھیں موجود جہاں
میری گل چہرہ کنیزیں، مرے دل شاد غلام
دیکھ کر اپنی تمناؤں کی شادابی کو
میرے اندیشے کی دہلیز سے معدوم ہوئے

میرے ماضی کے سیہ تاب، الم ناک نشاں !
یہ مگر کیا تھا، خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
نہ وہ گل چہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
در و دیوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں
سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کا نزول
اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے
گھل گئے تھے کسی آئندہ کی بیداری میں
میرے خود ساختہ خواب
میں اسی پہلے خرابے کے کنارے تھا نگوں
جس سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے !
کس لیے ہے مری محرومی کی حاسد اب بھی
کسی منحوس ستارے کی غضبناک نگاہ
اور ادھر بندۂ بدبخت کی تنہائی کا یہ رنگ — کہ وہ
اور بھی تیرہ و غمناک ہوئی جاتی ہے !

سرگوشیاں

"پھر آج شام گاہ سرِ رہگذر اسے
دیکھا ہے میں نے دوشِ حسیں پر جھکے ہوئے!"

اک رشتہ دلیں

"یار وہ ہرزہ گرد،
ہے کسبِ روزگار میں اپنا شریکِ کار،
راتوں کو اس کی راہگزاروں پہ گردشیں
اور میکدوں میں چھپ کے مے آشامی طویل
رسوائیوں کی کوئی زمانے میں حد بھی ہے!"

یہ غصہ رائیگاں ہے، ہیں تو ہے یہ گلہ
"وارفتہ کیوں اسی کے لئے ہے وہ عشوہ ساز
کیوں ایسی دلکشی بھی خدا نے نہ دی ہمیں
تسخیر اس کا خندۂ بیباک کر سکیں؟"

اب تو کسی نوید کا امکان ہی نہیں
جب اس کا، دل کی آرزوؤں کے حصول تک
ایک اپنے یارِ غار سے ہے ربط شرمناک

"یہ اس کی شاطری ہے کہ "زنِ عجم" کا دام؟"

"کچھ بھی ہو اس میں شائبہ شاعری نہیں
یہ دن کا ایک ترسا ہوا شخص جان کر
پہچانتی ہے دور سے عورت کی لوستہ"

"اور کر رہا ہے اس کا نصیبہ بھی یاوری!"
اس رشکِ بےبسی سے مگر دوست فائدہ؟
ہے کچھ تو اپنا زورِ گریباں کے چاک پر
حاصل نہیں ہے ہم کو اگر وہ شرابِ ناب
تو بام و در کی شہر میں کوئی کمی نہیں
دو بول، ایک پیکرِ تخ بستہ، ایک رات"

دُوری

مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی مر جائے گی تو
وہ پہلی شب، مہِ شب ماہ دو نیم بن جائے گی
جس طرح سازِ کہنہ کے تارِ شکستہ کے دونوں سرے
دو افق کے کناروں کے مانند
یہ دُوری دو سرے تھرتھراتے ہیں اور پاس
آتے نہیں ہیں
نہ وہ راز کی بات ہونٹوں پہ لاتے ہیں
جس نے معنی کو دورِ زمان و مکاں سے نکالا تھا۔
بخشی تھی خوابِ ابد سے رہائی! ۔

یہ سچ ہے تو پھر کیوں
کوئی ایسی صورت، کوئی ایسا حیلہ نہ تھا
جس سے ہم آنے والے زمانہ کی آہٹ کو سُن کر
وہیں اس کی یورش کو سینوں پہ یوں روک لیتے۔
کہ ہم تیری منزل نہیں، تیرا ملجا و ماویٰ نہیں ہیں؟
یہ سوچا تھا شاید
کہ خود پہلے اس بُعد کے آفرینندہ بن جائینگے

اب جو اک مجرِ خمیازہ کش بن گیا ہے
تو پھر لذتِ نو مسرت سے، نو رس نئی فاتحانہ مسرت سے
پائیں گے بھولی ہوئی زندگی کو!
وہی خود فریبی، وہی اشک شوئی کا ادنیٰ بہانہ!

مگر اب وہی بُعد سرگوشیاں کر رہا ہے
کہ تو اپنی منزل کو واپس نہیں جا سکے گا۔
نہیں جا سکے گا......
مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی مر جائے گی تو
مگر مجھ کو اس کا یقیں ہے
یہ عفریت پہلے ہزیمت اُٹھائیگا مٹ جائیگا

سایہ

کسی خواب آلودہ سائے کا پیکر
کہاں تک ترے گوشِ شنوا، تری چشمِ بینا، ترے قلبِ دانا
کا ملجا و ماویٰ بنے گا؟

تجھے آج سائے کے ہونٹوں سے حکمت کی باتیں گوارا
تجھے آج سائے کے آغوش میں شعر و نغمہ کی راتیں گوارا
گوارا نہیں اُس زندگی سے کہ جس میں کئی کارواں راہ پیمائے ہیں،

مگر کل ترے لب پہ پہلی سی آہوں کی لپٹیں اُٹھیں گی
ترا دل اُنہی کاروانوں کو ڈھونڈے گا
اُن کو پکارے گا
جو جسم کی چشمہ گاہوں پہ رُکتے ہیں آکر
جنہیں تشنگی کے لیے سیرابی کی پوشیدہ راہوں کی ساری
خبر ہے!

یہ تسلیم، سایے نے تجھ کو
وہ پہنائیاں دیں
اُفق سے بلند اور بالا
جو تیری نگاہوں کے مرئی حجابوں میں پنہاں رہی تھیں!
وہ اسرار تجھ پر ہویدا کیے جن کا ارمان
فلاطوں سے اقبال تک سب کے سینوں کی دولت رہا ہے۔
وہ اشعار تجھ کو سنائے — جو حاصل ہیں ورجل سے لے کر
شکیب مایہ راشد کے سوز دروں کا
کہ تو بھول جائے وہ صرصر وہ گرداب جن میں
تری زندگی واژگوں تھی
تری زندگی خاک و خوں تھی!
تُو اسرار و اشعار سنتی رہی ہے
مگر دل ہی دل میں تو ہنستی رہی ہے
تو سیال پیکر سے سایے سے، غم کے کنارے سے کیا پا سکے گی؟
جب اس کے وہ اعضا، اِس سے زندہ توانا بدن
رنگ و لذّت کے مخزن، ہزاروں،
تمنّا کے ماحن ہزاروں!
کبھی خواب آلودہ سایے کی مہجور و غم دیدہ آنکھیں
ترے خشک مژگاں کو رنجور و نم دیدہ کرتی رہی ہیں
تو پھر بھی تو ہنستی رہی ہے!

کونسی اُلجھن کو سُلجھاتے ہیں ہم؟

لب بیاباں، بوسے بے جاں
کونسی اُلجھن کو سُلجھاتے ہیں ہم
جسم کی یہ کارگاہیں
جن کا ہیزم آپ بن جاتے ہیں ہم!

نیم شب اور شعرِ خواب آلودہ، ہم سائے
کہ جیسے دزدِ شب گرداں کوئی!
شام سے بھٹکے حسرتوں کے بندۂ بے دام ہم
پی رہے تھے جام پر ہر جام ہم
یہ سمجھ کر جرعۂ پنہاں کوئی
شاید آخر ابتدائے راز کا ایما بنے!

مطلب آساں، حرف بے معنی
تبسّم کے حسابی زاویے
تن کے مبہم حاشیے
جن سے عیشِ خام کے نقشِ ریا بنتے رہے
اور آخر جسم میں بُعدِ گریز بھی نہ تھا
جب دلوں کے درمیاں حائل تھے سنگین فاصلے
قربِ چشم و گوش سے ہم کونسی اُلجھن کو سُلجھاتے
رہے!

کونسی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟
شام کو جب اپنی غم گاہِ دل سے دزدانہ نکل
آتے ہیں ہم؟
زندگی کو تنگنائے تازہ تازہ تر کی جستجو
یا زوالِ عمر کا دیو سُبک پا رو برد
یا انا کے دستِ دیا کو وسعتوں کی آرزو
کونسی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

لا = انسان سے

حسن کوزہ گر (۱)

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دُکان پر میں نے دیکھا

تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی
تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا
رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
یہ وہ دَور تھا جس میں میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا —
وہ کوزے مرے دستِ چابک کے پُتلے
گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے
"حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟
وہ ہم سے خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں!"

جہاں زاد نو سال کا دَور یوں مجھ پہ گزرا
کہ جیسے کسی شہرِ مدفون پر وقت گزرے!
تغاروں میں مٹی
کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں
سنگ بستہ پڑی تھی
صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں
مری ہیچ مایہ معیشت کے، اظہارِ فن کے
سہارے
شکستہ پڑے تھے
میں خود، میں حسن کوزہ گر پا بہ گل خاک
بر سر برہنہ
سرِ "چاک" ژولیدہ مو، سر بزانو
کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے
گل و لا سے خوابوں کے سیال کوزے بناتا
رہا تھا
جہاں زاد، نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے

تری قاف کی سی اُفق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں، ابر و مہتاب کا
رہگزر بن گئے تھے
جہاں زاد، بغداد کی خواب گوں رات
وہ رودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملّاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا
وجود — اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو اُبھرا نہیں ہے!

•

جہاں زاد اس دَور میں روز، ہر روز
وہ سوختہ بخت آکر
مجھے دیکھتی چاک پر پابہ گل سر بزانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی —
(وہی چاک جو سالہا سال جینے کا تنہا سہارا
رہا تھا!)
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی
”حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر
یہ بچّوں کے تنّور کیونکر بھریں گے
حسن، اے محبّت کے مارے
محبّت امیروں کی بازی،
حسن اپنے دیوار و در پر نظر کر“
مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!
وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں
مگر میں حسن کوزہ گر شہرِ اوہام کے اُن
خرابوں کا مجذوب تھا جن
میں کوئی صدا کوئی جنبش
کسی مُرغِ پرّاں کا سایہ
کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا!

جہاں زاد، میں آج تیری گلی میں
یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں
ترے در کے آگے کھڑا ہوں
سر و مو پریشاں
دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں
مجھے آج پھر جھانکتی ہیں

زمانہ، جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و
سبو اور فانوس و گلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں
میں انساں ہوں لیکن
یہ نو ساں جو غم کے قالب میں گزرے!
حسن کوزہ گر آج اک تودۂ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف
کی دکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں
ان آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اٹھی ہے پھر تودۂ خاک میں نم کی ہلکی سی
لرزش
یہی شاید اس خاک کو گِل بنا دے!

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد
لیکن
تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور
کوزوں کی جانب ــــ
گِل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب
معیشت کے، اظہارِ فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گِل و لا سے اُس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن!

ریگِ دیروز

ہم محبت کے خوابوں کے مکیں
وقت کے طولِ المناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں
کہ ساحل پایا
اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا!

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا!

ہم محبت کے خوابوں کے مکیں
کنجِ ماضی میں ہیں باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ
اور کبھی فتنۂ ناگاہ سے ڈر کر چونکیں
تو رہیں سدِّ نگاہ نیند کے بھاری پردے
ہم محبت کے خوابوں کے مکیں
ایسے تاریک خرابے کہ جہاں
دور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہو
ایک، بس ایک، صدا گونجتی ہو
شبِ آلام کی "یا ہو! یا ہو!"

ہم محبت کے خوابوں کے مکیں
ریگِ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتے رہے
سایہ ناپید تھا، سائے کی تمنا کے تلے سوتے رہے!

ابولہب کی شادی

شبِ زفاف ابولہب تھی، مگر خدایا وہ کیسی
شب تھی،
ابولہب کی دُلہن جب آئی تو سر پہ اپندھن گلے میں
سانپوں کے ہار لائی، نہ اس کو مشاطگی سے مطلب
نہ مانگ غازہ، نہ رنگ روغن گلے میں سانپوں
کے ہار اس کے، تو سر پہ ایندھن!
خدایا کیسی شبِ زفاف ابولہب تھی!

یہ دیکھتے ہی ہجوم بپھرا، بھڑک اُٹھے یوں غضب
کے شعلے، کہ جیسے لگنے بدن پہ جابر کے تازیانے
جوان لڑکوں کی تالیاں تھیں، نہ صحن میں شوخ
لڑکیوں کے تھرکتے پاؤں تھرک رہے تھے،
نہ نغمہ باقی نہ شادیانے!

ابولہب نے یہ رنگ دیکھا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

ابولہب کی خبر جو آئی، تو سالہا سال کا زمانہ
غبار بن کر بکھر چکا تھا!

ابولہب اجنبی زمینوں کے لعل و گوہر سمیٹ کر
پھر وطن کو لوٹا، ہزار طرار و تیز آنکھیں پرانے
غرفوں سے جھانک اٹھیں، ہجوم پیر و جواں کا
گھر ا ہجوم، اپنے گھروں سے نکلا، ابولہب کے جلوس
کو دیکھنے کو لپکا!

"ابولہب!" اک شبِ زفاف ابولہب کا جلا
پھپھولا، خیال کی ریت کا بگولا، وہ عشقِ بربادہ
کا ہیولا، ہجوم میں سے پکار اٹھی: "ابولہب!
تو وہی ہے جس کی دلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن
گلے میں سانپوں کے ہار لائی؟"

ابولہب ایک لمحہ ٹھٹکا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل

نغمہ درجاں، رقص برپا، خندہ برلب
دل، تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کے قریب!

دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل
ریگ کے دلشاد شہری، ریگ تو
اور ریگ ہی تیری طلب
ریگ کی نکہت ترے پیکر میں، تیری جاں میں ہے!

ریگ صبحِ عید کے مانند زرتاب و جلیل،
ریگ صدیوں کا جمال،
جشنِ آدم پر بچھڑ کر ملنے والوں کا وصال،
شوق کے لمحات کے مانند آزاد و عظیم!

ریگ نغمہ زن
کہ ذرّے ریگ زاروں کی وہ پازیبِ قدیم
جس پہ پڑ سکتا نہیں دستِ لئیم،
ریگِ صحرا زرگری کی ریگ کی لہروں سے دور
چشمۂ مکر و ریا شہروں سے دور!

ریگ شب بیدار ہے، سنتی ہے ہر جابر کی چاپ
ریگ شب بیدار ہے، نگراں ہے مانندِ نقیب
دیکھتی ہے سایۂ آمر کی چاپ
ریگ ہر عیّار، غارت گر کی موت
ریگ استبداد کے طغیاں کے شور و شر کی موت
ریگ جب اٹھتی ہے، اڑ جاتی ہے ہر فاتح کی نیند
ریگ کے نیزوں سے زخمی سب شہنشاہوں کے خواب

ریگ، اے صحرا کی ریگ
مجھ کو اپنے جاگتے ذرّوں کے خوابوں کی نئی
تعبیر دے!

ریگ کے ذرّو، ابھرتی صبح تم،
آؤ صحرا کی حدوں تک آ گیا روزِ طرب
دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل،
آ ہجومِ ریگ!
ہے خیالوں کے پریزادوں سے بھی معصوم ریگ

رنگِ رقصاں، ماہ و سالِ نو رنگِ رقصاں رہے
اس کا ابریشم ملائم، نرم خو، خنداں رہے!

دل، مرے صحرا نوردِ پیرِ دل
یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ
راہِ گم کردوں کی مشعل، اس کے لب پر "آؤ! آؤ!"
تیرے ماضی کے خزف ریزوں سے جاگی ہے یہ آگ
آگ کی قرمز زباں پر انبساطِ نو کے راگ
دل، مرے صحرا نوردِ پیرِ دل،
سرگرانی کی شبِ رفتہ سے جاگ!

کچھ شرر آغوشِ صرصر میں ہیں گم،
اور کچھ زینہ بہ زینہ شعلوں کے مینار پر چڑھتے ہوئے
اور کچھ تہہ میں الاؤ کی ابھی،
مضطرب، لیکن مذبذب طفلِ کمسن کی طرح!
آگ زینہ، آگ رنگوں کا خزینہ
آگ اُن لذّات کا سرچشمہ ہے
جس سے لیتا ہے غذا عشّاق کے دل کا تپاک!
چوبِ خشک انگور اس کی مے ہے آگ
سرسراتی ہے رگوں میں عید کے دن کی طرح!

آگ کاہن، یاد سے اُتری ہوئی صدیوں کی یہ
افسانہ خواں
آنے والے قرنہا کی داستانیں لب بہ ہیں
دل، مرا صحرا نوردِ پیرِ دل سُن کر جواں!

آگ آزادی کا، دلشادی کا نام
آگ پیدائش کا، افزائش کا نام
آگ کے پھولوں میں نسریں، یاسمن، سنبل،
شقیق و نسترن
آگ آرائش کا، زیبائش کا نام
آگ وہ تقدیس، دُھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ
آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم
عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب!

یہ تمنّاؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
اس لق و دق میں نکل آئیں کہیں سے بھیڑیے
اس الاؤ کو سدا روشن رکھو!
(ریگِ صحرا کو بشارت ہو کہ زندہ ہے الاؤ
بھیڑیوں کی چاپ تک آتی نہیں!)

آگ سے صحرا کا رشتہ ہے قدیم

آگ سے صحرا کا رشتہ ہے قدیم
آگ سے صحرا کے ٹیڑھے، رینگنے والے،
گرہ آلود، ژولیدہ درخت
جاگتے ہیں نغمہ در جاں، رقص برپا، خندہ برلب
اور منا لیتے ہیں تنہائی میں جشنِ ماہتاب
ان کی شاخیں غیر مرئی طبل کی آواز پر دیتی ہیں تال
بیخ و بُن سے آنے لگتی ہے خداوندی جلاجل
کی صدا!

آگ سے صحرا کا رشتہ ہے قدیم
رہروانِ صحرا نوردوں کے لیے ہے رہنما
کاروانوں کا سہارا بھی ہے آگ
اور صحراؤں کی تنہائی کو کم کرتی ہے آگ!

آگ کے چاروں طرف پشمینہ و دستار میں لپٹے
ہوئے افسانہ گو
جیسے گردِ چشم مژگاں کا ہجوم
ان کے حیرت ناک، دلکش تجربوں سے
جب دمک اٹھتی ہے ریت،
ذرہ ذرہ بجنے لگتا ہے مثالِ سازِ جاں
گوش بر آواز رہتے ہیں درخت

اور ہنس دیتے ہیں اپنی عارفانہ بے نیازی
سے کبھی!

یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
ریگ اپنی خلوتِ بے نور و خود بیں میں رہے
اپنی یکتائی کی تحسیں میں رہے
اس الاؤ کو سدا روشن رکھو!

یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
ایشیا، افریقہ پہنائی کا نام
(بے کار پہنائی کا نام)
یورپ اور امریکہ دارائی کا نام،
(تکرارِ دارائی کا نام!)

میرا دل، صحرا نوردِ پیر دل
جاگ اٹھا ہے، مشرق و مغرب کی ایسی
یک دلی کے کاروانوں کا نیا رویا لیے،
یک دلی ایسی کہ ہوگی فہمِ انساں سے ورا
یک دلی ایسی کہ ہم سب کہہ اٹھیں:
"اس قدر عجلت نہ کر
اژدہامِ گل نہ بن!"

کہ اٹھیں ہم:
"تو غمِ کُل تو نہ تھی
اب لذتِ کُل بھی نہ بن
روزِ آسائش کی بے دردی نہ بن
یک دلی بن، ایسا سناٹا نہ بن،
جس میں تابستاں کی دوپہروں کی
بے حاصل کسالت کے سوا کچھ بھی نہ ہو!"

اس "جفاگر" یک دلی کے کارواں یوں آ نکلے
دستِ جادوگر سے جیسے چھوٹ نکلے ہوں طلسم،
عشق حاصل خیز سے، یا زر پیدائی سے
جیسے ناگہاں
کھل گئے ہوں مشرق و مغرب کے جسم،
— جسم صدیوں کے عقیم!

کارواں فرخندہ پے، اور اُن کا بار
کیسہ کیسہ تختِ جم اور تاج کے
کوزہ کوزہ فرد کی سطوت کی مے
جامہ جامہ روز و شب محنت کا رخ
نغمہ نغمہ حرّیت کی گرم لے!

سالکو، فیروز بختو، آنے والے قافلو
شہر سے لوٹو گے تم تو پاؤ گے
ریت کی سرحد پہ جو روحِ ابد خوابیدہ تھی
جاگ اُٹھی ہے "شکوہ ہائے نے" سے وہ
ریت کی تہہ میں جو شرمیلی سحر روئیدہ تھی
جاگ اُٹھی ہے حرّیت کی لے سے وہ!

اتنی دوشیزہ تھی، اتنی مرد نادیدہ تھی صبح
پوچھ سکتے تھے نہ اس کی عمر ہم!
درد سے ہنستی نہ تھی،
ذرّوں کی رعنائی پہ بھی ہنستی نہ تھی،
ایک محجوبانہ بے خبری میں ہنس دیتی تھی صبح!
اب مناتی ہے وہ صحرا کا جلال
جیسے عزّوجل کے پاؤں کی یہی محراب ہو!
زیرِ محراب آ گئی ہو اس کو بیداری کی رات
خود جنابِ عزّوجل سے جیسے اُمیدِ زفاف
(سارے ناکردہ گناہ اس کے معاف!)

صبحِ صحرا، شاد باد!
اے عروسِ عزّوجل، فرخندہ رو، تابندہ خو
تو اک ایسے حجرۂ شب سے نکل آئی ہے

ت قاتل نے بہایا تھا جہاں ہر سیج پہ
ینکڑوں تاروں کا رخشندہ لہو، پھولوں
کے پاس !
ع صحرا، سر مرے زانو پہ رکھ کر داستاں
ں تمنّا کے شہیدوں کی نہ کہہ
ں کی نیم رس اُمنگوں، آرزوؤں کی نہ کہہ
ں سے ملنے کا کوئی امکاں نہیں
مد تیرا جن کو نوشِ جاں نہیں !
ج کبھی کچھ دور، اس صحرا کے پار
و کی دیوار کے نیچے نسیم
ز و شب چلتی ہے مبہم خوف سے سہمی ہوئی
ں طرح شہروں کی راہوں پر یتیم
یہ بر لب تا کہ اُن کی جاں کا سنّاٹا ہو دُور !

آج بھی اس ریگ کے ذرّوں میں ہیں
ایسے ذرّے، آپ ہی اپنے غنیم
آج بھی اس آگ کے شعلوں میں ہیں
وہ شرر جو اس کی تہہ میں پر بریدہ رہ گئے
مثلِ حرفِ ناشنیدہ رہ گئے !
صبحِ صحرا، اے عروسِ عزّ و جل
آ کہ اُن کی داستاں دہرائیں ہم
ان کی عزّت اُن کی عظمت گائیں ہم

صبح، ریت اور آگ، ہم سب کا جلال !
یک دلی کے گاردواں اُن کا جمال
آؤ !
اس تہلیل کے حلقے میں ہم مل جائیں
آؤ !
شادباد اپنی تمنّاؤں کا بے پایاں الاؤ !

اسرافیل کی موت

رگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
ہ خداؤں کا مقرّب، وہ خداوندِ کلام
موتِ انسانی کی روحِ جاوداں
سمانوں کی ندائے بے کراں
اج ساکت مثلِ حرفِ ناتمام
رگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ!

آؤ، اسرافیل کے اس خوابِ بے ہنگام پر
آنسو بہائیں

رمیدہ ہے وہ یوں قرنا کے پاس
یسے طوفاں نے کنارے پر اُگل ڈالا اسے
ریگِ ساحل پر، چمکتی دھوپ میں چُپ چاپ
اپنے صُور کے پہلو میں وہ خوابیدہ ہے!
اس کی دستار، اس کے گیسو، اُس کی ریش
کیسے خاک آلودہ ہیں!
تھے کبھی جن کی تہیں بود و نبود!

کیسے اس کا صُور، اُس کے لب سے دُور،
اپنی چیخوں، اپنی فریادوں میں گُم
جھلا اُٹھتے تھے جس سے دیر و زود!

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ مجسّم ہمہمہ تھا، وہ مجسّم زمزمہ
وہ ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی غیبی صداؤں کا نشاں!

مرگِ اسرافیل سے
حلقہ در حلقہ فرشتے نوحہ گر،
ابنِ آدم زُلف در خاک و نزار
حضرتِ یزداں کی آنکھیں غم سے تار
آسمانوں کی صفیر آتی نہیں
عالمِ لاہوت سے کوئی نفیر آتی نہیں!

مرگِ اسرافیل سے

اس جہاں پر بند آوازوں کا رزق
مطربوں کا رزق، اور سازوں کا رزق
اب مغنّی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا
سننے والوں کے دلوں کے تار چُپ!
اب کوئی رقّاص کیا تھرکے گا، لہرائے گا کیا
بزم کے فرش و در و دیوار چُپ!
اب خطیبِ شہر فرمائے گا کیا
مسجدوں کے آستان و گنبد و مینار چُپ!
فکر کا صیّاد اپنا دام پھیلائے گا کیا
طائرانِ منزل و کہسار چُپ!

مرگِ اسرافیل سے
گوشِ شنوا کی، لبِ گویا کی موت
چشمِ بینا کی، دلِ دانا کی موت
تھی اسی کے دم سے درویشوں کی ساری
ہاؤ ہو
اہلِ دل کی اہلِ دل سے گفتگو ——
اہلِ دل —— جو آج گوشہ گیر و
سُرمہ در گلو!
اب تنا نا ہو بھی غائب، اور یا رب ہا
بھی گم

اب گلی کوچوں کی ہر آواز بھی گم
یہ ہمارا آخری ملجا بھی گم!

مرگِ اسرافیل سے،
اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، ٹھہرا گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا،
ایسی تنہائی کہ حُسنِ تام یاد آتا نہیں
ایسا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں!

مرگِ اسرافیل سے
دیکھتے رہ جائیں گے دنیا کے آمر بھی
زباں بندی کے خواب!
جس میں مجبوروں کی سرگوشی تو ہو
اُس خداوندی کے خواب!

میرے بھی ہیں کچھ خواب

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں
کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!
اس دور سے، اس دور کے سوکھے ہوئے
دریاؤں سے،
پھیلے ہوئے صحراؤں سے، اور شہروں
کے ویرانوں سے

ویرانہ گروں سے ہیں حزیں اور اداس!
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی
ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب کہ اسرار نہیں جن کے ہمیں
آج بھی معلوم
وہ خواب جو آسودگیٔ مرتبہ و جاہ سے،
آلودگیٔ گردِ سرِ راہ سے معصوم!
جو زیست کی بے ہودہ کشاکش سے بھی ہوتے
نہیں معدوم
خود زیست کا مفہوم!

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
اے کاہنِ دانشور و عالی گہر و پیر
تو نے ہی بتائی ہمیں ہر خواب کی تعبیر
تو نے ہی سجھائی غمِ دلگیر کی تسخیر
ٹوٹی ترے ہاتھوں ہی سے ہر خوف کی زنجیر
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی
ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب،
کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ
اسمار کے نیچے
اجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی

دیوار کے نیچے
شیراز کے مجذوب تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیب نگوں سار کے آلام کے انبار کے نیچے!

کچھ خواب ہیں آزاد مگر بڑھتے ہوئے نور سے
مرعوب
نے حوصلۂ خوب ہے، نے ہمتِ ناخوب
گو ذات سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی انہیں محبوب
ہیں آپ ہی اس ذات کے جاروب
—— ذات سے محجوب!

کچھ خواب ہیں جو گردشِ آلات سے جو بندۂ تمکین
ہے جن کیلئے بندگیِ قاضیِ حاجات سے اس
دہر کی تزئین
کچھ جن کے لئے غم کی مساوات سے انساں کی تباہی
کچھ خواب کہ جن کا ہوسِ جور ہے آئین
دنیا ہے نہ دیں!

کچھ خواب ہیں پروردۂ انوار، مگر ان کی سحر گم
جس آگ سے اٹھتا ہے محبت کا خمیر، اس کے
شرر گم
ہے کل کی خبر ان کو مگر جز کی خبر گم
یہ خواب ہیں وہ جن کیلئے مرتبۂ دیدۂ تر ہیچ
دل ہیچ ہے، سر اتنے برابر ہیں کہ سر ہیچ!
—— عرضِ ہنر ہیچ!

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
یہ خواب مرے خواب نہیں ہیں کہ مرے خواب
ہیں کچھ اور
کچھ اور مرے خواب ہیں، کچھ اور مرا دور
خوابوں کے نئے دور ہیں، نے مور و ملخ، نے
اسد و ثور
نے لذتِ تسلیم کسی میں، نہ کسی کو ہوسِ جور
—— سب کے نئے طور!

اے عشق ازل گیر و ابد تاب،
میرے بھی ہیں کچھ خواب!
ہر خواب کی سوگند!
ہر چند کہ وہ خواب ہیں سر بستہ و روبند
سینے میں چھپائے ہوئے گویائیِ دوشیزۂ
لب خند
ہر خواب میں اجسام سے افکار کا، مفہوم سے
گفتار کا پیوند

عشّاق کے لب ہائے ازل تشنہ کی پیوستگیِ شوق کے مانند

(اے لمحۂ خورسند!)

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب ہیں آزادیٔ کامل کے نئے خواب
ہر سعیٔ جگر دوز کے حاصل کے لئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے خواب
یا سینۂ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

تعارف

اجل، ان سے مل،
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب،

نہ اہلِ کتاب ——
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین
فقط بے یقین
اجل، ان سے مت کر حجاب
اجل، ان سے مل!

بڑھو، تم بھی آگے بڑھو،
اجل سے ملو،
بڑھو، نو تونگر گداؤ
نہ کشکولِ دریوزہ گردی چھپاؤ
تمہیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں
اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساؤ!
بڑھو، بندگانِ زمانہ، بڑھو بندگانِ درم
اجل، یہ سب انسان منفی ہیں،
منفی زیادہ ہیں، انسان کم
ہو ان پر نگاہِ کرم!

زندگی اک پیرہ زن!

—— زندگی اک پیرہ زن!
جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز و شب پُرانی دھجیاں!
تیز، غم انگیز، دیوانہ ہنسی سے خندہ زن
بال بکھرے، دانت میلے، پیرہن
دھجیوں کا ایک سونا اور نا پیدا کراں، تاریک بن!

—— لو ہوا کے ایک جھونکے سے اُڑی ہیں ناگہاں
ہاتھ سے اس کے پُرانے کاغذوں کی بالیاں
اور وہ آپے سے باہر ہو گئی
اس کی حالت اور ابتر ہو گئی
سہہ سکے گا کون یہ گہرازیاں؟

—— اب ہوا سے ہار تھک کر جھک گئی ہے پیرہ زن
جھک گئی ہے پاؤں پر، جیسے دفینہ ہو وہاں!
زندگی، تو اپنے ماضی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پُرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سونے کنوئیں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟
—— اس کی تہہ میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جز صدا کچھ بھی نہیں!

اظہار اور رسائی

— مُوقلم، ساز، گلِ تازہ، تھرکتے پاؤں
بات کہنے کے بہانے ہیں بہت
آدمی کس سے مگر بات کرے؟
بات جب حیلۂ تقریبِ ملاقات نہ ہو
اور رسائی کہ ہمیشہ سے ہے کوتاہ کمند
بات کی غایتِ غایات نہ ہو!

— ایک ذرّہ کفِ خاکستر کا
شررِ جستہ کے مانند کبھی
کسی انجانی تمنّا کی خلش سے مسرور
اپنے سینے کے دہکتے ہوئے تنور کی لو سے مجبور
— ایک ذرّہ کہ ہمیشہ سے ہے خود سے مہجور،
کبھی نیرنگِ صدا بن کے جھلک اٹھتا ہے
آب و رنگ و خط و محراب کا پیوند کبھی
اور بنتا ہے معانی کا خداوند کبھی
وہ خداوند جو پابستۂ آنات نہ ہو!

اسی اک ذرّے کی تابانی سے
کسی سوئے ہوئے رقّاص کے دست و پا میں
کانپ اٹھتے ہیں مہ و سال کے نیلے گرداب
اسی اک ذرّے کی حیرانی سے
شعر بن جاتے ہیں اک کوزہ گرِ پیر کے خواب
اسی اک ذرّۂ لافانی سے
خشتِ بے مایہ کو ملتا ہے دوام
بام و در کو وہ سحر جس کی کبھی رات نہ ہو!
— آدمی کس سے مگر بات کرے؟
مُوقلم، ساز، گلِ تازہ، تھرکتے پاؤں
آدمی سوچتا رہ جاتا ہے،
اس قدر بار کہاں، کس کے لیے، کیسے اٹھاؤں
اور پھر کس لیے بات کروں؟

تمنا کے تار

—— تمنّا کے ژولیدہ تار،
گرہ در گرہ ہیں تمنا کے نادیدہ تار

مگر یہ ستاروں سے اُترے ہوئے لوگ
سررشتۂ ناگزیر ابد میں اسیر!

—— ستاروں سے اُترے ہیں کچھ لوگ رات
وہ کہتے ہیں: "اپنی تمنا کے ژولیدہ تاروں
کو سُلجھاؤ،
سُلجھاؤ اپنی تمنّا کے ژولیدہ تار،
ستاروں کی کرنوں کے مانند سلجھاؤ
مبادا ستاروں سے برسیں وہ تیر
کہ رہ جائے باقی تمنا نہ تار!"

—— ہم اُن سے یہ کہتے ہیں: "اے اہلِ مرّیخ....
(جانے وہ کن کن ستاروں سے ہیں!)
ادب سے خوشامد سے کہتے ہیں: "اے محترم اہلِ مرّیخ،
کیا تم نہیں دیکھتے ان تمنّا کے ژولیدہ تاروں کے رنگ؟"
مگر اُن کو شاید کہ رنگوں سے رغبت نہیں
کہ رنگوں کی اُن کو فراست نہیں!
ہے رنگوں کے بارے میں اُن کا خیال اور ——
اُن کا فراق و وصال اور ——
اُن کے مہ و سال اور ——

—— تمنّا کے ژولیدہ تار ——
ستاروں سے اُترے ہوئے راہگیر،
کہ ہے نور ہی نور جن کا خمیر،
تمنّا سے واقف نہیں —— نہ اُن پر عیاں
تمنّا کے تاروں کی ژولیدگی ہی کا راز!
تمنّا ہمارے جہاں کی، جہانِ فنا کی متاعِ عزیز

—— بڑی سادگی سے یہ کہتے ہیں ہم:
"محترم اہلِ مرّیخ، دیکھتے نہیں
کبھی تم نے ژولیدہ باہوں کے رنگ؟
محبّت میں سرخوشِ نگاہوں کے رنگ
گناہوں کے رنگ؟......

زندگی سے ڈرتے ہو؟

— زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!

آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے،
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی، ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!
"ان کہی" سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اُس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!

— پہلے بھی تو گزرے ہیں،
دورِ نارسائی کے، "بے ریا" خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہِ خداوندی!

تم مگر یہ کیا جانو،
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اُٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اُٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اُٹھتے ہیں صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں،
روشنی سے ڈرتے ہو!
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے!
آدمی چھلک اُٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟
ہاں ابھی تو تم بھی ہو، ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں،
تم ابھی سے ڈرتے ہو!

اے غزالِ شب!

اے غزالِ شب،
تری پیاس کیسے بجھاؤں میں
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو مری جان
میں ہے؟

وہ سراب ساحرِ خوف ہے
جو سحر و شام کے رہگذر
میں فریب رہروِ سادہ ہے
وہ سراب زادہ، سراب گر، کہ ہزار صورتِ نو بنو
میں قدم قدم پہ ستادہ ہے،
وہ جو نائب دہمہ گیر دشتِ گماں میں ہے
مرے دل میں جیسے یقین بن کے سما گیا
مرے ہست و بود پہ چھا گیا!

اے غزالِ شب،
اُسی فتنہ کار سے چھُپ گئے
مرے دیر و زود کبھی خواب میں
مرے نزد و دور حجاب میں
وہ حجاب کیسے اُٹھاؤں میں جو کشیدہ
قالبِ دل میں ہے
کہ میں دیکھ پاؤں درونِ جاں
جہاں خوف و غم کا نشاں نہیں
جہاں یہ سراب رواں نہیں،
اے غزالِ شب!

آنکھیں کالے غم کی

اندھیرے میں یوں چمکیں آنکھیں کالے غم کی
جیسے وہ آیا ہو بھیس بدل کر آمر کا
آنے والے جابر کا!
سب کے کانوں میں بُن ڈالے مکڑی نے جالے
سب کے ہونٹوں پر تالے
سب کے دلوں میں بھالے!

اندھیرے میں یوں چمکے میلے دانت بھی غم کے
جیسے پچھلے دروازے سے آمر آدھمکے
سر پر ابن آدم کے!
غم بھی آمر کے مانند اک دُم والا تارا
یا جلتا بجھتا شرارا،
جو رستے میں آیا سو مارا!

غم گرجا برسا، جیسے آمر گرجے برسے
خلقت سہمی دبکی تھی اک مبہم سے ڈر سے
خلقت نکلی پھر گھر سے!
بستی والے یوں اُٹھے! "اے مالک اے باری!
کب تک ہم پہ رہے گا غم کا سایہ یوں بھاری،
کب ہوگا فرماں جاری؟"

وہ حرفِ تنہا

(جسے تمنّائے وصلِ معنا)

ہمارے اعضا جو آسماں کی طرف دُعا کے لئے اُٹھے ہیں،
(تم آسماں کی طرف نہ دیکھو!)
مقامِ نازک پہ ضربِ کاری سے جاں بچانے کا ہے وسیلہ
کہ اپنی محرومیوں سے چھپنے کا ایک حیلہ؟

بزرگ و برتر خدا کبھی تو (بہشت برحق!)
ہمیں خدا سے نجات دے گا
کہ ہم ہیں اس سرزمیں پہ جیسے وہ حرفِ تنہا،
(مگر وہ ایسا جہاں نہ ہوگا) خموش و گویا،
جو آرزوئے وصالِ معنی میں جی رہا ہو
جو حرف و معنی کی یک دلی کو ترس گیا ہو!

ہمیں معرّی کے خواب دے دو
(کہ سب کو بخشیں بقدرِ ذوقِ نگہ تبسّم)۔
ہمیں معرّی کی روح کا اضطراب دے دو
(جہاں گناہوں کے حوصلے سے ملے تقدّس کے دُکھ کا مرہم)
کہ اُس کے بے نور و تار آنکھیں
درونِ آدم کی تیرہ راتوں

کو چھیدتی تھیں
اُسی جہاں میں فراقِ جاں کاہ حرف و معنی
کو دیکھتی تھیں
بہشت اُس کے لیے وہ معصوم سادہ لوحوں کی عافیت تھا
جہاں وہ ننگے بدن پہ جابر کے تازیانوں سے بچ کے
راہِ فرار پائیں
وہ کفشِ پا تھا، کہ جس سے غربت کی ریگِ بریاں
سے روزِ فرصت قرار پائیں
کہ صلبِ آدم کی، رحمِ حوّا کی عزلتوں میں، نہایت انتظار پائیں!
(بہشت صفرِ عظیم، لیکن ہمیں وہ گم گشتہ ہند سے ہیں
بغیر جن کے کوئی مساوات کیا بنے گی
وصالِ معنی سے حرف کی بات کیا بنے گی؟)
ہم اس زمیں پر ازل سے پیرانہ سر ہیں، مانا
مگر ابھی تک ہیں دل توانا
اور اپنی ژولیدہ کاریوں کے طفیل دانا
ہمیں معرّی کے خواب دے دو
(بہشت میں بھی نشاط، یک رنگ ہو تو، غم ہے
ہو ایک سا جامِ شہد سب کے لئے تو سم ہے)
کہ ہم ابھی تک ہیں اس جہاں میں وہ حرفِ تنہا
(بہشت رکھ لو، ہمیں خود اپنا جواب دے دو!)
جسے تمنائے وصلِ معنا.....

ہمہ تن نشاطِ وصال ہم

ہمیں یاد ہے وہ درخت جس سے چلے ہیں ہم
کہ اُسی کی سمت ازل کی کوریٔ چشم سے)
کئی بار لوٹ گئے ہیں ہم
(میں وہ حافظہ جسے یاد مبدا و منتہا
جسے یاد منزلِ آشیاں)
اُسی اک درخت کے آشیاں میں رہے ہیں ہم
اُسی آشیاں کی تلاش میں
ہیں تمام شوق، تمام ہُو
اُسی ایک وعدۂ شب کی سو
ہیں تمام کاوشِ آرزو!

یہ خلائے وقت کہ جس میں ایک سوال ہم
کوئی چیز ہم، نہ مثال ہم
جسے نوکِ خار سے چھید دیں
وہی ایک نقطۂ خال ہم
(میں وہ حادثہ، جو ہزار حادثوں کی طرح
ہوا اسیرِ حلقۂ دامِ جاں
جو اسیر ہو، مگر اور ایسے ہی حادثوں
کی طرح ہمیشہ رواں دواں
اُسی ایک وعدۂ شب کی سُو!
مری ایک جنبشِ چشم تک
کئی حادثات کا سلسلہ
نہیں جن میں لمحے کا فاصلہ
ہوں اسیر جس میں یہ حادثے، میں وہ حافظہ)
ہمہ تن نشاطِ وصال ہم
مگر آشیاں کے بغیر وہم و خیال ہم
ہیں رواں کہ مل کے زباں بنیں
کوئی داستاں، کوئی نغمہ، کوئی بیاں نہیں
ہے اگرچہ خطرہ یہ پے بہ پے کہ یہ جستجوئے عظیم بھی
نہ کہیں ہو رازِ تلاشِ منزلِ جستجو،
کہ یہ جانتے ہیں نہیں ہیں اپنا مآل ہم
کبھی موقلم، کبھی پردہ ہم
کبھی خط ہیں اور کبھی خال ہم
نہیں نقش گر، نہیں نقش گر کا کمال ہم!

میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو

میر ہو مرزا ہو میرا جی ہو
نارسا ہاتھ کی تمنا کیا ہے
ایک ہی چیخ ہے فرقت کے بیابانوں میں
ایک ہی طولِ المناکی ہے
ایک ہی روح جو بے حال ہے زندانوں میں
ایک ہی قیدِ تمنا کی ہے

عہدِ رفتہ کے بہت خواب تمنا میں ہیں
اور کچھ واہمے آئندہ کے
پھر بھی اندیشہ وہ آئینہ ہے جس میں گویا
میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو
کچھ نہیں دیکھتے ہیں
محورِ عشق کی خود مست حقیقت کے سوا
اپنے ہی بیم و رجا اپنی ہی صورت کے سوا
اپنے رنگ اپنے بدن، اپنے ہی قامت کے سوا
اپنی تنہائی جانکاہ کی دہشت کے سوا!

"دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی
ہوں تو ناکام پہ ہوتے ہیں مجھے کام بہت"
"مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے"
"رات کے پھیلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہ تھا
چاند کے آنے پہ سائے آئے
سائے ملتے ہوئے، کھلتے ہوئے کچھ بھوت سے
بن جاتے ہیں"....

(میر ہو مرزا ہو، میرا جی ہو
اپنی ہی ذات کی غربال میں چھن جاتے ہیں!
دل خراشیدہ و خوں دادہ رہے
آئنہ خانے کے ریزوں پہ ہم استادہ رہے
چاند کے آنے پہ سائے بہت آئے ہیں
ہم بہت سایوں سے گھبرائے بھی
میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو
آج جاں اک نئے ہنگامے میں در آئی
ماہِ بے سایہ کی داد آئی ہے
یاد وہ عشرتِ خونناب کسے؟
فرصتِ خواب کسے؟

زمانہ خدا ہے

"زمانہ خدا ہے، اسے تم برا مت کہو"
مگر تم نہیں دیکھتے ۔۔ زمانہ فقط ریسمانِ خیال
سبک مایہ، نازک، طویل
جدائی کی ارزاں سبیل!
وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں،
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی،
انھیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں اب بھی، موجود ہیں وہ کہیں،
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسّی تنی ہے
کہ یہ وہ عدم ہے
جسے بست ہونے میں مدّت لگے گی
ستاروں کے لمحے، ستاروں کے سال!

مرے صحن میں ایک کمسن بنفشے کا پودا ہے
طیّارہ کوئی کبھی اس کے سر پر سے گزرے
تو وہ مسکراتا ہے اور لہلہاتا ہے
گویا وہ طیّارہ، اس کی محبّت میں
عہدِ وفا کے کسی جبرِ طاقت ربا ہی سے گزرا!
وہ خوش اعتمادی سے کہتا ہے:
"لو دیکھو، کیسے اسی ایک رسّی کے دونوں کناروں
سے ہم تم بندھے ہیں!
یہ رسّی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال؟"
مگر ہجر کے ان وسیلوں کو وہ دیکھ سکتا نہیں
جو سراسر ازل سے ابد تک تنے ہیں!
جہاں یہ زمانہ ۔۔۔ ہنوز زمانہ
فقط اک گرہ ہے!

مری مورجاں

مری مورجاں،
مورِ کم مایہ جاں،
رات بھر، زیرِ دیوار، دیوار کے پاؤں میں
رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی تھی؛
مگر صبح ہونے سے پہلے
انھوں نے جو دروازہ کھولا
تو میں مردہ پایا گیا ـــ
(مرے خواب زندہ بچے تھے!)

مجھے آنسوؤں کے کرم سے ہمیشہ علاوت رہی ہے
تو میں نے یہ پوچھا: "عزیزو!
تمہیں اس کا خدشہ نہیں
کہ میرے نیاں سے، وہ آہنگِ حرف و معانی
نمودار ہوگا، مری مورجاں جس کی خاطر
سدا رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی ہے؟
تمہیں اس کا خدشہ نہیں،
کہ یہ خواب بھی،
جو مری موت پر تہ نشیں رہ گئے ہیں،
جنھیں تم ہزاروں برس تک
چھپاتے پھروگے اساطیر کے روزنوں میں
محبت کے کافور کو چیر کر
عقیدت کی ردی کے تودوں سے ناگہ نکل کر
عجائب گھروں میں، ہزاروں برس بعد کے
زائروں کے لیے راحتِ جاں بنیں گے،
تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہے....؟"
ہنسے، جیسے یہ بات میں نے
انھی کے دلوں سے چرالی!
وہ کہنے لگے: "ہاں یہ خدشہ تو ہے،
آؤ، اس مرنے والے کو پھر سے جلادیں
(مگر اس کے خوابوں کو نابود کردیں)
اسے رینگنے دیں
اسے سالہا سال تک رینگنے دیں!
کہ اس کی نگاہوں میں پھر خواب پیدا نہ ہوں
اسے رینگنے دیں
اسے سالہا سال تک رینگنے دیں
اور آئندہ نسلوں کی جانیں
غمِ آگہی سے بچالیں!

وہی کشفِ ذات کی آرزو

مرے دل گرد، مری جاں گرد!
چلا آ کہ ہے مرا در کھلا
تو مرا نصیب ہے راہرو!
یہ ہوا، یہ برق، یہ رعد و ابر، یہ تیرگی
وہ انتظار کی نارسی
مرے جان و دل یہ ہیں تو بتو،
مرے میہماں، مرے راہرو!

ے گریزپا، تو سراب دشتِ حلانہ بن
وہ نوا نہ بن جو فریبِ راہگزار ہو
وہ فسونِ ارض و سما نہ بن
ے دل گرفتوں سے عار ہو!
ہر تجھے بلاتی ہے پے بہ پے
وہ صدا سلاسلِ جاں کی ہے
وہ صدا مرور زماں کی ہے!
ہے اس صدا سے فرار ہو؟
زلہ رو، مری جاں گرد
ن شکن، تری رو مرد
مجھے بار جاں،

کہ میں حرف جس کا بیاں ہے تو
میں وہ جسم جس کی رواں ہے تو
تو کلام ہے، میں تری زباں
تو وہ شمع ہے کہ میں جس کی لو!

کسی نقش کار کا اک نفس ـــــ
کئی صورتیں جو صدا سے آشنہ رنگ تھیں
ہوئیں وصلِ معنی سے بار ور
کسی بت تراش کی اک نگہ ـــــ
کئی سنگ اذیتِ یاس و مرگ
سے بچ گئے
ہوئے سمتِ راہ سے باخبر!
چلا آ کہ میری ندا میں بھی
وہی رویتِ ازلی کہ ہے
جسے یاد غایتِ رنگ و بو
جسے یاد رازِ مے و سبو
جسے یاد وعدۂ تار و پو!
چلا آ کہ میری ندا میں بھی
اسی کشفِ ذات کی آرزو!

سالگرہ کی رات

آج دروازے کھلے رہنے دو
یاد کی آگ دہک اُٹھی ہے
شاید اس رات ہمارے شہدا آ جائیں
آج دروازے کھلے رہنے دو

جانتے ہو کبھی تنہا نہیں جلتے ہیں شہید ؟
میں نے دریا کے کنارے جو بسیرے دیکھے ہیں
جو چراغوں کی لویں دیکھی ہیں
وہ لویں بولتی تھیں زندہ زبانوں کی طرح
میں نے سرحد پہ وہ نغمات سُنے ہیں کہ جنھیں
کون گائے گا شہیدوں کے سوا ؟
میں نے ہونٹوں پہ تبسم کی نئی تیز چمک دیکھی ہے
نور جس کا تھا حلاوت سے شرابور
اذانوں کی طرح !

ابھی سرحد سے میں لوٹا ہوں ابھی،
میں ابھی ہانپ رہا ہوں مجھے دم لینے دو
راز وہ اُن کی نگاہوں میں نظر آیا ہے
جو ہمہ گیر تھا نادیدہ زمانوں کی طرح !
یاد کی آگ دہک اُٹھی ہے
سب تمناؤں کے شہروں میں دہک اُٹھی ہے
آج دروازے کھلے رہنے دو
شاید اس رات ہمارے شہدا آ جائیں !
وقت کے پاؤں اُلجھ جاتے ہیں آواز کی زنجیروں سے
اُن کی جھنکار سے خود وقت جھنک اُٹھتا ہے
نغمہ مرتا ہے کبھی، نالہ کبھی مرتا ہے کبھی؟
سنسناہٹ کبھی جاتی ہے محبت کے بجھے تیروں سے !

میں نے دریا کے کنارے انھیں یوں دیکھا ہے ___
میں نے جس آن میں دیکھا ہے انھیں

شاید اس رات ہی،

اس شام ہی،

دروازوں پہ دستک دیں گے!

تھہرا لتے سبک پا ہیں کہ جب آئیں گے
نہ کسی سوئے پرندے کو خبر تک ہوگی
نہ درختوں سے کسی شاخ کے گرنے کی صدا گونجے گی
پھڑپھڑاہٹ کسی زنبور کی بھی کم ہی سنائی دے گی

آج دروازے کھلے رہنے دو!

ابھی شہر سے میں لوٹا ہوں ابھی
یار جو گزرے گی اس کا ہمیں غم ہی کیوں ہو؟
یار کیا گزرے گی، [illegible] ___
ایک شب [illegible]

پریشانی آ[illegible] درختوں پہ گرانی [illegible]

روحیں [illegible] یتیم

ان پہ [illegible] جنبائیں بھاری

لوٹے کا [illegible] بستے گھروں سے جاری
بے پناہ خوف میں رو دیلے شکستہ کی فغاں اٹھے گی
بجھتی شمعوں کا دھواں اٹھے گا ___

یار جو گزرے گی معلوم نہیں ___

اپنے دروازے کھلے رہنے دو

اِس پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ

اس پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ
اس پیڑ کا پھیلاؤ زمانوں میں کبھی ہے، آج میں بھی
اس کی جڑیں ہیں
صدیوں سے یہاں لوگ ہر اک سمت سے آتے ہیں
بچھڑتے بھی رہے ہیں
برگد کے تلے قبر پہ (کیا جانیے کیا دفن ہے!)
خوابیدہ ہے اس پیڑ کے نیچے کوئی مجذوب برہنہ
اور پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ!
اے قبر پہ برگد کے تلے سوئے ہوئے شخص
تہمد ترا رانوں سے بہت اونچا اُٹھا ہے
اس راہ سے تاریخ ابھی گذری ہے حافظ کی
غزل گاتی ہوئی
سوکھے ہوئے اعضا پہ ترے ہنستی ہوئی
اب جن کو تناسل سے کوئی کام نہیں ہے!

اے قبر پہ سوئے ہوئے مجذوب تری نیند میں
صحراؤں کی بو باس
آتی ہے تری سانس سے اُس فقر کی آواز
کہ ہے زیر و بم مرگ
وہ مرگ کہ ہے شرم کی تمثیل
افسوس کے دروازے پہ اک عشق سیہ روز
کے مانند پڑا ہے

تو شخص نے پھر نیند کی دلدل میں سے جھانکا
تہمد بھی سنبھالا
اک نعرہ لگایا
حافظ کی غزل جس کی صدا گھر کے کنوئیں میں
سے اٹھی تھی
اس شخص نے پھر اس کو پکارا
پھر سلسلہ خواب جہاں ٹوٹا تھا دوبارہ ملایا
اور ناف کے پُرپیچ مسائل میں ہوا گم

ہاں ناف میں (یا ناف کے پاتال میں) شاید
تجھ کو نظر آجائے کبھی شہر کے آلام کا رعشہ
اس شہر میں اب دیکھنے کو آنکھ، نہ جینے کے
لئے ہاتھ

نہ رونے کے لئے دل!
کچھ لوگوں نے جو قحط کے جلسے پہ کھڑے
دیکھتے تھے
اک گیت، محبت کا نیا گیت سر آغاز کیا ہے
برگد کی طرف آؤ، ذرا ہاتھ بڑھاؤ
گاتے ہوئے لوگو
اے شہر کے پاکیزہ ترینو
نغمے کی حلاوت سے وہ افسوں جو کسی خوف سے
برگد پہ بیٹھا ہے اتارو
اور خوف کو چپ چاپ نکل جانے دو ماضی
کے کنارے
(اس خوف کی ہر لہر میں حافظ کی غزل ہے!)

کیا چیز ہیں برگد کے پرندے
(کیا اُن کی ہم آغوشی کا غل تم نے سُنا ہے؟
ہر گھر کا کنواں اُن کی عنایات سے پر ہے
اور ان کی ہوسناک نگاہوں نے
جوانی کے کئی ہار چُرائے!)
گاتے رہو لوگو!
گاتے رہو یہ گیت کہ ٹوٹے گی حجابات کی
وہ مہر
جو سانسوں پہ لگی ہے
اس گیت سے پھر اپنی جواں عورتوں کے
سینوں پہ مہتاب کھلیں گے
اور پھولوں کے الہام سے
ڈھل جائیں گے پھر صحن ہمارے!

چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے

چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے
کئی لذتوں کا ستم لیے
جو سمندروں کے فسوں میں ہیں
مرا ذہن ہے وہ صنم لیے
وہی ریگ زار ہے سامنے
وہی ریگ زار کہ جس میں عشق کے آئنے
کئی دست غیب سے ٹوٹ کر
رہ تاریاں میں بکھر گئے!
ابھی آرہا ہوں سمندروں کی مہک لیے
وہ مہک لیے جو سمندروں کی نسیم میں
ہے ہزار رنگ سے خواب ہائے خنک لیے
چلا آرہا سمندروں کا نمک لیے

یہ برہنگیٔ عظیم تیری دکھاؤں میں
(جو گداگری کا بہانہ ہے)
کوئی راہرو ہو تو اس سے راہ کی داستاں
میں سنوں، فسانہ سمندروں کا سناؤں میں
(کہ سمندروں کا فسانہ عشق کی گسترش
کا فسانہ ہے)

یہ برہنگی جسے دیکھ کر بڑھیں دست و پا،
نہ کھلے زباں
نہ خیال ہی میں رہے تواں
تو وہ ریگ زار کہ جیسے رہزن پیر ہو

جسے تاب راہزنی نہ ہو
کہ مثال طائرِ نیم جاں
جسے یادِ بال و پری نہ ہو
کسی راہرو سے اُمیدِ رحم و کرم لیئے
میں بھرا ہوا ہوں سمندروں کے جلال سے
چلا آ رہا ہوں میں ساحلوں کا حشم لیئے
ہے ابھی اُنہی کی طرف مرا در دل کھلا
کہ نسیم خندہ نو رہ ملے
مری تیرگی کو نگہ ملے

وہ مسرد درد و سوز صدف ابھی مجھے یاد ہے
ابھی چاٹتی ہے سمندروں کی زباں مجھے
مرے پاؤں چھو کے نکل گئی کوئی موج ساز
بکف ابھی
وہ حلاوتیں مرے ہست و بود میں بھر گئی
وہ جزیرے جن کے اُفق ہجوم سحر سے دیدہ بہار تھے
وہ پرندے اپنی طلب میں جو سرکار تھے
وہ پرندے جن کی صفیر کی جلوتیں مرے خوں میں ہیں
ابھی ذہن ہے وہ صنم لیے
جو سمندروں کے فسوں میں ہیں
چلا آ رہا ہوں سمندروں کے جمال سے
صدف و کنار کا غم لیے

ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اُٹھے

صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے،
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اُٹھے
جسم کے ساحلِ آشفتہ پر اک عشق کا مارا ہُوا
اِنسان ہے آسودہ، مرے دل میں سرِ ریگ تپاں
میں فقط اس کا قصیدہ خواں ہوں!
(ریت پر لیٹے ہوئے شخص کا آوازہ بلند!)
دور کی گندم دمے، صندل وحس لایا ہے
تاک کی شاخ پر اک قافلہ زنبوروں کا!
تاک کی شاخ بھی خوشبوؤں سے بوجھل اُٹھی!
کیسے زنبور ہمیشہ سے تمنّا کے خداؤں کے حضور
سربسجدہ ہیں، مگر مشعل جاں لے کے
ہر اک سمت رواں!

جونہی دن نکلے گا اور شہر
جواں میوہ فروشوں کی پکاروں سے چھلک اُٹھے گا،
میں بھی ہر سو ترے مژگاں کے سفیروں کی طرح
دوڑوں گا!
(دن نکل آیا تو شبنم کی رسالت کی صفیں
تہ ہوں گی
راستے دن کے سیہ جھوٹ سے لد جائیں گے
بھونکنا چھوڑ کے پھر کاٹنے لگ جائیں گے غم
کے کتّے
اور اس شہر کے دلشاد مُسافر، جن پر
اُن کے سایے سے بھی لرزہ طاری،
پیکرِ خواب کے مانند سرِ راہ پلٹ جائیں گے)

رات یُوں چاہا مجھے تو نے کہ میں فرد نہیں
بلکہ آزادی کے دیوانوں کا جمگھٹ ہوں میں؛
رات یوں چاہا تجھے میں نے کہ تو فرد نہ ہو
بلکہ آئندہ ستاروں کا ہجوم —
صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اُٹھے!

اب بھی اک جسم مرے جسم سے پیوستہ ہے
جیسے اس ریت پہ لیٹے ہوئے انسان کا قالب
ہو یہی —
جسم میں جس کا قصیدہ خواں ہوں —
دن نکل آئے گا زنبوروں کی سوغات گل و تاک
کی دہلیز پہ رکھی ہوگی،
وہ اُٹھا لیں گے اسے چومیں گے،

ایسی سوغات گل و تاک پہ کچھ بار نہیں!
انہی زنبوروں کی محنت کے پسینے سے درختوں کو ملی
تاب، کہ رؤیا دیکھیں
کسی دوشیزہ کا رؤیا جسے شیریں لب بار ہو
(زیبائی جہاں بھی ہو سلام —
تیرے ہونٹوں کو دوام!)
رات کے باغوں کی خوشبوؤں کو چھو کر آئے،
زیست کی تازہ دمی، ہست کی ندرت لائے،
اُن کے اک بوسے سے ہر لب میں نمو آئے گی
موت اس شہر سے دزدانہ پلٹ جائے گی

ہم جسم

در پیش ہیں
چشم و لب و گوش
کے بیراے رہے ہیں
کل رات
جو ہم چاند میں
اِس سبزے پہ
اِن سایوں میں
غزلاتے رہے ہیں
کس آس میں
کجلاتے رہے ہیں ؟

اِس "میں" کو
جو ہم جسموں میں
محبوس ہے
آزاد کریں ——
کیسے ہم آزاد کریں ؟
کون کرے ؟ —— ہم ؟
ہم جسم ؟
ہم جسم کہ کل رات
اِسی چاند میں
اِس سبزے پہ
اِن سایوں میں
خود اپنے کو
دہراتے رہے ہیں ؟

کچھ روشنیاں
کرتی رہیں ہم سے
وہ سرگوشیاں
جو حرف سے
یا صوت سے
آزاد ہیں
کہہ سکتی ہیں
جو کتنی زبانوں میں
وہی بات، ہر اِک رات
سدا جسم
جیسے سُننے کو
گوشائے رہے ہیں ——

ہم جسم کبھی
کل رات کے
اِک لمحے کو
دل بن کے
اِسی بات سے
پھر سینوں کو
گرماتے رہے ہیں ——

اس "میں" کو
ہم آزاد کریں ؟
رنگ کی، خوشبوؤں کی
اُس ذات کو
دل بن کے
جیسے ہم کبھی
ہر اِک رات
عزیز لگتے رہے ہیں ؟
یا اپنے توہمات کی
زنجیروں میں
اُلجھاتے رہے ہیں
اُس ذات کو
جس ذات کے
ہم سائے رہے ہیں ؟

جہاں ابھی رات ہے

جہاں ابھی رات ہے، ہوا کے سوا
کوئی زندہ تر نہیں ہے
ابھی ہوا ساحلوں کے بے تاب ہمہموں سے
گزر کے اپنی طلب کے سونے
پہار راہوں میں رک گئی ہے ——
اگر وہ چاہے،
تو دودِ ماضی کے بام و دیوار پھاند جائے
(وہ دستِ دعا کے پرانے زخموں
کی ریزشِ خوں سے
ڈر رہی ہے)
ہوا کشوں کی نگہ سے بچ کر
اگر وہ چاہے،
غموں کی بے صرفہ کھڑکیوں کے
سیاہ شیشوں کو توڑ ڈالے
دلوں کی افسردہ جلوتوں کا سراغ پالے
(وہ ناتوانوں کے زورِ بازو کے
رازِ پنہاں سے کانپتی ہے)

اگر وہ چاہے،
شگافِ در
(جو رات بھر
ہماری بے التفاتیوں سے
کھلے رہے ہیں)
ہمارے صحنوں کو روند ڈالے
ہمارے صحنوں کے چار گوشوں میں پھیل جائے
(مگر وہ ہر صحن کی اداسی کو بھانپتی ہے)
جہاں ابھی رات ہے، وہاں ہم ——
وہاں ابھی لوگ
بہتے پانی کو بوڑھے دانتوں سے کاٹتے ہیں

اور ایسے روتے ہیں خواب میں
جیسے ایک بے جان جسد سے لگ کے
وہ سو رہے ہوں!
ہوا کو اس کی خبر نہیں ہے
ہوا کا ان ہول کے پلوں پر
گزر نہیں ہے!

جہاں ابھی رات ہے، وہاں ہم ——
وہاں ابھی لوگ
آرزوؤں کے نردبانوں پہ چل رہے ہیں
قدم قدم پر پھسل رہے ہیں
کہ جیسے صحرا سمندروں میں پھسل رہا ہو!
جہاں ابھی رات ہے
ہوائے سوا کوئی پردہ در نہیں ہے ——
مگر ہوا جب طلب کی راہوں کو چھوڑ کر پھر
ہمارے دیوار و در پہ بیٹھی
ہمیں پھر اپنی برہنگی کا یقین ہوگا
اور اپنے جسموں کے جیسے ہم
رات کی سیاہی میں دیکھتے ہی
بہت ہنسیں گے!

ن۔م۔ راشد

حسن کوزہ گر۔ ۲

اے جہاں زاد،
نشاط اُس شبِ بے راہ روی کی
میں کہاں تک بھولوں؟
زورِ مے تھا کہ مرے ہاتھ کی لرزش تھی
کہ اُس رات کوئی جام گرا ٹوٹ گیا
تجھے حیرت نہ ہوئی!
کہ ترے گھر کے دریچوں کے کئی شیشوں پر
اِس سے پہلے کی بھی درزیں تھیں بہت
تجھے حیرت نہ ہوئی!
اے جہاں زاد،
میں کوزوں کی طرف، اپنے تغاروں کی طرف
اب جو بغداد سے لوٹا ہوں
تو میں سوچتا ہوں
سوچتا ہوں، تو مرے سامنے آئینہ رہی
سرِ بازار، دریچے میں، سرِ بسترِ سنجاب کبھی
تو مرے سامنے آئینہ رہی

جس میں کچھ بھی نظر آیا نہ مجھے
اپنی ہی صورت کے سوا
اپنی تنہائی جانکاہ کی دہشت کے سوا!
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور وہ آئینہ مرے ہاتھ میں ہے
اس میں کچھ بھی نظر آتا نہیں
اب ایک ہی صورت کے سوا!
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور مجھے لکھنا بھی کہاں آتا ہے؟
لوحِ آئینہ پہ اشکوں کی پھواروں ہی سے
خط کیوں نہ لکھوں؟

اے جہاں زاد
نشاط اس شبِ بے راہ روی کی
مجھے پھر لائے گی
وقت کیا چیز ہے تو جانتی ہے؟
وقت اک ایسا پتنگا ہے
جو دیواروں پہ، آئینوں پہ،
پیمانوں پہ، شیشوں پہ سدا رینگتا ہے
لوٹ آئے گا حسن کوزہ گر سوختہ جاں بھی شاید
رینگتے وقت کے مانند کبھی!
اب جو لوٹا ہوں جہان زاد، تو میں سوچتا ہوں
شاید اس جھونپڑے کی چھت پہ یہ مکڑی مری محرومی کی

جیسے تنتی چلی جاتی ہے وہ جالا تو نہیں ہوں میں بھی ؟
یہ — یہ جھونپڑا میں جس میں پڑا سوچتا ہوں
میرے افلاس کے روندے ہوئے اجداد کی
بس ایک نشانی ہے یہی
ان کے فن، ان کی معیشت کی کہانی ہے یہی
میں جو لوٹا ہوں تو وہ سوختہ بخت
آ کے مجھے دیکھتی ہے

دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے
میرے اِس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں !
کھیل اک سادہ محبت کا
(شب و روز کے اِس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں جو کبھی
کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر کبھی گا لیتے ہیں
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں
دل کے جینے کے بہانے کے سوا کچھ بھی نہیں !
حرف سرحد ہیں جہاں زاد، معانی سرحد
عشق سرحد ہے جوانی سرحد
اشک سرحد ہیں تبسم کی روانی سرحد
دل کے جینے کے بہانے کے سوا کچھ بھی نہیں !
(دردِ محرومی کی سرحد بھی کہیں ہے کہ نہیں ؟)

میرے اِس جھونپڑے میں
کتنی ہی خوشبوئیں ہیں

جو مرے گرد سدا رینگتی ہیں
اُسی اک رات کی خوشبو کی طرح رینگتی ہیں
در و دیوار سے لپٹی ہوئی اِس گرد کی خوشبو بھی ہے
ان تغاروں میں خیالوں کی نئی مٹی کی خوشبو بھی ہے
میرے افلاس کی، تنہائی کی، یادوں کی،
تمناؤں کی خوشبوئیں بھی
پھر بھی اس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں —
یہ مرا جھونپڑا تاریک ہے، گندہ ہے، پراگندہ ہے
ہاں کبھی دُور درختوں سے پرندوں کی صدا آتی ہے
کبھی انجیروں کے، زیتونوں کے باغوں کی مہک
آتی ہے
تو میں جی اٹھتا ہوں
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کر نکلا!
ورنہ اِس گھر میں کوئی سیج نہیں، عطر نہیں ہے،
کوئی پنکھا بھی نہیں،
تجھے جس عشق کی خُو ہے
مجھے اس عشق کا یارا بھی نہیں!

تو ہنسے گی اے جہاں زاد، عجب بات
کہ جذبات کا حاتم بھی ہیں
اور اشیا کا پرستار بھی ہیں
اور ثروت جو نہیں اُس کا طلب گار بھی ہیں!
تو جو ہنستی رہی اُس رات تذبذب پہ مرے

میری دو رنگی پہ پھر سے ہنس دے !
عشق سے کس نے مگر پایا ہے کچھ اپنے سوا ؟
اے جہاں زاد،
ہے ہر عشق سوال ایسا کہ عاشق کے سوا
جس کا نہیں کوئی جواب
یہی کافی ہے کہ باطن کی صدا گونج اٹھے !
اُسی اک ذاتِ شناسا کی تگاپو ہے مجھے
جو مرے فن میں ٹھہری ہوئی صدیوں کے کنارے رددی
وہی اک ایسی حقیقت ہے جو آئینہ ہے۔
میرے کوزوں کے بگڑتے ہوئے بنتے ہوئے چہروں میں نہاں
جو ہر اِک فن کا، ہر اک فن کے پرستار کا آئینہ ہے
اُسی اک ذاتِ شناسا کی تگاپو ہے مجھے !
میرے آغوش سے تو دُور نہ تھی
یہ حقیقت مرے آغوش سے ہے دُور ابھی
کب مری وحشتِ خونیں مجھے آزاد کرے
اور میں ذات کے اس کشت میں دَم لینے لگوں
جس سے ہر عشق کا آغاز ہوا
جس سے ہر بوسے کا
ہر راز کا آغاز ہوا۔

سفرنامہ

اُسے ضد کہ نور کے ناشتے میں
شریک ہوں!
ہمیں خوف تھا سحرِ ازل
کہ وہ خود پرست نہ روک لے
ہمیں اپنی راہ دراز سے
کہیں کامرانیٔ نو کے عیش و سرور میں
ہمیں روک لے
نہ خلا کے پہلے جہاز سے
جو زمیں کی سمت رحیل تھا!

ہمیں یہ خبر تھی بیان و حرف کی خو اُسے
ہمیں یہ خبر تھی کہ اپنی صوتِ گلو اُسے
ہے ایک مشے سے عزیز تر
ہمیں اور کتنے ہی کام تھے (تمہیں یاد ہے؟)
ابھی پاسپورٹ لیے نہ تھے
ابھی ریزگاری کا انتظار تھا
سوٹ کیس بھی ہم نے بند کئے نہ تھے
اُسے ضد کہ نور کے ناشتے میں شریک ہوں!

وہ تمام ناشستہ
اپنے آپ کی گفتگو میں لگا رہا:
"ہے مجھے زمیں کے لیے خلیفہ کی جستجو
کوئی نیک خو
جو مرا ہی عکس ہو ہو بہو!"
تو اُمیدواروں کے نام ہم نے لکھ دیئے
اور اپنا نام بھی ساتھ اُن کے بڑھا دیا!
"مری آرزو ہے شجر حجر
مری راہ میں شب و روز
سجدہ گزار ہوں —
مری آرزو ہے کہ خشک و تر
مری آرزو میں نزار ہوں —
مری آرزو ہے کہ خیر و شر
مرے آستاں پہ نثار ہوں —
مری آرزو — مری آرزو —"
شجر و حجر تھے نہ خشک و تر
نہ ہمیں تھی ہستی خیر و شر
ہمیں کیا خبر؟

تو تمام ناشستہ چُپ رہے
وہ جو گفتگو کا دھنی تھا
آپ ہی گفتگو میں لگا رہا!

بڑی بھاگ دوڑ میں
ہم جہاز پکڑ سکے
اسی انتشار میں کتنی چیزیں
ہماری عرش پہ رہ گئیں
وہ تمام عشق — وہ حوصلے
وہ مسرّتیں — وہ تمام خواب
جو سوٹ کیسوں میں بند تھے!

میں کیا کہہ رہا تھا؟

میں تنہائی میں کہہ رہا تھا
پرندوں سے باتیں ——
میں یہ کہہ رہا تھا:
"پرندو، نئی حمد گاؤ
کہ وہ بول جو اک زمانے میں
کبوتروں کی باہوں پہ اُڑتے ہوئے
باغ کے آخری موسموں تک پہنچتے تھے
اب راستوں میں پھسلنے لگے ہیں
نئی حمد گاؤ!"
پرندے، لگاتار، لیکن ——
پرندے ہمیشہ سے اپنے ہی عاشق ——
سراسر وہی آسماں چیختے تھے!

میں یہ کہہ رہا تھا:
"گنہ گار دل!
کون جانے کہ کس ہاتھ نے
ہمیں اپنی یادوں کی لمبی قطاروں
کی زنجیر میں
کب سے بے دست و پا کر دیا ہے؟
وہ ماضی، کبھی ہانپتے تھے
جو گھوڑوں کے مانند
اب نا فراموش گاری کے صحنوں میں
لنگڑا رہے ہیں!"

میں یہ کہہ رہا تھا:
"مرے عشق کے سامنے
جنتری کے ورق
اب زیادہ نہ پلٹو
کہ یہ آئنوں کے طلسموں کے مانند
تاریخ کو بار ہا رٹ چکی ہے،
مگر دل کا تنہا پیمبر
کبھی اپنی ہی گونج بن جائے
ممکن نہیں ——
وہی میرے دل کا پیمبر
کہ جس نے دیا ایسا روشن کیا
کہ راتوں کی نیندیں اُچٹنے لگیں
وہ خود کو الٹ کر پلٹ کر پرکھنے لگیں ——"

میں یہ کہہ رہا تھا:
"سناتی ہیں جب شہر میں تتلیاں
اپنی جنتی کی معصوم باتیں
تو جنگل کے (ابھی مقدس درختوں
کے ریشوں میں اُلجھے ہوئے)
کیوں اُگلتے ہیں دن رات
آیات کی ذربہی
کہ ان تتلیوں کے گنہ گار، معصوم دل
سہم جائیں؟"

میں یہ کہہ رہا تھا:
"درختو، ہواؤں کو تم کھیل جانو
تو جانو ــــــ
مگر ہم ــــ نہیں جانتے بوڑھے سبزوں
کی دعوت کو جاتے ہوئے
ذہن کے رہگزاروں میں کیسے
نئے دن کی دُزدیدہ آہٹ کبھی سُن سکیں گے؟
نہیں صرف پتھر ہی بے غم ہے پتھر کی ناتشنگی پر!
درختو، ہوا کتنی تیزی سے گزری
تمہارے برہنہ بدن سے
کہ اس میں روایات
سرگوشیاں کر رہی تھیں
درختو، بھلا کس لیے نام اپنا
کئی بار دہرا رہے ہو؟
یہ شیشم، یہ شم شی، یہ شی شی ی ی ی ــــ
مگر تم کبھی شی ی ی ر ــــ بھی کہہ سکو گے؟"
میں یہ کہہ رہا تھا ــــ

نیا ناچ

میں کھڑا ہوں کئی صدیوں سے
کسی سوکھے ہوئے خوشۂ گندم کے تلے
(صبح جس کی سرِ آدم سے ہوئی)
اے خدا، اپنی سیہ آنکھوں کے سیلاب
سے پھر دھو ڈال مجھے
کہ میں پھر آگے بڑھوں ــــ
اِس سے پہلے کہ ترے گیسوؤں کی تاب
یہ جم جائے اساطیر کی گرد
اِس سے پہلے کہ نکل جائے
تجھے اپنا ہی درد
اے خدا، پھر سے انڈیل
میرے اس خالی پیالے میں
گناہوں کی شراب
تاکہ ایمان کے آنکھوں سے نہاں باغوں میں
انہی لوگوں کے شگوفوں کا وہ غوغا اٹھے پھر
انہی ریحانوں کی خوشبوؤں کا بلوا پھوٹے
ابتدا جس کی کبھی
بسترِ آدم سے ہوئی!

میں کھڑا ہوں کئی صدیوں سے خدا،
اور مرے ہاتھوں کی گہرائی سے
پھر مہ و سال کی فریاد سنائی دی ہے
یہی فریاد سنی تھی
کہ ابھی ہاتھوں کی دارائی سے
میں نے الفاظ کی ــــ احباب کی ــــ
اک بزم سجا ڈالی تھی
جو بہت بڑھتی گئی ــــ بڑھتی گئی ــــ
بڑھتی چلی جائے گی ــــ
کیسی اک بزم سجا ڈالی تھی!
اے خدا، تو بھی ذرا
اپنے گِل و لا سے اٹے جوتے اتار
اور اس بزم میں آ
تاکہ الفاظ ــــ یہ احباب ــــ
جو چوہوں کی طرح ہاتھ نہیں آتے ہیں
پھر ترے پاؤں کی ہر تاب کے ساتھ
ــــ اپنے مہجور معانی سے بغل گیر
نیا ناچ رچائیں ــــ
نیا ناچ رچائیں!

مجھے وداع کر

مجھے وداع کر
اے مری ذات، پھر مجھے وداع کر
وہ لوگ کیا کہیں گے، مری ذات،
لوگ جو ہزار سال سے
مرے کلام کو ترس گئے؟
مجھے وداع کر،
میں تیرے ساتھ
اپنے آپ کے سیاہ غار میں
بہت پناہ لے چکا
میں اپنے ہاتھ پاؤں
دل کی آگ میں تپا چکا!

مجھے وداع کر
کہ آب و گِل کے آنسوؤں
کی بے صدائی سُن سکوں
حیات و مرگ کا سلام روستائی سُن سکوں!

مجھے وداع کر
بہت ہی دیر — دیر جیسی دیر ہو گئی
کہ اب گھڑی میں بیسویں صدی کی رات بج سکی
شجر حجر وہ جانور وہ طائرانِ خستہ پر
ہزار سال سے جو نیچے ہال میں زمیں پر
مکالمے میں جمع ہیں
وہ کیا کہیں گے؟ میں خداؤں کی طرح —
ازل کے بے وفاؤں کی طرح
پھر اپنے عہدِ ہمدمی سے پھر گیا؟
مجھے وداع کر، اے مری ذات

تو اپنے روزنوں کے پاس آکے دیکھ لے
کہ ذہنِ ناتمام کی مساحتوں میں پھر
ہراس کی خزاں کے برگِ خشک یوں بکھر
گئے
کہ جیسے شہرِ بستہ میں
یہ نیستی کی گرد کی پکار ہوں —
لہو کی دلدلوں میں
حادثوں کے زہر پہ اتر گئے!
تو اپنے روزنوں کے پاس آکے دیکھ لے
کہ مشرقی افق پہ عادتوں کے خواب —
خوابِ قہوہ رنگ میں —
امید کا گزر نہیں!
کہ مغربی افق پہ مرگِ رنگ و نور پر
کسی کی آنکھ تر نہیں!

مجھے وداع کر
مگر نہ اپنے زینوں سے اتر
کہ زینے جل رہے ہیں بے ہشی کی آگ میں
مجھے وداع کر، مگر نہ سانس لے
کہ رہبرانِ نو
تری صدا کے سہم سے ٹھٹک نہ جائیں
کہ تو سدا رسالتوں کا بار ان پہ ڈالتی رہی
یہ بار ان کا ہول ہے
وہ دیکھ، روشنی کے دوسری طرف
خیال — کاغذوں کی بالیاں بنے ہوئے
حروف — بھاگتے ہوئے
تمام اپنے آپ ہی کو چاٹتے ہوئے
جہاں زمانہ تیز تیز گامزن
وہیں یہ سب زمانہ باز
اپنے کھیل میں مگن
جہاں یہ بام و در لٹک رہے ہیں
بارشوں کی سمت

آرزو کی تشنگی لیے
وہیں گماں کے فاصلے ہیں راہزن

مجھے وداع کر
کہ شہر کی فصیل کے تمام در ہیں وا ابھی
کہیں وہ لوگ سو نہ جائیں
بوریوں میں ریت کی طرح —
مجھے، اے میری ذات،
اپنے آپ سے نکل کے جانے دے
کہ اس زباں بریدہ کی پکار — اس کی
ہاؤ ہو —
گلی گلی سنائی دے
کہ شہرِ نو کے لوگ جلتے ہیں
(کاسۂ گرسنگی لیے)
کہ اُن کے آب و نان کی جھلک ہے
کون ؟
میں اُن کے سیم و زر سے — اُن کے
جسم و جاں سے —
کولتار کی تہیں ہٹاؤں گا
تمام سنگ پارہ ہائے برف
اُن کے آستاں سے میں اُٹھاؤں گا
اُنہی سے شہرِ نو کے راستے تمام بند ہیں —

مجھے وداع کر
کہ اپنے آپ میں
میں اتنے خواب جی چکا
کہ حوصلہ نہیں
میں اتنی بار اپنے زخم آپ سی چکا
کہ حوصلہ نہیں —

آ لگی ہے ریت

آ لگی ہے ریت دیواروں کے ساتھ
سارے دروازوں کے ساتھ
سُرخ اینٹوں کی چھتوں پر رینگتی ہے
نیلی نیلی کھڑکیوں سے جھانکتی ہے
ریت ـــــ رُک جا
کھیل تو کر لیں
سنہرے تاش کے پتّوں سے
درزوں، روزنوں کو بند کر لیں
ریت
رُک جا!
سُست برساتیں کہ جن پر دوڑ پڑنا،
جن کو دانتوں میں چبا لینا
کوئی مشکل نہ تھا
تو نے وہ ساری نگل ڈالی ہیں رات ـــ
رات ہم سنتے رہے، اے ریت
تو دیوانی بلی تھی جو اپنی دم کے پیچھے
گھومتی جاتی تھی

اُس کو چاٹتی جاتی تھی رات!
ریت کی ایک عمر ہے اک وقت ہے
لیکن ہمیں
خود سے جُدا کرتی چلی جاتی ہے ریت
ناگہاں ہم سب پہ چھا جانے کی خاطر
یہ ہماری موت بن کر تازہ کر دیتی ہے
یادیں دُور کی (یا دیر کی)
ریت کو مٹھی میں لے کر دیکھتے ہیں
اپنی پوروں سے اسے چھنتے ہوئے
ہم دیکھتے ہیں

نہیں مجھے دوئی کا واہمہ نہیں
کہ اب بھی ربطِ جسم و جاں کا اعتبار ہے مجھے
یہی وہ اعتبار تھا کہ جس نے مجھ کو "آپ" میں سمو دیا ۔۔
میں سب سے پہلے "آپ" ہوں
اگر نہیں ہوں، تو ہوا اور میں ہوں، پھر بھی میں
ہر ایک شے سے پہلے "آپ" ہوں!
اگر میں زندہ ہوں، تو کیسے "آپ" سے دغا کروں؟
کہ تیرے جیسی عورتیں، جہان زاد،
ایسی الجھنیں ہیں،
جن کو آج تک کوئی نہیں سلجھ سکا،
جو میں کہوں کہ میں سلجھ سکا تو سر بسر
فریب اپنے آپ سے!
کہ عورتوں کی ساخت ہے وہ طنز اپنے آپ پر
جواب جس کا ہم نہیں،
جواب جس کا میں نہیں!

لبیب کون ہے تمام رات جس کا ذکر تیرے لب پہ تھا؟
وہ کون تیرے گیسوؤں کو کھینچتا رہا
لبوں کو نوچتا رہا
جو میں کبھی نہ کر سکا؟
نہیں، یہ سچ ہے، میں ہوں یا لبیب ہو
رقیب ہو تو کس لیے
تری خود آگہی کی بے بہا نشاطِ ناب کا

جو صد نوا و یک نوا خرامِ صبح کی طرح ؟
لبیب ہر نوائے ساز گار کی نفی سہی !

مگر ہمارا رابطہ، وصالِ آب و گِل نہیں، نہ تھا کبھی،
وجودِ آدمی سے آب و گِل سدا برون رہے،
نہ ہر وصالِ آب و گِل سے کوئی جام یا سبو ہی بن سکا
جو اِن کا ایک واہمہ ہی بن سکے تو بن سکے !
جہان زاد،
ایک میری بد نصیب، ایک تُو اور ایک میں
یہ تین زاویے کسی مثلثِ قدیم کے
ہمیشہ گھومتے رہے
کہ جیسے میرا چاک گھومتا رہا
مگر نہ اپنے آپ کا کوئی سراغ پا سکے ـــ
مثلثِ قدیم کو میں توڑ دوں، جو تو کہے،
مگر نہیں،
جو سحر مجھ پہ چاک کا، وہی ہے اِس مثلثِ قدیم کا !
یہ زندگی وہ چاک ہے کہ جس پہ گھومتے ہیں ہم
نگاہیں میرے چاک کی جو مجھ کو دیکھتی ہیں
گھومتے ہوئے
تو دیکھتا ہوں جان و جسم، اک عجیب بے بسی
میں ڈھل گئے
سبو و جام پر ترا بدن، ترا ہی رنگ،
تیری نازکی برس پڑی

وہ کیمیاگری ترے جمال کی برس پڑی
میں ڈر گیا!
مرے دروں کی خلق یوں گلی گلی نکل پڑی
کہ جیسے صبح کی اذاں سُنائی دی!
تمام کوزے بنتے بنتے "تو" ہی بن کے رہ گئے!
نشاطِ اُس وصالِ رہگذر کی ناگہاں مجھے نگل گئی۔
یہی پیالہ و صُراحی و سبو کا مرحلہ ہے وہ
کہ جب خمیرِ آب و خاک سے جدا ہوئے
تو ایک سمتِ راہِ نو کی شاد کامیاں ملیں!
[میں اِک غریب کوزہ گر
یہ انتہائے معرفت،
یہ ہر پیالہ و صراحی و سبو کی
اشتہائے معرفت!
مجھے ہو اِس کی کیا خبر؟]

جہان زاد،
انتظار آج بھی مجھے ہے کیوں
جو نو برس کے دورِ ناسزا میں تھا؟
اب انتظار آنسوؤں کے دَجلہ کا
نہ گمرہی کی رات کا —
[شب گنہ کی لذتوں کا اتنا ذکر کر چکا
وہ خود گناہ بن گئیں!]
حَلب کی کارواں سرا کے حوض کا، نہ موت کا

نہ اپنی اس شکست خوردہ ذات کا
اک انتظارِ بے زباں کا تار ہے بندھا ہوا !

کبھی جو چند ثانیے زمانِ بے زماں میں آکے رُک گئے
تو وقت کا یہ بار میرے سر سے بھی اتر گیا،
تمام رفتہ و گذشتہ صورتوں، تمام حادثوں
کے سُست قافلے
مرے دروں میں جاگ اُٹھے،
مرے دروں میں اِک جہانِ بازیافتہ کی
تازہ ریل پیل جاگ اٹھی
بہشت جیسے جاگ اُٹھے
خدا کے لاشعور میں !
میں جاگ اُٹھا، غنودگی کی ریت پر پڑا ہوا
غنودگی کی ریت پر پڑے ہوئے
وہ کوزے جو مرے وجود سے بروں
تمام ریزہ ریزہ ہو کے رہ گئے تھے
میرے نو برس کے اپنے آپ سے
فراق میں
وہ پھر سے ایک "کُل" بنے نوائے سازگار کا
وہ پھر سے ایک رقصِ بے زماں بنے
وہ رویّتِ ازل بنے !

اندھا کباڑی

شہر کے گوشوں میں ہیں بکھرے ہوئے
پا شکستہ سر بُریدہ خواب
جن سے شہر والے بے خبر!
گھومتا ہوں شہر کے گوشوں میں روز و شب
کہ اُن کو جمع کر لوں
دل کی بھٹی میں تپاؤں
جس سے چھُٹ جائے پُرانا میل
اُن کے دست و پا پھر سے اُبھر آئیں
چمک اُٹھیں لب و رخسار و گردن
جیسے نو آراستہ دولھوں کے دل کی حسرتیں
پھر سے اِن خوابوں کو سمتِ رہ ملے!

"خواب لے لو خواب ——"
صبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا ——
"خواب اصلی ہیں کہ نقلی؟"
یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے اُن سے بڑھ کر
خواب داں کوئی نہ ہو!
خواب گر میں بھی نہیں
صورت گرِ ثانی ہوں بس ——
ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں!

شام ہو جاتی ہے
میں پھر سے لگاتا ہوں صدا ——
"مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب ——"
"مفت" سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ
اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ ——
"دیکھنا یہ "مفت" کہتا ہے
کوئی دھوکا نہ ہو؟

ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو؟
گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں
یا پگھل جائیں یہ خواب؟
بھک سے اڑ جائیں کہیں
یا ہم پہ کوئی سحر کر ڈالیں یہ خواب ——
جی نہیں کس کام کے؟
ایسے کباڑی کے یہ خواب
ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب!"

رات ہو جاتی ہے
خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر
منہ بسورے لوٹتا ہوں
رات بھر پھر بڑبڑاتا ہوں
"یہ لے لو خواب ——
اور لے لو مجھ سے ان کے دام بھی ——
خواب لے لو، خواب ——
میرے خواب ——
خواب —— میرے خواب ——
خوااا ب ——
ان کے دااام بھی ی ی ی ——"

ن ۔ م ۔ راشد

بات کر

بات کر مجھ سے
مجھے چہرہ دکھا میرا، کہ ہے
تیری آنکھوں کی تمازت ہی سے یہ جُھلسا ہوا!

بات کر مجھ سے،
مرے رُخ سے ہٹا پردہ
کہ جس پر ہے ریاکاری کے رنگوں
کی دھنک پھیلی ہوئی

وہ دھنک جو آرزومندی کا آئینہ نہیں۔
تو نے دیکھا تھا کہ کل میں (اِک گداگر)
صبح کی دیوار کے سائے تلے ٹھٹھرا ہوا پایا گیا
تیری آنکھیں تیرے لب تکتے رہے
اُن کی گرمی پر یقیں کیسے مجھے آتا کہ میں
اپنے دل کے حادثوں کی تہہ میں تھا
یادوں سے غزلایا ہوا!

بات کر مجھ سے

کہ اب شب کے سحر بننے میں کوئی فاصلہ باقی نہیں
بات کر مجھ سے کہ تیری بات
خطِ نسخ ہو بروئے مرگ
اب اُتر جا چشم و گوش و لب کے پار
اُجڑے شہروں کی گذرگاہوں پہ آوازوں
کی قندیلیں اُتار
راز کی لہریں اُبھر آئیں قطار اندر قطار

ن ۔م ۔ راشد

نیا آدمی

نوا اور سازِ طرب ـــــ

یہ سازِ طرب میں نوائے تمنّا
نوائے تمنّا پہ کوچے کے لڑکوں کے پتّھر
یہ پتّھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سرور!

نئی آگ، دل ـــ

دلِ ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور
نئی آگ سب سے مقدّس ہمیں
اسے آج کس کس کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھائیں:
نئی آگ کے کس کو معنی سُجھائیں؟
نئی آگ ہر چشم و لب کا سرور
نئی آگ سب کا سرور!

روایت، جنازہ ـــ

خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا!

جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب
ریا کار لوگوں کو شور و شغب کا سرور!

نئے آدمی کا نزول ـــــ
اور اس پر غضب کا سرور
[نئے آدمی کی اس آمد سے پہلے
مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں
ـ زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیے ـــ]
نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی
اور اس پہ پرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں
فغاں کا غضب اور غضب کا سرور!

نئے آدمی کا ادب ـــ
ادب اور نیا آدمی
نئے آدمی کی طلب کا سرور
نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں، جن کا پایاں نہیں
گمانوں میں دانش، برہنہ درختوں میں بادِ نسیم
برہنہ درختوں کے دل چیرتی
نئے آدمی کا ادب
اور نئے آدمی کو ادب کا سرور!

زنجبیل کے آدمی

مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو
کبھی ذبح خانے کی تیز بو
کبھی عورتوں کی اُبلتی لاشوں کی تیز بو
کبھی مرگھٹوں میں کباب ہوتے ہوئے سَروں کی
دبیز بو

وہ دبیز ایسی کہ آپ چاہیں تو
تیغِ تیز سے کاٹ دیں
مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو،
کہ مجھی کو قتل کیا ہو جیسے کسی نے
شہر کے چوک میں!

یہی چوک تھا ــــــ
یہی وہ مقام تھا، ناگہاں
کسی خوف سے میں جسد سے اپنے لپٹ گیا
(کہیں تھا کبھی میرا جسد مگر؟)
مرے آنسوؤں کی لڑی زمیں پہ بکھر گئی
مری "ہیک ہیک" نہ تھم سکی ــــ
کبھی سائے آ کے سکڑ گئے
کبھی اور بڑھتے چلے گئے
کہ وہ اپنے جبر کے محوروں کے سوا نہ تھے
کسی اور راہ سے باخبر!
مری سسکیاں کسی بے صدائی کے ناگہاں
میں اُتر گئیں ــــ

ابھی چاند دفن تھا بادلوں کے مزار میں
وہیں میں نے نفسِ فریب کار کا سر، بدن
سے اڑا دیا
وہیں میں نے اپنی خودی کی پیرہ زنِ خمیدہ کمر
کی جان دبوچ لی ــ ــ
وہ کوئی برہنہ و مرگ رنگ صدا اُٹھی
جس کا سُراغ پا کے میں چل پڑا ــــ
وہ صدا جو مسخرہ پن میں مجھ سے کبیر تر
وہ صدا جو مجھ سے شریر تر
کسی فلسفے میں رچی ہوئی وہ چڑیل ــــــ
احمق و تُند خو ــــــ
نئے ریگ زاروں میں، فاتحوں کے جہانِ پیر میں

گھومتی ہوئی سو بہ سو

نئے استخوانوں کے آستانوں کی راہ جو ——

(مُسرتوں کو ڈھانپو کہ اِن پر ابھی زندگی کی لکد کوب ہے
اُن ہزاروں برس کے نشاں ہیں : جو گندرے نہیں ہیں، کہ ننگے
مسرتوں کی دعوت سے بڑھ رہے ہیں ہمیشہ سے اُن پر روایات
کے لعد کے تازیانے ادراک کے سوا اُن جواں ترکیلے دماغوں کی
کرنوں کے نیزے، جو معقول و منقول دونوں سے خود کو الگ ——
کر چکے ہیں؛ مسرتوں کو ڈھانپو کہ اب تک وہ کودن
بھی موجود ہیں جن کا ایماں ہے غوغا دکستار و امردپرستی
سے وہ بادشاہت ملے گی کہ جس کو وہ برباد کرنے میں مختار
ہوں گے؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کی جنّت کے اُلٹے چھپّر کھٹ
میں کابوس کی مکڑیاں اُن کی مچھردانیاں بُن رہی ہیں، وہ جنّت
کہ جس میں کسالت کے دن رات نعروں کی رونق سے زندہ
رہیں گے ——)

کئی بار میں نے —— نکل کے چوک سے
—— سعی کی
کہ میں اپنی سھوتوں کی میلی وردی اُتار دوں
نئے بولتے ہوئے آدمی کے نئے الم میں شریک
ہوں
میں اُسی کے حسن میں، اُس کے فن میں اُسی
کے دم میں شریک ہوں

میں اُسی کے خوابوں، اُسی کے معنیٔ تہہ بہ تہ
اُنہی کے بڑھتے ہوئے کرم میں شریک ہوں
وہ تمام جو ہے —— وہ شاہ دولا کے
ارجمند ——
ہر ایک بار اُچھل پڑے —— مرے خوف
مرے جسم و جاں پہ اُبل پڑے!

تو عجیب بات ہے، میں اگر
ہمہ تن نشاطِ غرور ہوں؟
شبِ انتقام کی آگ میں ہوں جلا ہوا؟
کہ فنا پرست کدورتوں میں رچا ہوا؟
سنو اے جنگ جوؤ، سپاہیو
مری آرزو کی شرافتوں کو دغا نہ دو
میں اگر دھک کے دامنِ کوہ تک جو پہنچ گیا
تو یہ ڈر ہے —
زندہ چتاؤں میں تمہیں — کہ تم
ہو تمام "شیرۂ زنجیل کے آدمی"!
مری بے بسی پہ ہنسو گے تم تو ہنسا کرو —
میں دعا کروں گا:

خدائے رنگ و صدا و نور
تو ان کے حال پہ رحم کر!

(خدا،
رنگِ نو، نور و آوازِ نو کے خدا!
خدا،
وحدتِ آب کے عظمتِ باد کے
رازِ نو کے خدا!
قلم کے خدا، سازِ نو کے خدا!
تبسم کے اعجازِ نو کے خدا! —)

گماں کا ممکن ــــ جو تو ہے میں ہوں

کریم سورج،
جو ٹھنڈے پتھر کو اپنی گولائی
دے رہا ہے
(وہ ٹھنڈا پتھر جو میرے مانند
کھوئے سبزوں میں
دو رِ ریگ و ہوا کی یادوں میں لوٹتا ہے)
جو بہتے پانی کو اپنی دریا دلی کی
سرشاری دے رہا ہے
ــــ وہی مجھے جانتا نہیں ہے
مگر مجھی کو یہ وہم شاید
کہ آپ اپنا ثبوت اپنا جواب ہوں میں!
مجھے وہ پہچانتا نہیں ہے
کہ میری دھیمی صدا
زمانے کی جھیل کے دوسرے کنارے
سے آ رہی ہے

یہ جھیل وہ ہے کہ جس کے اوپر
ہزاروں انساں
افق کے متوازی چل رہے ہیں
افق کے متوازی چلنے والوں کو پار لاتی ہیں
وقت لہریں ــــ
جنھیں تمنّا، مگر، سمادی خرام کی ہو
انہی کو پاتال زمزموں کی صدا سناتی ہیں
وقت لہریں
انھیں ڈبوتی ہیں وقت لہریں!
تمام ملّاح اِس صدا سے سدا ہراساں، سدا
گریزاں
کہ جھیل میں اک عمودکا چور چھپ بیٹھا ہے
اُس کے گیسو افق کی چھت سے لٹک رہے ہیں ــــ
پکارتا ہے: "اب آؤ، آؤ!
ازل سے میں منتظر تمہارا ــــ
میں گنبدوں کے تمام رازوں کو جانتا ہوں
درخت، مینار، برج، زینے مرے ہی ساتھی
مرے ہی متوازی چل رہے ہیں

میں ہر ہوائی جہاز کا آخری بسیرا
سمندروں پر جہاز رانوں کا میں کنارا
اب آؤ، آؤ!
تمہارے جیسے کئی فسانوں کو میں نے اُن کے
اَبد کے آغوشش میں اُتارا!
تمام ملّاح اُس کی آواز سے گریزاں
اُفق کی شاہراہ مبتذل پر تمام سہمے ہوئے
خراماں ـــــــ
مگر سماوی خرام والے
جو پست و بالا کے آستاں پر جمے ہوئے ہیں
عمود کے اس طناب ہی سے اُتر رہے ہیں
اِسی کو تھامے ہوئے بلندی پر چڑھ رہے ہیں!

اسی طرح میں بھی ساتھ اِن کے اُتر گیا ہوں
اور ایسے ساحل پر آ لگا ہوں
جہاں خدا کے نشان پانے پناہ لی ہے
جہاں خدا کی ضعیف آنکھیں
ابھی سلامت بچی ہوئی ہیں
یہی سماوی خرام میرا نصیب نکلا
یہی سماوی خرام جو میری آرزو تھا ـــــــ

مگر نجانے
وہ راستہ کیوں چُنا تھا میں نے
کہ جس پہ خود سے وصال تک کا گماں
نہیں ہے؟
وہ راستہ کیوں چُنا تھا میں نے
جو رک گیا ہے دلوں کے ابہام کے کنارے؟
وہی کنارا کہ جس کے آگے گماں کا ممکن
جو تو ہے میں ہوں!

مگر یہ سچ ہے،
میں تجھ کو پانے کی (خود کو پانے کی) آرزو
میں نکل پڑا تھا
اُس ایک ممکن کی جستجو میں
جو تو ہے میں ہوں
میں ایسے چہرے کو ڈھونڈتا تھا
جو تو ہے میں ہوں
میں ایسی تصویر کے تعاقب میں گھومتا تھا
جو تو ہے میں ہوں

میں اس تعاقب میں کتنے آغاز گن چکا
ہوں

(میں اُس سے ڈرتا ہوں جو یہ کہتا
ہے مجھ کو اب کوئی ڈر نہیں ہے)
میں اس تعاقب میں کتنی گلیوں سے،
کتنے چوکوں سے،
کتنے گونگے مجسّموں سے، گزر گیا ہوں
میں اس تعاقب میں کتنے باغوں سے،
کتنی اندھی شراب راتوں سے،
کتنی باہوں سے،
کتنی چاہت کے کتنے بپھرے سمندروں سے
گزر گیا ہوں
میں کتنی ہوش و عمل کی شمعوں سے،
کتنے ایماں کے گنبدوں سے
گزر گیا ہوں
میں اس تعاقب میں کتنے آغاز کتنے
انجام گن چکا ہوں —
اب اس تعاقب میں کوئی در ہے
نہ کوئی آتا ہوا زمانہ
ہر ایک منزل جو رہ گئی ہے
فقط گزرتا ہوا فسانہ
تمام رستے، تمام بوجھے سوال، بے وزن
ہو چکے ہیں

جواب، تاریخ روپ دھارے
بس اپنی تکرار کر رہے ہیں —
"جواب ہم ہیں — جواب ہم ہیں —
ہمیں یقین ہے جواب ہم ہیں —"
یقیں کو کیسے یقیں سے دہرا رہے ہیں کیسے
مگر وہ سب آپ اپنی ضد ہیں
تمام، جیسے گماں کا ممکن
جو تو ہے میں ہوں

تمام گندے (تو جانتی ہے)
جو سطحِ دریا پہ ساتھ دریا کے تیرتے ہیں
یہ جانتے ہیں یہ حادثہ ہے،
کہ جس سے ان کو،
(کسی کو) کوئی مفر نہیں ہے!
نہنگ بننا — یہ اُن کی تقدیر میں
نہیں ہے
(نہنگ کی ابتدا میں ہے اک نہنگ
شامل
(نہنگ کا دل نہنگ کا دل!)
نہ اُن کی تقدیر میں ہے پھر سے درخت بننا
(درخت کی ابتدا میں ہے اک درخت شامل)

درخت کا دل درخت کا دل!)
تمام کندوں کے سامنے بند واپسی کی
تمام راہیں
وہ سطحِ دریا پہ جبرِ دریا سے تیرتے ہیں
اب اِن کا انجام گھاٹ ہیں جو
سدا سے آغوش وا کیے ہیں
اب ان کا انجام وہ سفینے
ابھی نہیں جو سفینہ گر کے قیاس میں بھی
اب اِن کا انجام
ایسے اوراق جن پہ حرفِ سیہ چھپے گا
اب ان کا انجام وہ کتابیں ——
کہ جن کے قاری نہیں، نہ ہوں گے
اب ان کا انجام ایسے صورت گروں کے پردے
ابھی نہیں جن کے کوئی چہرے
کہ اُن پہ آنسو کے رنگ اُتریں،
اور ان میں آئندہ
اُن کے رؤیا کے نقش بھردے!

غریب کُندوں کے سامنے بند واپسی کی
تمام راہیں
بقائے موہوم کے جو رستے کھلے ہیں اُب تک
ہے اُن کے آگے گماں کا ممکن ——
گماں کا ممکن، جو تو ہے میں ہوں!
جو تو ہے، میں ہوں!

ن۔ م۔ راشد

حسن کوزہ گر۔۴

جہاں زاد کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہرِ مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلدان کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اس شہرِ برباد کا حافظہ ہوں!
(حسن نام کا اک جواں کوزہ گر۔۔ اک نئے شہر میں۔۔
اپنے کوزے بناتا ہوا عشق کرتا ہوا
اپنے ماضی کے تاروں میں ہم سے پرو دیا گیا ہے
ہمیں میں (کہ جیسے ہمیں ہوں) سمو یا گیا ہے
کہ ہم تم وہ بارش کے قطرے تھے جو رات بر سے
ہزاروں برس رینگتی رات بھر
اک دریچے کے شیشوں پہ گرتے ہوئے سانپ لہریں
بناتے رہے ہیں
اور اب اس جگہ وقت کی صبح ہونے سے پہلے
یہ ہم اور یہ نوجواں کوزہ گر
ایک رویا میں پھر سے پرو دے گئے ہیں)

جہاں زاد —
یہ کیسا کہنہ پرستوں کا انبوہ
کوزوں کی لاشوں پہ اُترا ہے
دیکھو!

یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں
کبھی جام و مینا کی لِم تک نہ پہنچیں
یہی آج اس رنگ و روغن کی مخلوقِ بے جاں
کو پھر سے الٹنے پلٹنے لگے ہیں
یہ ان کے تلے غم کی چنگاریاں پا سکیں گے
جو تاریخ کو کھا گئی تھیں؟
وہ طوفان، وہ آندھیاں پا سکیں گے
جو ہر چیخ کو کھا گئی تھیں؟
انہیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے —
مرے اور اس نوجواں کوزہ گر کے؟
انہیں کیا خبر کونسی تتلیوں کے پروں سے؟
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے؟
کونسی ذات سے کس خد و خال سے
ہم نے کوزوں کے چہرے اتارے؟
یہ سب لوگ اپنے اسیروں میں ہیں
زمانہ جہاں زاد افسوں زدہ برج ہے
اور یہ لوگ اس کے اسیروں میں ہیں —

جواں کوزہ گر ہنس رہا ہے !
یہ معصوم وحشی کہ اپنے ہی قامت سے ژولیدہ دامن
ہیں جویا کسی عظمتِ نارسا کے ـــ
انہیں کیا خبر کیسا آسیبِ مبرم مرے غار سینے پہ تھا
جس نے مجھ سے (اور اِس کوزہ گر سے) کہا :
" اے حسن کوزہ گر، جاگ
دردِ رسالت کا روزِ بشارت ترے جام و مینا
کی تشنہ لبی تک پہنچنے لگا ہے !"
یہی وہ ندا جس کے پیچھے حسن نام کا
یہ جواں کوزہ گر بھی
پیاپے رواں ہے، خزاں سے خزاں تک،
زماں سے زماں تک !

جہاں زادمیں نے ـــ حسن کوزہ گر نے ـــ
بیاباں بیاباں یہ دردِ رسالت سہا ہے
ہزاروں برس بعد یہ لوگ
ریزوں کو چنتے ہوئے
جان سکتے ہیں کیا
کیسے میرے گِل و خاک کے رنگ و روغن
ترے نازک اعضا کے رنگوں سے مل کر
ابد کی صدا بن گئے تھے

میں اپنے مساموں سے، ہر لوپر سے،
تیری باہوں کی پہنائیاں
جذب کرتا رہا تھا
کہ ہر آنے والے کی آنکھوں کے معبد پہ جاکر چڑھاؤں ـــ
یہ ریزوں کی تہذیب پالیں تو پالیں
حسن کوزہ گر کو کہاں پا سکیں گے ؟
یہ اس کے پسینے کے قطرے کہاں گن سکیں گے ؟
یہ فن کی تجلّی کا سایہ کہاں پا سکیں گے
جو بڑھتا گیا ہے خزاں سے خزاں تک
زماں سے زماں تک
جو ہر نوجواں کوزہ گر کی نئی ذات میں
اور بڑھتا چلا جا رہا ہے !
وہ فن کی تجلّی کا سایہ کہ جس کی بدولت
ہمہ عشق ہیں ہم
ہمہ کوزہ گر ہم
ہمہ تن خبر ہم ہمہ بے خبر ہم
خدا کی طرح اپنے فن کے خدا سر بسر ہم !
(آرزوئیں کبھی پایاب تو سرتاب کبھی
تیرنے لگتے ہیں بے ہوشی کی آنکھوں میں کئی چہرے
جو دیکھے بھی نہ ہوں
کبھی دیکھے ہوں کسی نے تو سراغ ان کا
کہاں سے پائے ؟

کس سے ایفا ہوئے اندوہ کے آداب کبھی
آرزوئیں کبھی پایاب تو سرِ یاب کبھی!)

یہ کوزوں کے لاشے جو اِن کے لئے ہیں
کسی داستانِ فنا کے وغیرہ وغیرہ ۔۔۔
ہماری اذاں ہیں، ہماری طلب کا نشاں ہیں
یہ اپنے سکوتِ اجل میں بھی یہ کہہ رہے ہیں
"وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر کھلی ہیں
تمہیں دیکھتی ہیں، ہر اک درد کو بھانپتی ہیں
ہر اک حُسن کے راز کو جانتی ہیں
کہ ہم ایک سنسان حجرے کی اُمس رات کی آرزو ہیں
جہاں ایک چہرہ، درختوں کی شاخوں کے مانند
اک اور چہرے پہ جُھک کر، ہر انساں کے سینے میں
اک برگِ گُل رکھ گیا تھا
اُسی شب کا دزدیدہ بوسہ ہمیں ہیں!

تبصرہ

کلام بُلھے شاہ ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید نذیر احمد ۔ قیمت ۲۷ روپے ، ناشرین : پیکیجز لمیٹڈ ۔ لاہور

ہر چند ڈاکٹر سید نذیر احمد ایک ماہر حیاتیات ، ایک ممتاز معلّم اور دانش ور کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں ۔ مگر بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ انہیں عمر بھر شعر و سخن اور ادبیات عالم سے بھی گہرا شغف رہا ہے ۔ چنانچہ آج سے قریب قریب نصف صدی قبل اُن کا افسانہ ”چنگیز خاں اور اُس کے پوتے کی کہانی“ اور ”ایک دیکٹ کا کھیل“ لا = صغر علی الترتیب ”مخزن“ اور رسالہ ماہنامہ ”کارواں“ میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوتے تھے ! فسانے کا خیال گورکی سے اور ڈرامے کا خیال انگلستان کے شاعر اور نقاد جان ڈرنک واٹر سے لیا گیا تھا ۔ اُن کا تازہ ادبی کارنامہ زیر نظر کتاب ”کلام بلھے شاہ“ کی ترتیب و تدوین ہے ۔

فارسی اور اُردو کی طرح پنجابی کا شعری سرمایہ بھی صوفیانہ شاعری سے مالا مال ہے ! اس صنف میں جن پنجابی شعرا نے لازوال شہرت حاصل کی اُن میں بُلھے شاہ ، خواجہ غلام فرید اور لال حسین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔

بلھے شاہ کے حالات زندگی کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۶۸۰ء میں اُچ گیلانیاں میں پیدا ہوئے تھے ۔ اور ۱۷۵۷ء میں قصور میں انہوں نے وفات پائی تھی ۔ بلھے شاہ کا کلام زیادہ تر کافیوں پر مشتمل ہے ۔ کافی پنجابی شاعری کی ایک مخصوص اور نہایت مقبول صنف ہے جس کا ماثل شاید فارسی اور اُردو شاعری میں نہ مل سکے ! اس میں تین تین یا چار چار مصرعوں کے بند ہوتے ہیں جن میں عموماً ایک مصرعے کی تکرار ہوتی ہے اور وہ ٹیپ کے مصرعے کا کام بھی دیتا ہے ۔ بلھے شاہ کی کافیوں کی زبان حد درجہ سادہ اور گھریلو ہے ۔ لفظی آرائش و زیبائش سے مُعرا ۔ مگر یہ سادگی بڑی پُر فریب ہے ۔ وہ زبان کی کاٹ کو ایسا تیز کر دیتی ہے کہ بے اختیار دل میں اُترتی چلی جاتی ہے ۔ اور دل میں گہرا گھاؤ لگاتی ہے ۔

یار ہملے سے اُٹھ جاتے کو ہے میرے اللہ اب میں کیا کروں ! رانجھا رانجھا پکارتے ہوئے میں تو خود ہی رانجھا بن گئی ہوں ! میں روٹھے ہوئے یار کو منانے کے لئے منتر گاؤں گی ، میں ٹونا کروں گی ، میں سورج کی آگ جلاؤں گی ۔ میں کاجل والی آنکھوں کے کالے بادل اور بھنووں سے آندھی لاؤں گی ۔ میں دل کے سات سمندروں سے طوفان اُٹھاؤں گی ۔

اے یار علم کا پیچھا چھوڑ ، تجھے تو بس ایک الف (اللہ) ہی کافی ہے ۔ بس ایک نقطے میں بات ختم ہوتی ہے ۔ محبوب نے میرے دل سے روزے ، حج اور نماز کا خیال بھلا دیا ہے ۔ بُلھے شراب پی اور کباب کھا لیکن اس کے لئے

جھنڈیوں کی آگ جلانی ہوگی۔ چوری کر اور خدا کے گھر کو نقب لگا۔ اور اس ٹھگوں کے ٹھگ کو ٹھگ۔

بلھے شاہ کی کافیوں کے یہ مضامین بظاہر عشق و مستی، ہوا و ہوس، رندی و سرشاری کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن انہیں ایک عارف کی نظر سے دیکھیے تو ان میں معارفِ الٰہی کے گوناگوں جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ صاحبِ حال پر ہمہ اوست، تصادم جسم و روح، فنا و بقا، صبر و رضا، جبر و قدر وغیرہ تصوف کے اسرار و رموز منکشف کرتے ہیں۔

بلھے شاہ کی کافیوں کے انتخاب میں ڈاکٹر نذیر نے صرف اپنے ذوق ہی پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ اس سلسلے میں نوکتہ داں شاعروں اور سخن فہموں سے بھی استمداد کیا گیا ہے۔ جن میں ابو الاثر حفیظ، صوفی تبسم، فیض احمد فیض اُستاد دامن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

یہ کتاب جہازی سائز کے ۴۴۴ صفحات پر محیط ہے۔ کاغذ چکنا اور دبیز۔ کتابت و طباعت نہایت خوشنما اور دلآویز۔ کتاب کی جلد اور متن کے حواشی قدیم وضع کی گوٹریوں، پھلکاریوں، کھیسوں اور پنکھیوں کے ڈایزائنوں سے مزین جس سے کتاب میں صناعانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔ غرض ہر لحاظ سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ لائبریریوں اور گھروں کی زینت بنے۔

غلام عباس


LIPTONS
It's
Good
It's
Strong
It's
RICH
It's
RICHBRU
RICHBRU
LIPTON'S
RICHBRU
TOP QUALITY
LEAF TEA
TOP
QUALITY
LEAF
TEA


رینا
رینا ٹی وی
رینا ریڈیو
پیامبر خوشحالی و شادمانی
Paragon HBI 5


men
demand
CAPSTAN
the
world over
world famous long size
filter tipped
CAPSTAN
PTC77—CA1
Rs 4 94 for 20
Rs 2.47 for 10


ہم نے دیکھا تم نے دیکھا
دیکھ چکا جگ سارا
سب سے اچھا بیٹری سیل
تھری اسٹار ہمارا
3-STARS
3-STARS
پاکستان بیٹری
مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی
adcom 156-2


حسین لمحات اور...
...گولڈ لیبل
Brooke Bond
GOLD LABEL TEA
• چائے کی بہترین پتیوں کا مرکب۔
• لذت میں نفیس۔ خوشبو میں لطیف۔
• نیا دلکش ... پیکٹ
بروک بانڈ
دنیا بھر میں بہترین چائے - بروک بانڈ
IAL BB-1 77

ثناء اللہ پرنٹر پبلشر نے مشہور آفسٹ پریس میکلوڈ روڈ سے چھپوا کر پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ سے شائع کیا۔ ۱۹۷۸ء

NAYA DAUR

A Widely Circulated Literary Magazine

Published by : The Pakistan Cultural Society
P. I. B. Colony, Karachi 5